مولانا ابوالکلام آزاد

آزاد کی تقریریں

مرتبہ:

انور عارف

نیو تاج آفس دہلی

قیمت:- پانچروپے پچاس پیسے

ناشر:- نیو تاج آفس دہلی

ترتیب

پہلا حصّہ

دوسرا حصّہ

پہلی بات

ادھر کچھ عرصہ سے الہلال والبلاغ اور دوسرے رسائل کو تو کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ کر مولانا کے مقالات و مضامین درجنوں کتابوں کی صورت میں شائع کئے جا رہے ہیں مگر مولانا کی تقریروں کی طرف اب تک کسی نے توجہ نہ دی۔ کچھ اس لئے بھی کہ ان کی تقریریں یکجا کرنا اتنا آسان کام نہیں جتنا بظاہر نظر آتا ہے۔

اس سلسلہ میں ہم نے کافی چھان بین کی، اور دو سال کی محنت اور تلاش کے بعد مولانا کی یہ تقاریر جمع کی ہیں۔ ہم یہ دعویٰ تو نہیں کرتے کہ یہ مولانا کی پوری تقریریں ہیں لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ مولانا کی مشہور اور اہم تقریریں تقریباً سبھی کتاب میں جمع ہو گئی ہیں، ہو سکتا تھا چند برس بعد اردو کا یہ علمی و ادبی سرمایہ جو ہزاروں بے ترتیب اوراق میں بکھرا پڑا تھا ضائع ہو جاتا، ہم نے اسے کتابی صورت میں محفوظ کر دیا ہے اور مولانا کے ساتھ محبت و عقیدت رکھنے والے حضرات کی خدمت میں ان کا ایک نیا مجموعہ پیش کر رہے ہیں۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، ان میں زیادہ تر تقریریں مولانا کی اپنی زبان میں ہیں، اس کتاب کے دوسرے حصہ میں چند تقریریں ہم نے حکومتِ ہند کی شائع کردہ کتاب (speeches of Maulana Azad) سے لی ہیں۔ یہ وہ تقریریں ہیں جو مولانا نے قیام پاکستان کے بعد اسلام، تعلیم اور فلسفہ کے موضوعات پر کیں اور ان میں سے بیشتر کا ترجمہ مولانا محمد وارث کامل (مرحوم) نے کیا۔

یہاں ہمیں مولانا کے بنیادی نقطۂ نگاہ اور نظریہ سے بحث نہیں، ہم نے تو اسے ایک علمی و ادبی خزانہ سمجھ کر محفوظ کر دیا ہے۔ تا کہ ان موضوعات کے بارے میں مولانا مرحوم کی رائے اور زاویۂ نگاہ کا پتہ چل سکے اور بس!

آخر میں ہم ان کتب، اخبارات و رسائل کے علاوہ ان احباب کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں جن سے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں استفادہ کیا گیا۔

انور عارف

پہلا حصّہ

۱۹۳۴ء کے آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد نے معتقدین کے بے حد اصرار پر بالی گنج کلکتہ کی مسجد میں نمازِ جمعہ کی امامت قبول فرمائی، اور اس طرح خطبات کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ خطبات کسی زمانے میں شائع ہوکر نایاب ہو چکے تھے۔ ہم ابو سلمان الہندی صاحب کے ممنون ہیں جنہوں نے فراخدلی سے ہمیں یہ خطبات مہیّا کر دیئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

مسلمانوں کی اجتماعی زندگی

برادران عزیز! عید کا خطبہ جتنا اہم ہے اتنا ہی اس کا وقت مختصر ہے۔ میں طوالت کو نظر انداز کر کے آپ سے بہت ہی مختصر عرض کروں گا۔

برادران عزیز! تم کو معلوم ہے کہ ہر اسلامی حکم میں انفاق کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ انفاق کے معنی یہ ہیں کہ اسلام تمہاری جیبوں سے کچھ چاہتا ہے۔ حج زکوٰۃ اور دوسرے احکام میں یہی بات پاؤ گے۔ تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

عید کے موقع پر تم لوگوں میں سے بہت سے لوگوں نے فطرہ دیدیا ہوگا، اور بہت سے لوگ فطرہ دیں گے لیکن میں تم سے کہوں گا کہ تم میں فطرہ، صدقہ اور زکوٰۃ تقسیم کرنے کا اچھا طریقہ نہیں ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس موقعہ پر ہندوستان کے ہر گوشے سے بھیک مانگنے والے اور گداگر اپنی جھولیاں لئے کلکتہ پہنچ جاتے ہیں۔

برادران عزیز! تم جانتے ہو کہ زکوٰۃ کیا ہے زکوٰۃ ایک انکم ٹیکس ہے جو اسلام نے ہر اس آدمی پر عائد کیا ہے جس نے سال کے بارہ مہینوں میں کھا پی کر ایک خاصی

رقم جمع کر لی ہو۔ اسلام کی زکوٰۃ یہ ہے کہ جس آدمی نے سال بھر چالیس روپے جمع کر لیئے ہوں وہ ایک روپیہ ٹیکس داخل کرے۔ انگریزی حکومت بھی ٹیکس لیتی ہے لیکن اس ٹیکس میں فرق یہ ہے کہ حکومت ٹیکس لے کر اپنے کاموں میں خرچ کرتی ہے اور اسلام ٹیکس کی رقمیں غرباء مساکین اور محتاجوں میں تقسیم کرا دیتا ہے اسلام نے ٹیکس کی رقموں کو تقسیم کرنے کے لیئے آٹھ حلقے بنائے ہیں اور یہ حلقے غرباء اور محتاجوں کے حلقے ہیں۔

برادران عزیز! قرآن حکیم میں زکوٰۃ کا صاف و صریح حکم موجود ہے اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ ہر صاحب نصاب پر فرض کی ہے۔ قرآن حکیم میں نماز، اور زکوٰۃ کا ایک ساتھ بار بار ذکر آیا ہے۔ لیکن ہندوستان کے مسلمان اس اہم فرض کی ادائیگی کی طرف متوجہ نہیں تم میں سے بعض لوگ زکوٰۃ نہیں دیتے ہیں۔ لیکن زکوٰۃ دینے والے بھی نہ دینے والوں کے برابر ہیں کیونکہ وہ اسلامی احکام کے مطابق زکوٰۃ نہیں دیتے۔

تم کو معلوم ہے کہ انکم ٹیکس وصول کرنے کے لیئے حکومت کی طرف سے کلکٹر مقرر ہوتے ہیں جو دفاتر اور کھاتوں کی جانچ پڑتال کر کے ٹیکس کی رقمیں متعین کرتے ہیں لیکن اسلامی ٹیکس "زکوٰۃ" نکالنے میں اس قسم کی کوئی صورت پیش نہیں آتی۔ اسلام نے ٹیکس کی ادائیگی میں تمہیں کتنی آسانیاں دے رکھی ہیں تم خود اپنے کاروبار اپنی زندگی کا جائزہ لو، اپنی زندگی کا تعین کرو اور اپنے ہی ہاتھوں سے زکوٰۃ نکالو۔ کیا اس سے بھی زیادہ آسانیاں ممکن ہیں۔

برادران عزیز! یقین مانو کہ تم میں سے جو لوگ زکوٰۃ نکالتے ہیں وہ اسلامی احکام کے مطابق نہیں نکالتے اور وہ ان لوگوں کے برابر ہیں جو زکوٰۃ نہیں نکالتے تمہاری زکوٰۃ کی رقمیں برباد ہو جاتی ہیں۔! اسلام نے زکوٰۃ کی رقموں کو اجتماعی طور سے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے اور تم انفرادی ہاتھوں سے خرچ کر رہے ہو، اسلام کا

حکم اصحابہ کا عمل اور تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ زکوٰۃ کی رقمیں اجتماعی طور سے خرچ ہونی چاہئیں۔ انفرادی طور سے خرچ کرنے کی بدعت خلفائے راشدین کے بعد سے پڑی۔

تم کو معلوم ہے کہ خلفائے بنوامیہ کے ابتدائی دور میں صحابہ کرام میں یہ سوال پیش ہوا کہ موجودہ خلیفہ بہت ہی فاسق و فاجر ہے زکوٰۃ کی رقمیں کیونکر بیت المال بھیجی جائیں۔ تمام صحابہ نے اس پر اتفاق کر لیا کہ خلیفہ کے فسق و فجور سے زکوٰۃ کی ادائیگی میں کوئی خلل نہیں آتا، زکوٰۃ کی رقمیں اسی خلیفہ کو بھیجی جائیں چنانچہ یہی ہوا۔ عباسی دور حکومت میں جب تاتاری کافروں اور مشرکوں نے بغداد پر قبضہ کر لیا اور خلافت کا خاتمہ کر ڈالا اس وقت کے مسلمان اعیان و اکابر نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر موجودہ حالات کے ماتحت حکومت نہیں بدلی جا سکتی تو حکومت سے درخواست کی جائے کہ ہماری زکوٰۃ کی رقمیں وصول اور تقسیم کرنے کے لئے قاضی اور عمّال مقرر کرے۔

بعض لوگ یہ عذر لا سکتے ہیں کہ چونکہ ہندوستان میں اسلامی حکومت نہیں ہے اس لئے زکوٰۃ کی اجتماعی تقسیم کا انتظام نہیں ہو سکتا میں یہ کہتا ہوں کہ یہ عذر بالکل لنگ اور بے بنیاد ہے وہ تمہارا کون سا کام ہے جو رکا رہتا ہے، اس حالت میں بھی اگر تم اجتماعی تقسیم کا انتظام کر سکتے ہو تو یہ عذر کوئی حیثیت نہیں رکھتا تم فضول، لغو اور غیر اسلامی کاموں کے لئے آئے دن انجمنیں بناتے رہتے ہو کیا ایک اسلامی کام کے لئے ایسی انجمنیں نہیں بنا سکتے جو تمہاری زکوٰتوں کو اسلامی طریقہ پر خرچ کر سکیں۔

برادران عزیز! دراصل بات یہ ہے کہ یہاں اسلام کا نقشہ ہی بدل گیا ہے اسلام اجتماعی زندگی کا اور وہ نقشہ بدل چکا ہے جس طرح تم مکان بناتے ہو،

اس میں مختلف خانے ہوتے ہیں کوئی خانہ سونے کا ہوتا ہے کوئی باورچی خانہ ہوتا ہے۔ کوئی سامان رکھنے کا خانہ ہوتا ہے ایک انسان اپنے تمام کاموں کے لئے اگر ایک ہی خانہ متعین کرلے اور دوسری ضرورتوں کے لئے اگر اس کا کوئی خانہ نہ ہو تو بتاؤ وہ گھر کا صحیح لطف اٹھا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح جب تک اسلام کے تمام خانوں کو سامنے نہیں رکھو گے اس کے فیض و برکات سے لطف نہیں اٹھا سکنے۔

دراصل مسلمانوں نے اسلامی احکام کو چھوڑ دیا ہے البتہ ان میں نمائشی اور بے روح سرگرمیاں باقی رہ گئی ہیں۔ ایک زکوٰۃ ہی کے حکم کو دیکھو اگر مسلمان اس پر عامل ہوتے تو آج ان کی یہ حالت نہ ہوتی زکوٰۃ اسلام کا اپنا جامع اور اکمل اصول ہے کہ دنیا کا کوئی قانون اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسلام نے زکوٰۃ کا حکم اس لئے دیا ہے کہ اس سے غربا اور مساکین اور محتاجوں کی امداد ہوتی رہے۔

اسلام نہیں چاہتا کہ ساری دولت چند لوگوں کے ہاتھوں میں جمع رہے اسلام نے مسلمانوں کی یہ پہچان بتائی ہے کہ اس کی مٹھیاں کھلی رہتی ہیں یعنی وہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے ہوتے ہیں اور کافروں کی یہ پہچان بتائی ہے کہ ان کی مٹھیاں بند رہتی ہیں یعنی نیک کاموں پر وہ خرچ نہیں کر سکتے۔ اسلام نہیں چاہتا کہ دولت کسی کی اجارہ داری میں آجائے یا کوئی شخص اپنے پاس ڈھیر لگائے اسلام ڈھیر کا سخت مخالف ہے اسلام چاہتا ہے کہ دولت تقسیم ہوتی رہے اس کا یہ اصول زکوٰۃ اور وراثت میں بالکل مساوی بنیاد پر قائم ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس بارے میں سوشلزم اور اسلام کے اصول ایک ہی ہیں۔ ایسا کہنے والے نہ صرف یہ کہ غلط کہتے ہیں بلکہ دیانتداری کے خلاف کہتے ہیں۔ سوشلزم چاہتا ہے کہ دولت کی برابر تقسیم ہو اگر ایک آدمی کے پاس سو روپے

ہوں تو سب کے پاس سو روپے ہونے چاہئیں۔ لیکن اسلام یہ نہیں کہتا، اسلام صرف یہ کہتا ہے کہ ہر شخص کے پاس سو روپے ہوں۔ اسلام حق مساوات تسلیم کرتا ہے لیکن مقدار مساوات تسلیم نہیں کرتا۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جب آدمی پیدا ہو تو اس کی زندگی سوسائٹی پر فرض ہو گئی۔ سوسائٹی کا فرض ہے کہ اسے زندہ رہنے دے۔ اسلام نے اقتصادی مساوات تسلیم نہیں کی ہے۔ بے شبہ اسلام میں اونچ نیچ کا کوئی طبقہ نہیں ہے۔ لیکن اسلام نے غربا اور امرا کے طبقات تسلیم کئے ہیں۔ قرآن کریم میں خداوند کریم نے صاف صاف بیان کر دیا ہے کہ ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ سوشلزم جس قسم کی مساوات پیش کرتا ہے وہ بالکل غیر فطری ہے۔ دنیا کا وجود ہی کشاکش پر قائم ہو سکتی ہے۔ پھر غیر فطری مساوات کس طرح قائم ہو سکتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آج دنیا میں سوشلزم اور اشتراکیت کے اصول پھیلائے جا رہے ہیں اور دنیا ایک اصول کی تلاش میں سرگرداں ہے اگر آج ساری دنیا اسلامی اصول اختیار کر لے تو سوشلزم اور اشتراکیت کی قطعی ضرورت باقی نہیں رہتی صرف اسلامی اصول ہی دنیا کی پیاس اور تشنگی کو دور کر سکتا ہے۔

برادران عزیز! میں تم سے پھر کہتا ہوں کہ تم میں سے جو لوگ زکوٰۃ نکالتے ہیں ان کی رقمیں برباد جاتی ہیں۔ میں تمہارے سامنے اس منبر پر پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ زکوٰۃ کی جو رقمیں اس طرح خرچ کی جاتی ہیں غلط ہے۔ میں جانتا ہوں کہ شرعی ذمہ داری کی کیا اہمیت ہے اور اس اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے تم سے بار بار کہتا ہوں کہ زکوٰۃ کی رقموں کو اجتماعی طور سے خرچ کرو۔

تم نہیں جانتے ہو کہ اجتماعی طور سے خرچ کرنے میں اسلامی احکام کی بجا آوری کے علاوہ کیا فوائد ہیں۔ کاش میں اس کے فوائد سمجھانے کے اپنا دل چیر کر تمہارے

سامنے رکھدوں اور تم اس کی رگوں کو پڑھ سکو۔ میں بالکل یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر مسلمان اسلام کے دوسرے اصولوں کی پابندی نہ کریں اور صرف زکوٰۃ ہی کے اصول پر پابند رہیں جب بھی ان کی حالت بہت جلد بدل سکتی ہے اگر تم نے زکوٰۃ کی رقموں کو اجتماعی طور پر خرچ کرنے کا فیصلہ کر لیا تو یقیناً ۲۴ گھنٹے کے اندر تمہاری حالت کیا سے کیا ہو سکتی ہے۔

میں نہیں کہتا کہ تم جن فقیروں، جن ملاؤں، پیروں، جن لوگوں کو دیتے ہو نہ دو۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ اجتماعی ہاتھوں سے دو۔ اگر تم ان ہی لوگوں کو اجتماعی ہاتھوں سے دے سکتے ہو تو تمہیں کیوں ضد ہو گئی ہے کہ انفرادی ہاتھوں سے دیکر اسلام کے احکام کے خلاف کام کرتے ہو۔

میں کم سے کم کلکتہ کے مسلمانوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ کوئی ایسی جماعت بنائیں جو ان کی زکوٰۃ کا صحیح مصرف کر سکے اور اس میں ہر طبقہ اور ہر جماعت کے نمائندے شریک ہوں یا ہر طبقہ میں اس قسم کی جماعت بنائی جائے جو اسلام کی بنائی ہوئی حدود کے اندر ان زکوٰۃ کی رقموں کو خرچ کر سکے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری رقمیں ان لوگوں پر خرچ کی جائیں جنہیں تم دینا چاہتے ہو تو یہ کر سکتے ہو کہ اپنی جمعیت کو ان اشخاص کے ناموں کی اطلاع کر دو۔

بہرحال کلکتہ کے مسلمانوں کو میرا مشورہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقمیں اجتماعی طور سے خرچ کرنے کے لیے کوئی ایک نمائندہ جماعت یا متعدد نمائندہ جماعتیں بنائیں اور کلکتہ میں اس کی پہلی مثال قائم کریں۔ انشاء اللہ العزیز یہاں کی دیکھا دیکھی اور شہروں میں بھی ایسی ہی جماعتیں بن جائیں گی۔

۞ ۞ ۞

مسلمانوں کے مصائب کا علاج

آپ لوگ ہرگز یہ خیال نہ فرمائیے کا کہ میرا یہ فعل یعنی اذان خطبہ کے بعد خطبہ شروع کر دینے کے بجائے لوگوں کو نزدیک آجانے کی ترغیب و ہدایت خلاف سنت یا کوئی نئی چیز ہے آقائے دوجہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم برابر ممبر پر تشریف فرما ہونے کے بعد لوگوں کو ان الفاظ کے ساتھ ہدایت فرماتے تھے اُدن مِنی مجھ سے نزدیک ہو جاؤ، مجھ سے نزدیک ہو جاؤ۔ لہذا میرا یہ فعل بھی عین سنت نبویہ کے مطابق تھا۔ یہ ذومعنی اول یہ کہ دھوپ کی تکلیف سے بچ سکیں۔ دوسرے اس لئے کہ خطبہ کے الفاظ زیادہ سے زیادہ قریب ہو کر سن اور سمجھ سکیں۔

بعدہٗ بائیں رخ ایک ذرا مڑ کر فرمایا الحمد للہ پھر سیدھے ہوئے اور حمد و ثنا کے مسنونہ و مروجہ الفاظ تلاوت فرمانے کے بعد فرمایا:۔

اپنی نمازوں کو درست کرو۔

برادران عزیز! بغیر کسی ارادہ اور بلا کسی مقصد کے میں نے اس مسجد کی نماز خطبہ کو عارضی سمجھتے ہوئے منظور کر لیا تھا اور اب جبکہ دوسرے محلوں اور نزدیک و دور

کے لوگ۔ اشریک نماز ہونے لگے ہیں تو خیال ہوا کہ مسائل دین کی جتنی باتیں آپ کے کانوں تک پہنچ جائیں اچھا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ پہلے میں نے نماز درست کر لینے اور اس کو ٹھیک طریقہ پر ادا کرنے کی چند باتیں سمجھائی تھیں، مگر افسوس اس کا نتیجہ میں آج بھی نہیں دیکھ رہا حالانکہ یہ اولین رکن دین تھا اور اگر صرف اپنی نمازیں درست و استوار کر لیجائیں تو میں اس ممبر پر کھڑے ہو کر اعلان کرتا ہوں کہ دین کی ساری سربلندیاں حاصل ہو سکتی ہیں۔

مگر افسوس مسلمانوں کی غفلت و جمود نے جہاں ان کی بداعمالیوں کی پاداش میں ان سے ہر قسم کی سربلندیاں اور سرفرازیاں چھین لیں وہاں ان کے دلوں کی انگیٹھیاں بھی اس درجہ سرد ہو گئی ہیں کہ ان میں اب کوئی چنگاری اور کوئی گرمی باقی نہیں رہی۔ دل کا سوز و گداز، اللہ کے حضور جھکنے کا جذبہ، سچی نابینت، سچا عجز غرض سب کچھ سرد و محو ہو چکا ہے۔ کون ہے جو نماز کی صحیح لذت اپنی نمازوں میں پاتا ہے اور جب نماز کی لذت ہی نماز سے علیحدہ کر لی گئی تو پھر وہ ایک ڈھانچہ اور ہیولیٰ ہے۔ جس میں روح نہیں ایسی نماز بیکار، صرف قواعد ہوئی اور صرف ٹکر مارنا بے نتیجہ، بے فائدہ، بے اثر،

اگر مسلمان صحیح طور پر نماز ادا کرتے ہیں اور ان کی نمازیں نمازیں شمار ہوتی ہیں تو پھر بتاؤ کہ نماز کے وہ قرآنی برکات جن کا اللہ نے نمازی سے وعدہ کیا ہے کہاں ہیں۔ کیا اللہ کا وعدہ غلط ہے ہرگز نہیں۔ کیا پھر ہماری نمازیں نماز ہی نہیں ہیں یقیناً اللہ کا قانون اٹل، اس کا وعدہ سچا، وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا وَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ اصل یہ ہے کہ دلوں کے چولھے سرد ہو گئے ان میں کوئی گرمی اب باقی نہ رہی، کوئی چنگاری موجود نہ رہی، ورنہ ہماری نمازوں میں سوز و گداز، عجز والحاح ہوتا تو دنیا اور دنیا کے ساتھ دین کی کامرانیاں ہماری ہوتیں۔

میں بتاؤں کہ کیوں صرف نماز کی استواری، درشتگی سے ہمارا دین اور ہماری دنیا بدل سکتی ہے۔ سنو! تم قرآن کی تمام مکی سورتوں کو پڑھ جاؤ یعنی جن کا زمانۂ نزول، زمانۂ قیام مکہ تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وطن ہی میں تشریف فرما تھے اور یہی وہ زمانہ تھا جب دعوت و تبلیغ حق کی پکار مکہ کے کوہساروں سے شروع شروع ٹکرائی تھی بالکل ابتدائے عالم اسلام تھی اس وقت اسلام و داعی اسلام کی غربت و بیچارگی بے یاری و بے مددگاری اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی معدودے چند مسلمان تھے۔ جو ہر طرف اور ہر طرح سے اعدائے اسلام کے نرغے میں محصور تھے پورا مکہ اور نہ صرف مکہ بلکہ پورا جزیرۃ العرب ان کے خون کا پیاسا اور جان کا دشمن تھا۔ یار تھا نہ کوئی مددگار جس طرف نظر اٹھتی تھی مایوسی سے ٹکراتی ہوئی واپس آتی تھی، جس طرف امان واحسان کی تلاش میں نکلتے تھے مایوسی و حرمانی کے ساتھ واپس آجاتے تھے۔ ایسے عالم وکسمپرسی و بیچارگی میں بتاؤ کہ اس وقت ان تمام درد و مصائب کا علاج و نسخہ شفا جو حکیم مطلق نے تجویز کیا تھا کیا تھا؟ ایک اور صرف ایک یعنی اَقِمِ الصَّلٰوۃَ، نماز قائم کرو، نماز قائم کرو۔ حالانکہ اللہ کی اس کشادہ زمین پر ان کو یہ بھی حق نہ تھا کہ کھلے طور پر نماز کے لئے ہی جگہ ملتی۔ مگر دانائے حال نے بجز اس کے اور کوئی دوسرا نسخہ نہیں تجویز فرمایا کہ اقم الصلوٰۃ نماز قائم کرو، نماز قائم کرو۔ یہ اس لئے کہ نماز ہی تمہارے تمام دکھوں کا علاج، ہر درد کی دوا اور ہر زخم کا مرہم ہے۔

وسیع و کشادہ زمین عرب میں سب کے لئے جگہ تھی۔ سب کو چلنے پھرنے کا بلا قید و شرط حق تھا مگر تنگ تھی وہ زمین تو ان چند ہی پرستاران حق و توحید کے لئے وہ کونسی جسمانی و روحانی تکلیف و ایذا تھی جو ان کو نہ دی گئی یا ان کے لئے نہ تجویز کی گئی ہو۔ بالآخر جب شدت تکالیف اور ایذا رسانی حد سے بڑھ گئی اور ان کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ حتیٰ کہ وہ ذات اقدس و

گرامی باشاد ہ مالک یوم الدین ہجرت پرمجبور ہوئی اور وطن سے بیوطنی پر لاچار اس وقت کے کرب والم، درد وغم کے لئے بھی دار وئے تسکین و مرہم زخم آتا ہے وہ یہی ہے کہ

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ نماز قائم کرو، نماز قائم کرو۔

سورۂ ق کی آخری آیت پڑھو تم کو واضح ہوجائے گا کہ اس عالم میں بیچارگی غربت اور درد و مسکنت کا جو علاج سوچا گیا اور کامیابی کی جو راہ تجویز کی گئی تھی وہ بجز اس کے اور کچھ نہ تھی کہ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ نماز قائم کرو، مگر کاش تم قرآن کو پڑھتے بھی۔ تم نے قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کی چیز ہی نہیں سمجھا، اس کو تو ریشمی غلافوں اور جزدانوں میں لپیٹ کر طاق میں رکھنے کی چیز سمجھ لیا ہے۔ جو کبھی وقت پڑے پر کام میں لائی جاتی ہے۔

بلاشبہ قرآن رکھنے ہی کی چیز ہے، مگر غلافوں میں نہیں دل میں، جس کو اللہ تعالیٰ توفیق دے۔

وقت نہیں اور خطبے کا وقت قلیل ہوتا ہے ورنہ میں بتاتا کہ کس طرح پھر انھیں معدودے چند مسلمانوں نے نماز، سچی نماز، اور صرف سچی نماز کی برکت سے جماعت کی شکل اختیار کی اور پھر کس طرح اس ربّانی جماعت نے دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔

ایک وہ انقلاب انگیز نمازیں تھیں۔ ایک تمہاری نمازیں جو کہ رسمًا یا دکھاوے کے لئے ادا کی جاتی ہیں۔ ان نمازوں کا ہونا نہ ہونا برابر ہے، ان کا کرنا نہ کرنا ایک۔ بتاؤ تمہاری نمازوں میں کوئی لذت ہے جس سے تمہارے دلوں میں کوئی سرور اور تازگی پیدا ہوتی ہو۔ بتاؤ تمہارے دلوں میں کوئی سوز و گداز ہے، دلوں کے چولھے میں کوئی چنگاری باقی ہے جو تمہاری آنکھوں سے ہنگام نماز ایک قطرۂ اشک نکالا کرتی۔ بتاؤ ایسی نمازوں میں کشش و محبت الٰہی کا کوئی اثر محسوس کرتے ہو ۔ ۔ ۔

اگر نہیں تو پھر تمہاری نمازیں بیکار تمہارے یہ سجدے باطل تمہاری عبادت اکارت، سچی نماز تو وہ نماز ہے جس سے دل میں سوز و گداز، رکوع میں خشوع و خضوع اور سجود میں کیف و لذت حاصل ہو اور تقرب و معراج الی المحبوب۔

جن کی نمازیں سچی نمازیں تھیں جنھوں نے اپنی نمازوں میں لذت و چاشنی پائی تھی جنکے زبان و لب اس جام شیریں سے شاد کام تھے۔ قرآن کو ان الفاظ کے ساتھ یاد کرتا ہے۔

تتجافی جنوبھم عن المضاجع

ان کی پسلیاں نرم و نازک گدّیوں پر سکون و قرار نہیں پاتیں راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنے اللہ کے حضور میں نمازیں قائم کرتے ہیں اس کی رضا کی آرزوئیں اور اسکے وصل کی التجائیں، انکی پیشانیاں مصروف سجدہ، انکی بانیں تسبیح کناں ان کے قلوب محو لذائذ نماز ہوتے ہیں۔

کاش تمہیں بھی ایسی نمازوں کی چاٹ پڑتی۔ اور تم سمجھتے کہ نماز واقعی کیا چیز ہے۔

ھذا وان احسن الکلام کلام اللہ الملک المنان قد افلح المومنون الذین ھم فی صلوتھم خاشعون۔

بعد اختتام خطبہ ثانیہ جماعت قائم کی گئی اور نماز ہوئی پہلی رکعت میں بعد سورہ فاتحہ سورہ قٓ کا دوسرا رکوع اور دوسری رکعت میں بعد فاتحۃ الکتاب سورہ اعلیٰ تلاوت فرمائی۔

مساوات کی حقیقت

برادران عزیز! کل صبح کچھ لوگ میرے پاس آئے جو یہاں سے قریب ہی رہتے ہیں انھوں نے ایک بات کہی اور بات کے بارے میں شرعی نقطہ نگاہ دریافت کیا میں نے ان کو جواب تو دیدیا اور اسکے بعد وہ لوگ چلے بھی گئے لیکن میں کیا بتاؤں کہ اسوقت میرے قلب کی بے چینی، اضطراب اور اضطرار کا کیا عالم تھا اور رہ رہ کر کون سا درد تھا جو میرے جسم و حواس کو ناکارہ کئے دے رہا تھا، موجودہ مسلمانوں کی پست ذہنیت، جھوٹا غرور، بیجا فخر اور اس کے نتائج یہ ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آتے اور مجھے لرزہ براندام کرتے گئے۔

بات کیا تھی؟ کہنے اور سننے میں تو معمولی اور بہت ممکن ہے کہ اس قسم کے واقعات تم روز سنا کرتے ہو اور تمہارے دل پر اس کا کوئی اثر بھی نہ ہوتا ہو مگر باعتبار نتائج یہ بات جتنی اہم ہے اور اس زمین پر ایک مسلمان کیلئے شرمناک میں نہیں سمجھتا کہ اس سورج کے نیچے اس سے بڑھ کر، کوئی اور بات دردانگیز اور دل فگار ہو۔

ان لوگوں نے بیان کیا کہ ہم لوگ ان لوگوں میں ہیں جن کو "لال بیگی" کہتے

ہیں ہندوستان کے ہر گوشے میں ہماری برادری ہے، صفائی اور گھروں میں کمائی کا کام ہمارا پیشہ اور شکم پری و تن پروری کا ذریعہ ہے، ہم لوگ مذہباً مسلمان ہیں۔ ہم میں کوئی مر جائے تو اسلامی طریق پر غسل میت و تجہیز و تکفین کرتے ہیں۔ پیدائش کے موقع پر تمام وہ رسوم ادا کرتے ہیں جو مسلمانوں کے یہاں برتی جاتی ہیں۔ نماز روزہ کے بھی معتقد ہیں اگرچہ پابند کم ہیں۔ خدا رسول کے بارے میں ہمارے وہی عقائد ہیں جو عامۃ المسلمین کے ہیں لیکن اسکے باوجود مسلمان ہم سے چھوت برتتے ہیں ذلیل سمجھتے ہیں اور حقارت سے پیش آتے ہیں۔ چنانچہ ہماری برادری کا ایک آدمی محلہ کے ہوٹل میں چائے پینے گیا۔ دوکاندار کو ہماری ذات معلوم نہ تھی، وہ چائے پی کر اور قیمت ادا کر کے چلا آیا۔ لیکن بعض لوگ جو ہماری ذات سے واقف تھے انھوں نے دوکاندار سے سخت باز پرس کی اور بائیکاٹ کی دھمکی دی، وہ سہم گیا اور بھاگا ہوا ہمارے سردار کے پاس آیا۔ اس آدمی کو بلوا کر اپنے ساتھ لے گیا ہمارے چند آدمی اسکے ساتھ بھی ہو لیے چنانچہ وہاں سب کے سامنے ہمکو برا بھلا کہا گیا جس پر ہم لوگوں نے بہ خوشامد معافی مانگی، تب کہیں جان بچی، دوکاندار نے وہ برتن جسمیں ہمارے آدمی نے چائے پی تھی سب کے سب توڑ ڈالے اور اسکی قیمت ہم سے وصول کی گئی۔ اس کے بعد سارے برتن دھوئے گئے اور ہوٹل کی دھلائی کی گئی اور دوکاندار نے آئندہ محتاط رہنے کی قسم کھا کر جان بچائی۔

اس واقعہ کو بیان کر کے ان لوگوں نے مجمع سے اس معاملہ میں شرعی احکام دریافت کئے اور پوچھا کہ کیا واقعی شرع شریف کی نگاہ میں بھی ہم اسی سلوک کے مستحق ہیں۔

آہ میں کیا کہوں کہ اس سوال نے میرے دل کے کتنے ٹکڑے کیے ۔۔ اور

روح کو کیسا صدمہ عظیم پہنچایا، شرم، ندامت، انفعال و انقباض سے گردن جھک گئی اور میں پسینہ پسینہ ہوگیا۔

مسلمانو! فخر و غرور، فضیلت و برتری کے اسی جھوٹے بت کو اسلام نے مٹایا تھا اور داعی اسلام نے مساوات حقیقی کے بے برگ و بار درخت کو سرسبز کیا تھا کیا تم پھر اسی جہالت کے دور میں واپس پہونچ گئے ہو جسطرح تم نے اور بہت سے جتھے اور برادری اور گروہ بنائے، فضیلت و برتری کے مفروضہ مراتب قائم کئے حالانکہ خدا نے کوئی پروانہ نہیں اتارا کہ فلاں گروہ معزز اور برادری ذلیل ہے بلکہ اس نے فرمایا تو فرمایا کہ۔

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی و جعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا۔

لوگو! ہم نے تم کو بلا استثنا، مرد و عورت کے اختلاط سے پیدا کیا اور صرف پہچان کیلئے قبیلوں میں تقسیم کر دیا ہے تاکہ قوموں کی تقسیم میں کوئی دقت نہ پیدا ہو یعنی بلحاظ پیدائش سب ایک، کسی کو کسی پر تفوق کوئی، فضیلت کوئی برتری نہیں ہے، البتہ قومیت و مملکت کی تقسیم کی خاطر اس پہچان کے لئے کہ یہ شخص عرب کا ہے یہ افریقہ کا، یہ یورپ کا یہ ہندوستان کا، قبائل میں بانٹ دیا ہے اور بس۔ لیکن اس فضیلت و اعزاز کے لئے جسکا غلط گمان آج کہلانے والے مسلمانوں نے اپنے لئے خاص کر لیا ہے اس نے معیار ٹھہرایا تو یہ ٹھہرایا

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

اللہ کے نزدیک زیادہ معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار، متقی ہے۔ بتاؤ تم نے اپنی فضیلت و تفوق کا جواز کہاں سے لکالا۔ گروہ بندی، جتھہ بندی

برادری کی تقسیم اور پھر اس تقسیم میں کم معزز اور زیادہ معزز کے مفروضہ مدارج تم نے بنائے ہیں ایک بھی صحیح نہیں ہے، اسلام نے اس طرح کی کوئی بھی تقسیم تسلیم نہیں کی جس طرح ہندوستان میں ہندوؤں نے اپنی چار ذاتیں اور ان کا اعزاز و اکرام فرض کر لیا تھا کہ چھوت چھات کی رسم جاری کی تھی یا مصر کے آثار و نقوش بھی بتاتے ہیں کہ انہیں بھی جذبہ تفوق اور انانیت تھا، یا پھر قبل از اسلام عرب میں کسی نہ کسی شکل و صورت میں چھوت چھات اور فخر و غرور کار فرما تھا - لیکن بعد بعثت خیر الناس و خیر الرسل یہ چیز آہستہ آہستہ معدوم ہوتی گئی اور زیور اسلام سے آراستہ ہونے کے بعد ایک مسلمان کے نزدیک تو بیجا غرور کا کوئی شائبہ بھی باقی نہیں رہ جاتا۔

انسان بڑا ہے یا چھوٹا تو اللہ کے نزدیک جس کا دل پاک ہے وہی بڑا ہے - برادری گروہ یا جتھہ کا کہیں سوال ہی نہیں آتا - جسم کے پیچھے تم پڑے ہو - اور جس کی بابت تمہارا خیال ہے کہ اگر وہ صاف ہے اور دوسرے کپڑے بھی صاف ہیں اور ڈھکا ہوا بھی، اچھے درزی کے ہاتھ سے سلے ہوئے کپڑے پہنے ہے تو وہی اشرف و معزز و برتر انسان ہیں - مگر یاد رکھو کہ یہ طہارت اور صفائی بھی طہارت و صفائی نہیں - سچی طہارت اور سچی صفائی - دل کی طہارت اور دل کی صفائی ہے اور برتری اور فوقیت بھی اسی آدمی کو ہے جس کے سینے میں اس کا دل طاہر و صاف ہو۔

سن لو کہ زبانی عقائد سے نہیں، مسلمان عمل سے مسلمان ہوتا ہے اور پھر جب زبانی اقرار و عقائد کے اعتبار سے بھی وہ لوگ تمہاری طرح ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، تو پھر ان کے ساتھ تمہارے یہ وحشیانہ سلوک کیوں؟ انہیں بھی بہت سے ایسے ہیں جو صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں کتنے ایسے ہیں جو پابند نہیں اور تم خود بتاؤ کہ تمہارا کیا حال ہے؟ کیا خود تمہارا بھی یہی حال نہیں ہے؟

کہ بعض نماز و روضہ کے پابند ہیں مگر اکثر ہائے اکثر غافل و تارک صلوٰۃ اور عجب نہیں کہ تمہارے غور والے اور مدعیان فضیلت تفوق قیامت کے دن منہ دیکھتے رہیں اور وہ اعزاز و تکریم میں تم سے بڑھ جائیں ۔

چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ، ارشاد و تعلیم ہمارے سامنے ہے۔ ایک سے زائد نمونے ہمارے پیش نظر ہیں کہ اقوام غیر اور نامسلمانوں کے ساتھ آپ کا میل جول، اکل و شرب، کس قدر بڑھا ہوا تھا۔ بے تکلفی کی فراوانی نے کبھی مسلم و غیر مسلم کی تمیز تک نہ ہونے دی، دیکھنے والے یہی سمجھتے رہے کہ ایک اپنے خاندان کے کسی فرد یا سچے اور پکے مسلمان سے محو کلام و مصروف گفتگو ہیں یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکوں کے ساتھ بے تکلف شریک طعام ہو جایا کرتے تھے اور کبھی اس قسم کا پرہیز نہ فرمایا۔ چنانچہ دو واقعے اس معاملہ میں نہایت اہم اور تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں ۔

ایک مرتبہ عیسائیوں کا ایک ڈیپوٹیشن آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے انکو مسجد میں ٹھہرایا۔ کون سی مسجد، وہ مسجد کہ اللہ کے نزدیک کعبۂ اقدس کے بعد قسم ہے خدا کی کہ کوئی محترم و محبوب جگہ نہیں ہے۔ مسجد نبویہ میں ٹھہرایا۔ بخاری کی روایت ہے کہ جب اتوار کا دن آیا تو ان لوگوں کو نماز کے لئے تشویش ہوئی۔ جب واقعہ کا علم اس وجود اقدس کو ہوا جو کسی کے فکر و غم کو برداشت نہیں کر سکتا تھا تو اس نے ان عیسائیوں کو تسلی دی اور فرمایا کہ تم کچھ تردد و ملال نہ کرو۔ یہ مسجد عبادت ہی کے لئے ہے تم شوق سے اپنے طریقہ پر نماز ادا کرو، مجھے قطعاً اعتراض نہیں اور نہ کوئی مسلمان کچھ تعارض کریگا چنانچہ وہ خوش ہو گئے اور یورپ کی طرف منھ کر کے اپنے طریقہ پر اپنی نماز ادا کی ۔

دوسرا اہم واقعہ، بنو ثقیف قبیلہ طائف کی آمد کا واقعہ ہے صحاح ستہ

میں ہے کہ انکے ساتھ رحمت اللعلمین ؐ کا سلوک نیک تاریخ عالم کے اہم ترین واقعات اور حضور کے رؤف و رحیم اور رحمۃ اللعلمین ہونے کا ناقابل انکار ثبوت ہے۔ پہلا واقعہ تو یہ ہے کہ اس اعتبار سے کہ اس وقت عیسائیوں کی دشمنی اتنی سخت و شدید نہ تھی اور وہ اہل کتاب تھے اتنا اہم نہیں ہے جسقدر کہ واقعہ ثانی اپنی نوعیت و واقعات و حقائق کی بنا پر اہم ہے۔ اس لئے کہ یہ گروہ یعنی طائف کا قبیلہ بنو ثقیف عقیدتاً مشرک کامل تھا پھر اس گروہ کی اسلام دشمنی کا وہ روح فرسا واقعہ بھی ہے کہ جب سرور دو عالم، محبوب پروردگار مکہ میں دینی تبلیغ کا خاطر خواہ اثر نہ پاکر اس خیال سے طائف تشریف لے گئے کہ مشرکین مکہ کی عداوت میں ذاتیات کو بھی دخل ہے۔ قرب و جوار دیہات میں شاید تعلیم مفید ہو تو اسی قبیلہ کے سرداروں نے شریروں کی ایک جماعت پیچھے لگادی۔ جس جگہ حضور تشریف لے جاتے۔ یہ لوگ شور کرتے اور پتھر مارتے نتیجہ یہ ہوا کہ وجہ دگرامی جس سے زیادہ محترم جس سے زیادہ اشرف جس سے زیادہ اکرم ابتدائے، ابتدائے تخلیق سے آج تک اس کرہ خاک پر پیدا نہیں ہوا اور نہ ہوگا لہولہان ہوگیا۔ پیشانی اقدس سے خون کے فوارے پھوٹنے لگے اور خون بہہ بہہ کر پیروں تک آیا۔ نعلین مبارک پائے اقدس کے ساتھ وصل ہو کر رہ گئے۔ الغرض جب وہ آئے تو لوگوں نے کہا کہ انھیں ہم لوگ اپنے اپنے گھروں میں ٹھہرالیں اللہ کے رسول ؐ نے نامنظور فرمایا اور حکم دیا کہ سب کو مسجد میں ٹھہرایا جائے۔ ہم تو یہ سنکر چونک پڑو گے کہ مسجد میں اور مشرک کو ہاں ہاں انھیں مشرکوں اور ایسے خونریز و مفید مشرکوں کے بارے میں حکم فرمایا کہ مسجد میں ٹھہرائے جائیں۔ جن کی اسلام دشمنی کے زخم اسوقت تک بھی ہرے تھے، مندمل نہ ہوئے تھے اور مسجد میں ٹھہرانے کی علت بھی بتادی کہ یہ لوگ اسلام کی عبادت

دیکھیں گے۔ عبادت کی سادگی اور اس کے انہماک و استغراق کو دیکھیں گے۔ اللہ کا کلام سنیں گے سچائی ان کے کانوں میں پڑے گی۔ شاید راہ نیک کی توفیق ملے۔ چنانچہ ہوا بھی یہی۔ اس وفد میں جتنے لوگ آئے تھے کلام اللہ کی سچائی کی باتوں، اخلاق و عادات سے مسلمانوں کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ غور کرو امزاج کی نوعیت کیا تھی، رنگ کیا تھا۔ کمر خلق عظیم، کمر دار عمل اور اخلاص نے کیا بنا دیا۔ آئے تھے دشمن ہو کر گئے تو اسطرح کہ سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں اور ان میں طوق محبت پڑا ہوا تھا۔ اس ذات بابرکات کا جس کے ساتھ وہ وہ سلوک کر چکے تھے جو تم نے ابھی سنا۔

یہ ہیں وہ کردار جس نے اغیار کو اپنا بنایا تھا نہ کہ تم کہ اپنوں کو ٹھکراتے ہو اور ان کو بیگانہ بناتے ہو۔ اور مشرکوں اور کافروں کے حوالے کر دیتے ہو۔ خوب سن لو کہ اسلام میں چھوت چھات نہیں ہے بالکل نہیں ہے قطعاً نہیں ہے۔ یہ ہندو اور دیگر اقوام کی کیفیت ہیں جن پر تم عامل ہوتے جاتے ہو چھوت چھات ناجائز اسلام میں حرام، بلکہ حرام مطلق ہے، کسی چیز سے رسول کریم نے ہمکو بچنے کے لئے اپنی تعلیم میں اتنی تاکید نہیں فرمائی جتنی کہ گندہ چھوت چھات گندہ خیال سے دور رہنے کی۔ یاد رکھو جسم کوئی بھی ناپاک نہیں ہوتا۔ جسم سب کا پاک ہے ہاں ناپاک ہوتا ہے دل، اسی واسطے رسول پاک نے جمعوں، مجمعوں میں لوگوں کو مخاطب فرماتے ہوئے دل کی طرف اشارہ کر کے فرمایا

اَلتَّقْوٰی ھٰھُنَا   اَلتَّقْوٰی ھٰھُنَا

تقویٰ یہاں ہوتا ہے۔ تقویٰ کا مقام یہ ہے، پاکی وہ پاکی ہے جو اس جگہ کی ہو۔ مسیحیت کی کامیابی کی بنیاد چھوت چھات پر ہے۔

عیسائیوں کی تبلیغی عظیم الشان کامیابی کی وجہ بھی یہی چھوت چھات ہے

آج کل کے مسلمانوں کی اسی پست ذہنیت نے ان پر ترقی کے میدان کھول دیئے۔
ہیں وہ مسلمان جو تمہاری ہی غفلت تبلیغ سے پستی میں رہ گئے اور اسلامی تعلیم وہاں
نہ پہنچ سکی اور آج تمہارے خیال میں اچھوت مسلمان ہیں۔ جب انھوں نے
دیکھا کہ مسلمان بات پوچھنا تو درکنار ہمیں مسلمان بھی نہیں سمجھتے تو وہ عیسائی
ہوگئے۔ چنانچہ پنجاب میں آج بھی وہ بستیاں کی بستیاں جو باپ دادا سے مسلمان
تھیں عیسائی ہوچکی ہیں اور اسی طرح یوپی میں بھی بستیاں کی بستیاں تم جاکر
دیکھو تو آج عیسائی ہیں مگر کل وہ مسلمان تھیں۔ ورنہ عیسائی باعتبار اپنی دعوت
وغیرہ کے ایک منٹ کے لئے بھی اتنی عظیم الشان ترقی نہیں کر سکتے تھے۔ آج بھی
مساوات کا جو عالم اور برکات اور تعلیم مسلمانوں میں ہے ان میں نہیں چنانچہ
ان کے یورپین گرجے الگ، نیم یورپین گرجے علیحدہ اور ہندوستانی عیسائیوں
کے گرجے جداگانہ مگر یہ دیسی عیسائیوں کی انتھک کوششوں کا نتیجہ
ہے کہ مسلمانوں کی خصوصیتوں پر عامل ہوکر تمہاری غفلت اور تمہارے
غلط دعویٰ فضیلت و برتری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے
عظیم الشان کامیابی حاصل کی۔

تم جانتے ہو کہ بنگال میں مسلمانوں کی تعداد اکثریت میں ہے، کیوں ایسا
ہے؟ ابتدا میں بعض سچے داعی اور مخلص مسلمانوں کا قدم آیا اور انھوں نے
تبلیغی دورے کر کر کے طرح طرح کی تکلیفیں، کوچ اور مقام کی اذیتیں، خورد
و نوش کے مصائب آب و ہوا کے حملے برداشت کر کر کے اللہ کا کام سمجھ کر اللہ
کی، رسول کی خوشنودی کیلئے اس کے نام و کلمہ کو ان تک پہونچایا، آج گو وہ
اس کے عقائد کے لحاظ سے تبدیل شدہ سہی اعمال میں کاہل و غافل سہی، لیکن
مسلمان ہیں اللہ اور اسکے رسولؐ کا کلمہ پڑھتے ہیں، بہرحال بنیاد قائم ہے۔

عمارت جب چاہے کھڑی کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح یہاں سے قریب ہی کتنی ابنائے وطن کی جماعتیں تھیں جو دل سے مسلمان ہونے کے لئے تیار تھیں۔ مگر برا ہو اس چھوت چھات کا کہ وہاں کے مقامی مدعیان فضیلت و تفوق نے انھیں مایوس کر دیا۔ اور عیسائی ہو گئیں۔

یہی جہالت اور چھوت چھات تو تھی کہ ایک مشرقی بنگال کی اس برادری کا ایک طالب علم جس کو ہم نے اپنی گروہ بندیوں میں سب سے نچلی جماعت و گروہ فرض کر رکھا ہے۔

کلکتہ آیا اور مدرسہ عالیہ میں داخل ہوا اپنی تعلیم ختم کر کے جب وطن پہونچا تو ظاہری کیفیت اور ٹھاٹھ دیکھ کر کسی مسجد میں لوگوں نے نماز کے وقت اس کو امامت کے لئے کھڑا کر دیا۔ بعض لوگ بعد کو آئے اور یہ دیکھ کر یہ تو فلاں برادری کا شخص ہے۔ حالت نماز ہی میں اس کو مارنا شروع کیا؟ کیوں؟ اسلئے کہ فلاں برادری کا ہو کر امامت کے لئے کیوں کھڑا ہو گیا۔ بالآخر وہ بھاگ کر تھانے پہنچا اور اپنی جان بچائی۔ وہاں سے میرے پاس کسی نہ کسی طرح کلکتہ آیا۔ حالات سن کر میں نے چند آدمیوں کو اس بستی میں بھیجا اور تاکید کی ایک مجلس طعام ترتیب دے کر سب کو ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھلایا جائے اور میرا حکم پہونچا دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ گو بعض جاہلوں نے انکار کیا۔ مگر ایک کثیر تعداد اس پر تیار ہو گئی۔ اور ایک حد تک ان کے خیالات کی اصلاح ہو گئی۔

میرا خیال تھا کہ شاید اب جہل کم ہو گئی ہے مگر اب اس واقعہ نے بتلایا کہ نہیں کہ اب بھی ایسے جہلا کی کمی نہیں۔

افسوس کہ لوگ اب بھی اثر نہیں لیتے۔ آنکھیں نہیں کھولتے اور ان کو

اپنی زبوں حالی کا احساس نہیں ہوتا۔

جو تم میں یہاں موجود ہے وہ سن رہا ہے اور جو موجود نہیں ہے تمہارا فرض ہے کہ اس تک میری آواز پہونچا دو کہ وہ مسلمان مجرم ہوگا جو کسی مسلمان سے چھوت چھات کرے گا، وہ مسلمان مجرم ہوگا جو کسی کے ساتھ دنیا کی بنائی ہوئی حلقہ بندی میں سے کسی حلقہ میں خواہ وہ کتنا ہی کم درجہ کا حلقہ ہو مگر اللہ کے ساتھ اپنا رشتہ رکھتا ہو اس سے چھوت برتے گا یا اس کو اپنے سے کم یا حقیر و ذلیل سمجھے گا۔

وہ مسلمان مجرم ہوگا جو کسی مسلمان سے پیشہ یا کام کی بنا پر اس سے پرہیز کرے گا اس کو بہ نظر ذلت دیکھے گا۔

مسلمانوں کا انحطاط

یہ توقع کرنا عبث ہے کہ میں زیادہ دیر تک یا بھاری آواز سے تقریر جاری رکھ سکوں گا۔ البتہ اپنے خیالات کمزور و نحیف آواز میں لیکن اس آلہ کی مساعدت سے (آلہ نشر الصوت کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے) آپ تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ البتہ یہ کام کہ آواز آپ کے کانوں سے دل تک پہنچے اور اس میں کچھ احساس و گرمی پیدا کرے میں اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔

آپ لوگ گذشتہ سال بھی تبلیغ و اشاعت اسلام کے جذبات لئے ہوئے اس شامیانے کے نیچے جمع ہوئے تھے اس وقت بھی میں نے اسطرف توجہ دلائی تھی کہ تبلیغ کے دو اہم حصے ہیں۔ ایک داخلی، دوسرا خارجی۔

خارجی یہ کہ غیر مسلمین میں تبلیغ کی جائے۔ مثلاً ہندو وغیرہ وغیرہ۔

داخلی یہ کہ خود مسلمانوں کو مسلمان بنایا جائے اور ان میں تبلیغ و اشاعت دین کی جائے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ علماء کی ایک جماعت اور ان کا ایک حصہ غالب اب تک غافل و خاموش ہے اور تبلیغ کے جو فرائض ہیں ان کا سب سے زیادہ اہم ضروری کام کہ خود مسلمانوں میں تبلیغ کر کے

انکو راسخ و مضبوط مسلمان بنایا جاتا وہ جیوں کا تیوں ہے ۔

ایک اہم چیز اسکے ماسوا جو پیش کرنا چاہتا ہوں اور جو ابھی مکان سے آتے ہوئے جبکہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے کس عنوان پر تقریر کرنا ہے میرے ذہن میں آئی اور جس کا تعلق مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی سے ہے مختصراً بیان کروں گا۔

اس سلسلہ میں پہلے بنیادی بات سمجھ لو جب تک اسکو پیش نظر نہ رکھوگے حقیقت بے نقاب نہ ہوگی۔ مطالعہ قرآن حکیم سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے جہاں مسلمانوں کے مختلف گوشہ ہائے زندگی پر روشنی ڈالی ہے انکے اعتقاد انکے اعمال انکی شناخت کے معیار بتائے ہیں انکی انفرادی اور اجتماعی کیفیت کا بھی نقشہ کھینچکر ان کی پہچان تبلادی ہے جسطرح قوم و ملک کے افراد جماعات نے اپنی اپنی وضع قطع و اعمال و افعال، اطوار اور چلن مقرر کر لئے ہیں اور تم دیکھتے ہی یہ رائے قائم کر لیتے ہو کہ یہ شخص فلاں ملک فلاں مذہب کا انسان ہے یا کسی جماعت کو اس کے مقررہ لباس و وضع میں دیکھ کر تم فوراً یہ سمجھ لیتے ہو کہ یہ تو فلاں جماعت ہے ٹھیک اسی طرح اللہ نے حلقہ بگوشان اسلام کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے لئے بھی ایسے اعمال و قوانین مقرر کر دیئے ہیں کہ اگر وہ خصائص و شناخت انکے جس گروہ میں یا جس فرد میں پائی جائے اصطلاحی بولی میں وہ مسلمان فرد یا جماعت ہے۔ اگر قرآن کی معمولی تفحص و جستجو کی جائے تو صاف آشکارا ہو جاتا ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی شناخت کے لئے ایک یا ایک سے زائد باتیں ایسی بیان کی ہیں کہ وہ علامات و اعمال جس گروہ میں پائی جائیں وہ مسلمان ہے نہ پائی جائیں تو مسلمان نہیں۔ اور وہ علامات و اعمال جس گروہ میں؟ دو عملوں کا ذکر کیا ہے قرآن کے نزدیک مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی یہی دو شناختیں بنیادی ہیں۔

جماعتی زندگی کے خصائص بجماعتی زندگی کے فضائل، جماعتی زندگی کے فرائض،
تم کو قرآن کے ہر صفحہ میں ملیں گے اور انہیں یہ دونوں زبردست واہم ترین اسلامی
اجتماعی زندگی کی علامات بھی ہیں یعنی اقیموا الصلوٰۃ واتوالزکوٰۃ قیام صلوٰۃ آداۓ
زکوٰۃ، قیام نماز وایتاۓ زکوٰۃ - نماز و انفاق فی سبیل اللہ -

چنانچہ قرآن میں تم دیکھو گے تو یہ دونوں حکم تم کو ہر جگہ ملے جلے ملیں گے ان پڑھ
سے ان پڑھ مسلمان جسکو دو چار سورتیں بھی نماز کے لئے یاد ہیں، وہ بھی اس سے
بے خبر نہیں ہے - اور یہ چیزیں اولین شرط و بنیاد اسلام قرار دی گئی - اور کسی مرتد
و فاسق گروہ کو بھی مستثنیٰ نہ کیا گیا - چنانچہ سورۂ توبہ میں فرمایا - وان تابوا واقاموا
الصلوٰۃ واٰتوالزکوٰۃ فخلوا سبیلھم ؕ اگر یہ سرکش و باغی قبائل قریش اپنی گذشتہ
شرارتوں پر اظہار ندامت کریں - نماز کی پابندی کا اقرار موثق اور اداۓ زکوٰۃ کا عہد
مستحکم کریں تو ان پر سے پابندی اٹھالی جاۓ -

پس قرآن نے جو اہمیت اس کو دی ایک سو چودہ سورتوں میں کسی دوسرے
عمل کو اتنی اہمیت نہ دی گئی - چنانچہ ہر جگہ اور ہر صفحہ قرآن میں قیام وصلوٰۃ و
اداۓ زکوٰۃ کا تذکرہ ظاہر کرتا ہے - کہ مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی شناخت کا یہ
نہایت اہم معیار ہے اور اسکا ترک نے فقدان غیر اسلامی زندگی کا ثبوت اور جہانتک
اسکے ترک کلی کے مضر اثرات کا تعلق ہے ترمذی کی اس حدیث میں نتائج کا ذکر صراحتا
موجود ہے - یعنی

لا یرون کفر الا ترک الصلوٰۃ یعنی بنیادی عقائد کے باوجود
ترک نماز مخرج عن الملت ہے اور کوئی جماعت اگر بحیثیت جماعت کے
نماز کو ترک کر دے تو ایک لمحہ کیلئے بھی وہ جماعت مسلمان نہیں رہتی -
اس سلسلہ میں ہرگز دو رائیوں کی گنجائش نہیں -

اب غور کرنا چاہئے کہ کتاب و سنت کی مقرر کردہ شناخت کے ماتحت موجودہ مسلمانوں کا کیا حال ہے؟ آج مسلمانوں کی عملی زندگی کا کیا حال ہے اور منشائے قرآن کے مطابق ان دونوں اسلامی شناخت کے معیار پر مسلمان، مسلمان ہیں یا نہیں؟ ظاہر ہے یہی دونوں بنیادی اعمال تم سے مفقود ہو گئے ہیں اور اجتماعی شکل میں ترک کر دیئے گئے ہیں اور اگر جا بجا کہیں یہ چیز نظر آتی بھی ہے تو اسلامی نہیں غیر اسلامی طریق پر۔

تم کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اسلامی طریق کیا ہے اور غیر اسلامی طریق کیا؟ سنو! ہر کام کرنے کا ایک ڈھنگ، ایک طریقہ، ایک اصول اور ایک ولولہ ہوتا ہے جس کے ماتحت وہ کسی قانون یا کسی ضابطہ کے مطابق انجام دیا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ اپنی خوشی سے جب چاہا ٹِک مارا۔ کرتے ہو مگر ناقص طریقے پر! ڈھنگ نہ رہا، ولولہ جاتا رہا۔ نماز ہی کو لو نماز کیلئے "اقامت" کا لفظ آتا ہے، "نماز قائم کرو"۔ ہر جنس کی طرح نماز کی بھی ظاہری شکل ہے۔ باطنی روح ہے۔ ان سب کو بجا طور پر ادا کرنا اس کا قائم کرنا ہے جسکو افسوس کہ تم نے، تمہارے بیدرد ہاتھوں نے برباد کر دیا ہے اگر تمہاری آج کل جیسی نماز سے نماز کے قیام کا منشا پورا ہوتا تو پھر اس کی سعادتیں کیوں اپنا جلوہ نہیں دکھاتیں۔ سن لو کہ عبادت تو اس وقت سے تھی جب سے دنیا کے دریا اور پہاڑ ہیں۔ عبادت تھی مگر قیام نہ تھا تم کو صلوٰۃ کا حکم اور اس کی تاکید فرمائی گئی ہے اور قیام صلوٰۃ باعتبار اپنے معانی کے ادا نہیں ہوتا جب تک قیام جماعت و التزام جماعت بھی نہ ہو۔

افسوس تم سے التزام جماعت کا ولولہ جو بام علو و ارتقا کا پہلا زینہ تھا مفقود ہو گیا ہے۔ تم اگرچہ نماز ادا کرتے ہو مگر اس کو اتنی اہمیت نہیں دیتے کہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنی چاہئے۔ صرف جمعہ کا التزام تو کسی نہ کسی طرح اور کسی

نہ کسی صورت میں باقی ہے لیکن جماعت کے قیام والتزام کی اہمیت تم نے گنوادی
اور یہ نہ سمجھا کہ ترک جماعت بھی معصیت ہے گویا کلیتہً مسئلہ کی فرضیت کھودی۔
التزام جماعت کی اہمیت برباد کردی نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ یا تو کرتے ہی نہیں یا جو کرتے
بھی ہیں تو وہ بے حقیقت۔ حقیقت تو ان طریقوں پر موقوف ہے جو قیام صلوٰۃ کے
ذریعے سچی برکت وسعادت کی شکل میں صورت حاصل کی جائے اور جو ناممکن
ہے بغیر قیام والتزام جماعت کے۔

زکوٰۃ کے عام وخاص دو معنی ہیں۔

ایک شخص اپنے نفس ذات کے لئے اپنے سرمایہ میں سے جو کچھ دیتا ہے وہ
انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ یہ اگرچہ زکوٰۃ نہیں مگر زکوٰۃ کے عام معنی میں آجاتا ہے۔

خاص معنی یہ کہ وہ اپنے اصول وقواعد کی تعریف اور قانون جاریہ کے ساتھ
ایک خاص ٹیکس ہے جو اسلام نے تمام پیروان اسلام پر عائد کردیا ہے۔

اس اعتبار سے کہ مسلمان اسکے ساتھ بحیثیت ایک رکن دین ہونے کے
کیا سلوک روا رکھتے ہیں۔ کتنے ہیں جو اس پر عملدرآمد کرتے ہیں۔ کتنے ہیں کہ انھوں
نے اس اہم ترین بنیادی مسئلہ دین کو اپنی بے اعتنائیوں اور اپنی جہالت سے پس
پشت ڈالدیا ہے اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان کہاں پہونچ گئے ہیں تو یہ حقیقت
اس چمکتے ہوئے آفتاب کی طرح بے نقاب ہوجاتی ہے اور ہم صاف یقین کرلیتے
ہیں کہ یا تو مسلمان اس اہم فریضۂ دین کو ادا ہی نہیں کرتے اگر کرتے ہیں تو اسلامی نہیں
غیر اسلامی ڈھنگ پر۔

منطقی طریقے کا جہاں تک تعلق ہے کوئی شخص جو انفرادی طور پر زکوٰۃ نکالتا
ہے ہوسکتا ہے کہ وہ سمجھتا ہو کہ ہماری زکوٰۃ ادا ہوگئی، اور ممکن ہے کہ ادا ہوجاتی ہو مگر
ایک لمحہ تامل کئے بغیر میں علی الاعلان کہوں گا کہ ادائے زکوٰۃ کی روح فنا ہوجاتی ہے

اور جو علم اس حکم میں تھی چونکہ وہ مفقود ہے لہذا اس کا ادا کرنا برابر ہے تمہارا عمل ادائے زکوٰۃ اکارت اور تیرہ سو برس میں جہاں تک اسلامی تعلیم، احادیث و احکام نبوی عمل صحابہ کا تعلق ہے تم نے نظام و التزام دونوں کی خلاف ورزی کی اور اسلامی زندگی کا جہاں تک تعلق تھا اس کی شان کا جہاں تک نتیجہ تھا۔ تم نے باقی نہ رکھا۔ اس لئے آج ہر قسم کی پستی و زبوں حالی کا تم شکار ہو گئے۔

روٹی پکانے کے لئے جب تم آگ سلگاتے ہو تو تم دیکھتے ہو کہ آگ آنے سے پہلے اپنی گرمی بھیج دیتی ہے اس کو تم یقین کر لو گے اور کہتے ہو گویا مادی اشیا کے حقائق کا تو تمہیں یقین ہے لیکن اعمال اسلامی میں بھی اس کے خاصہ رکھنے کا تم کو یقین، اس میں کسی گرہ کے پوشیدہ ہونے کا یقین، اس میں کسی مصلحت و راز کے پوشیدہ ہونے کا اعتبار تمہیں نہیں ہے

اچھا اگر تم اپنے طریق مستعملہ پر ادائے زکوٰۃ کو فرض کی سبکدوشی یقین کرتے ہو تو بتاؤ کہ زکوٰۃ جس میں حکمت الٰہی کا خاصہ بھی مضمر تھا اور عمل کے بعد اس کی برکتوں کا آنا ویسے ہی یقینی ہے جیسے پھولوں کے بعد پھل کا آنا لابدی تو بتاؤ کہ پھر وہ برکتیں وہ سعادتیں، وہ اعجاز، وہ ازالہ، وہ ارتقا، وہ نشوونما وہ سرسبزی جس کا قرآن میں وعدہ ہے کہاں ہے ؟

اصل یہ ہے کہ تمہارا طریقہ ادائے زکوٰۃ، اگرچہ انفرادی ہے مگر غیر اسلامی روح سے خالی جسم کے مانند، بلاشبہ تمہارا دل برف کی ایک سل ہو کر رہ گیا ہے حرارت و تپش اسلامی سے خالی ہو چکا ہے اس لئے تمہارا ہر عمل و کار خیر غیر مستحسن اور غیر منفعت بخش ہوتا ہے۔

کس ملک و حکومت کا یہ رواج ہے۔ اور کونسی حکومت بحیثیت ایک حکومت کے اس کو تسلیم کرے گی کہ تم جو اپنے ہاتھوں سے ہر سال ماہ رمضان میں اپنے

بھی کھاتوں کو کھول کر ان رقومات کو جن پر تم نے پہلا ہی نشان لگا رکھا ہے۔ جوڑ لو خود ہی زکوٰۃ کی رقم مقرر کر لو۔ پھر بیسیوں ریزگاریوں کی ہیڑیاں اور چھوٹے بڑے لفافے بنا لو پھر خود ہی اپنے ہاتھوں سے بھکاریوں کی ایک بھیڑ جو تمہاری دوکان کے سامنے جمع ہو جائے ان میں تقسیم کر کے اطمینان کا سانس لو۔ اور یہ فرض کر لو کہ اب ایک سال کے لئے ہم اس مصیبت سے نجات پا گئے۔ اور حکومت کے کارندے اور عاملین زکوٰۃ تمہارے پاس آئیں تو انھیں بتا دو کہ ہم نے خود ہی حساب کر لیا اور خود ہی زکوٰۃ تقسیم کر دی اور تمہارا یہ جواب سن کر مطمئن ہو کر چلا جائے۔ کیا موجودہ حکومت بھی اپنے ٹیکس کے بارے میں تمہارے ساتھ ایسی رعایت رکھتی ہے۔ اگر نہیں تو اللہ کے احکام کے ساتھ تمہارا یہ تمسخر کیوں جائز مان لیا جائے۔

سب سے پہلی بنیادی غلطی، نہیں غلطی کا لفظ کافی نہیں ہے مفہوم تشنہ تکمیل رہتا ہے۔ گمراہی سب سے پہلی بنیادی گمراہی جو اس اہم ترین رکن دین کے بارے میں پھیل گئی وہ یہ ہے کہ وہ علم اور حقیقت نظر انداز کر دی گئی جو اسلام نے قرار دی تھی۔ قرآن میں جب مواقع زکوٰۃ پر تم غور کرو گے تم کو معلوم ہوگا کہ نفاق کی ضد اور مد مقابل انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر آیا ہے ذکر ہی نہیں بلکہ تاکید۔ نفاق کیا؟ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے سے مٹھیوں کو بند کر لینا۔ انفاق کیا؟ یہ کہ اللہ کے راستے میں خرچ جائز موزوں اور ضروری جگہوں میں اللہ کی دی ہوئی نعمت کو خرچ اور تقسیم کرنا، اس خاص شرط و طریقہ کے ماتحت اس تقسیم اور خرچ کو گویا زکوٰۃ کے لفظ سے قرآن حکیم نے تعبیر کیا ہے لیکن جو خالص اسلامی مدات میں خرچ کی جائے۔

حکومت کے ٹیکس تو حکومت کے عام اغراض کے لئے ہیں یہ زکوٰۃ کے معنی میں نہیں آتے اور چونکہ ان کا خرچ اور تقسیم کرنا بھی غیر اسلامی مقاصد اور طریقہ پر ہے لہذا وہ رقم اس میں محسوب نہیں ہو سکتی جیسا کہ اکثر مداحین حکومت کہتے ہوئے پائے

جاتے ہیں۔

۹ھ کے بعد جیسا ہے کہ سورہ نصر نازل ہوئی ہے سقوط بغداد تک متعدد اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں لیکن کسی اسلامی جماعت اور گروہ نے ایسا نہیں کیا جیسا تم کرتے ہو بلکہ لوگوں کے دل میں ایسا گمان۔ خیال بھی نہ تھا تم نہیں ہو اپنا انکم ٹیکس خود ہی نکالنے والے یہ اسلامی حکومت کا کام ہے۔ یہ حکم اس وقت موجود و قائم ہے جب تک صحاح ستہ و احادیث رسولؐ کو غرق کر کرو اور انہیں بھی جنہوں نے کتاب و سنت کی بو بھی سونگھی ہے۔

غرضیکہ اس زمانہ میں زکوٰۃ کا طریقہ انفرادی نہ تھا جماعتی تھا اور عمال حکومت کا کام تھا کہ وہ زکوٰۃ وصول کریں چنانچہ بنو امیہ کے زمانہ میں جب فسق و فجور بڑھتا رہا تھا مالکان زکوٰۃ نے امام وقت سے مسئلہ پوچھا کہ کیا اب بھی انہیں زکوٰۃ دیں تو انہوں نے حکم دیا کہ ہاں انہیں کو دو جب تک وہ نماز پڑھتے ہیں تم کو نظم و التزام برقرار رکھنا چاہیئے ایسا ہی بنو عباس کے زمانہ میں یہ معاملہ پیش ہوا جن کا ظلم و جبر مشہور تھا اور جن پر خیانت کا الزام بھی تھا بنو امیہ کے عہد میں یہ اعتراض تھا کہ وہ لوگ زکوٰۃ کی رقم کپڑوں اور عطر میں خرچ کرتے ہیں عبد اللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ اگر خواہ ایسا ہی ہو۔ تمہیں نظام کسی طرح برباد نہ کرنا چاہیئے عمال بدلے جا سکتے ہیں۔ حکومت خراب ہے تو اس سے اچھی حکومت بنائی جا سکتی ہے لیکن اگر اسلامی نظام بگڑ گیا تو کارخانہ ہی درہم برہم ہو جائے گا۔ امام حنبلؒ کا جو مرتبہ باعتبار ان کے زہد و تقدس اور تفقہ فی الدین کے ہے کسی پر پوشیدہ نہیں راہ حق میں جو استقامت انہوں نے دکھائی وہ ہر ایک کا کام نہ تھا، مگر اپنے وصیت نامہ میں انہوں نے بھی نظام زکوٰۃ کی پابندی کی سخت تاکید فرمائی ہے۔

میں بتاؤں اس نظام میں کیڑا کب لگا۔ فتنہ تاتار کے بعد لگا جب تاتاریوں نے حکومت اسلامی کی بنیادیں کھود کر پھینک دیں اور کہیں کسی اسلامی نائب ادارہ کو سر چھپانے

کی کبھی جگہ نہ رہی ہر طرف انتشار اور پراگندگی پھیل گئی تو اس وقت تسلط کے بعد یہ مسئلہ نئے سرے سے اٹھا ہی نہ ، زمانہ وہ زمانہ تھا جب فقہ کی تدوین ہو رہی تھی نئے مسائل اور نئے قوانین اسلام بنائے گئے اور انفرادی طریق ادائے زکوٰۃ کو جائز قرار دے دیا گیا حالانکہ حکومت چھین گئی تھی تو جماعت اس کی قائم مقام تھی ۔ چاہئیے یہ تھا کہ پھر بھی یہ کام جماعت ہی کے سپرد رہتا تاکہ روح رکن ، اور غایت وغرض مسئلہ اس وقت بھی نہ فوت ہوتی مگر ایسا نہ کیا گیا ۔

اگر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام ، احکام حق ہیں تو اے انفرادی طور پر زکوٰۃ ادا کرکے خوشیاں منانے والو! یاد رکھو کہ قیامت کے دن تم جواب دہی اور مواخذہ سے ہرگز نہ بچ سکو گے کہ تم نے حکم قابل غور کی خلاف ورزی کی ہے ۔

کیا ہندوستان میں ایک آدمی بھی اب تمہاری نظر میں باقی نہ رہا جس کی امارت پر تم اتفاق کر سکو نہیں ، دس ہی سہی ، ہر صوبہ میں دس سہی ، یہ بھی نہ سہی تو جس طرح تم اپنی علیحدہ علیحدہ نو آباد اور انجمنیں اپنی اغراض کے لئے بنا لیا کرتے ہو ٹھیک اسی طرح انجمن ہی بنا کر سہی اور تم اسی پر مطمئن ہو تو وہی زکوٰۃ دو ، آخر تم کو اسلام سے اتنی چڑھ کیوں ہو گئی ہے ، کہ صاف وصریح حکم کی موجودگی کے باوجود تم غیر اسلامی طریقے پر مٹے جا رہے ہو ، دیکھئے جا رہے ہو یاد رکھو کہ موجودہ اسلام میں اسی انفرادیت ہی کی بدولت گھن لگ گیا ہے میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتا ہوں اور اس اسٹیج پر سے اعلان کرتا ہوں اور علمائے کرام کی جماعت کو خاص طور پر مخاطب کرتا ہوں کہ اگر اس انفرادیت کو جو آج مسلمانوں کے ہر عمل و اعتقاد میں سرایت کر گئی ہے ۔ جلد تبدیل کرکے اجتماعیت کی شکل میں نہ بدل دیا گیا تو امکان غالب اور قرینہ واثق ہے کہ مسلمان اپنے خصائص اسلامی سے یکسر محروم ہو جائیں گے ۔

سن لو! کہ یورپ اور امریکہ کی سوسائیٹیوں کی بنیادیں بھی کھوکھلی ہو چکی ہیں ۔

عنقریب یہ دیواریں ٹوٹ کر گرنے والی ہیں اور بلا استثناء اطلائے سب کے سب اس نظام سے تنگ آ گئے ہیں اور آفتاب زمین کے گرد گردش کرنے نہ پائیگا کہ وہ سب کے سب اسلامی نظام والتزام پر عمل نظر آئیں گے جس میں سچی اجتماعیت، سچا نظام سچا التزام، تسکین بخش اور اطمینان و مسرت کے خزائن پوشیدہ ہیں۔

اس لئے اگر تم بھی چاہتے ہو کہ آنیوالی ہلاکتوں سے بچ جاؤ تو اپنے ہر کام اور عمل میں دینی ہو خواہ دنیاوی، انفرادیت کو چھوڑ کر اجتماعیت اختیار کرو۔

میں مسلمانان کلکتہ کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ خطبۂ عید کے بعد جہاں میری آواز پہنچی ہے ہر گوشۂ ملک سے بے انتہا خطوط آ رہے ہیں اور سب نے لبیک کہی ہے۔ عنقریب اس قسم کا کوئی اقدام ہونے والا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اسبقیت اس مقابلہ میں بھی تمہارے ہی سر رہے اور اسبقیت و اولیت کی فضیلت جو کچھ ہے سب کو معلوم ہے فبشر الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ ط

ایمان کی حقیقت اور اس کی شناخت

برادران عزیز! دنیا میں ہر بات کی کوئی نہ کوئی شناخت ہوتی ہے۔ تم نے کبھی غور کیا کہ ایمان کی شناخت کیا ہے، تم کہو گے بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ہاں پوچھنے کی بات تو نہ تھی مگر بدقسمتی سے پوچھنے کی بات ہو گئی ہے۔

میں پوچھتا ہوں، تم نے کبھی غور کیا ایمان کی سچی شناخت کیا ہے۔؟ اب میں نے "سچی" کا وصف بڑھا دیا۔ تاکہ تم مطلب سے زیادہ قریب ہو جاؤ، تم نے ایمان کی بہت سی شناختیں بنا رکھی ہیں۔ تم کبھی یہ سمجھتے رہے۔ یہ انسان کی وضع و قطع کے اندر ہے تسبیح کے دانوں، اور ہمیشہ متحرک رہنے والے لبوں میں ہے تم نے بارہا اسے معبدوں کے گوشوں میں تلاش کیا ہے اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ مدرسوں اور خانقاہوں میں جستجو کے لئے نکلتے رہے۔ تم میں بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے محض گھڑے ہوئے اختلافات پیدا کر لئے ہیں اور یقین کرنے لگے ہیں کہ انہی میں ایمان کی شناخت بھی پوشیدہ ہے جس آدمی کا ان جزئیات عقائد میں ایسا خیال ہو وہ مومن ہے جس کا نہ ہو وہ مومن نہیں

تم نے ایک ہی اسلام کے بہت سے ٹکڑے کر کے الگ الگ فرقے بھی بنا لئے ہیں اور اکثروں کے نزدیک ایمان کی شناخت انہیں میں منحصر ہو گئی ہے جو اس طرح کی فرقہ بندی میں ہے وہ مومن ہے جو نہیں ہے وہ مومن نہیں اور یہ آخری شناخت تمہارے مبلغ اعظم کی سب سے بڑی چھلانگ ہے جو آدمی اتنا کود سکے وہ تمہارے

نزدیک میدان علم و دین کا سب سے بڑا شہسوار ہے۔

لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ ساری شناختیں تمہاری گھڑی ہوئی ہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ٹھہرائی ہوئی نہیں ہیں۔ بتلاؤ کہ وہ ایک ہی شناخت کون سی ہے جو خود اللہ ہی نے بتائی ہو، اس کے رسول ﷺ نے اس کی توضیح کی ہو اس کے سچے پیرووں نے اپنے عمل میں اس کا نمونہ دکھلایا ہو، وہ ایک ہی کسوٹی کون سی ہے جو اس چمکتی ہوئی چیز کے کسنے کے لئے بتادی گئی ہو کیونکہ ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی اور جس پر صحابہ کرام ؓ اپنا اپنا ایمان کس کر دیکھ لیا کرتے تھے یہ سونا کھرا ہے یا کھوٹا ہے یہ شناخت حب ایمانی کی شناخت تھی یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کی، مؤمن کون ہے؟ وہ اپنے سارے دل اور ساری روح سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو محبوب رکھتا ہو، اور دنیا کی کوئی محبت اس پر غالب نہ آسکتی ہو۔ غیر مومن کون ہے؟ جو اس محبت سے محروم ہو۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللّٰهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ ۗ کتنے ہی آدمی ہیں جو خدا کے سوا دوسروں کو اس کا شریک اور ہمتا ٹھہرا لیتے ہیں اور ان سے ایسی ایسی محبت کرنے لگتے ہیں جیسی محبت اللہ سے ہونی چاہیئے لیکن جو مومن ہیں ان کی شناخت یہ ہونی چاہیئے کہ وہ أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ ہوتے ہیں یعنی اللہ سے بہت ہی محبت کرنے والے اس کی محبت میں بڑے سخت، بڑے پختہ، ہر طرح کی لچک اور نرمی و خامی سے مبرا، کوئی محبت ان کی محبت الٰہی سے ٹکرا نہیں سکتی ہے، کوئی رشتہ اس رشتۂ محبت پر غالب نہیں آسکتا وہ سب کو چاہتے ہیں مگر اس کی چاہت سے زیادہ نہیں وہ بہت سے علائق رکھتے ہیں لیکن اس علاقہ کے مقابلہ میں نہیں، غور کرو، اس آیت میں دونوں جگہ، ایمانی معاملہ کو محبت سے تعبیر کیا ہے، جو لوگ اللہ کے سوا دوسری ہستیوں کو اس کا مثل و شریک بنا لیتے ہیں ان کے لئے بھی کہا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ۔ ان ہستیوں کو محبوب رکھتے

ہیں اور پھر مومنوں کی نسبت بھی یہی کہا اشد حبا للہ وہ تو اللہ کو سب سے زیادہ محبوب رکھنے والے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کا معاملہ اصلاً محبت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جو دوسروں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں وہ بھی ان سے محبت کرنے والے ہیں اور جو صرف اللہ کے پرستار ہیں وہ بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کی محبت میں سرتا پا غرق ہو جانے والے ہیں۔

اور یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب تم سورۂ توبہ کی مشہور آیت کی تلاوت کرو۔ قل ان کان اٰباؤکم وابناءکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومسٰکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ واللہ لا یھدی القوم الفاسقین ط یہ آیت حب ایمانی کے باب میں نص قطعی ہے اور پوری تفصیل کے ساتھ بتلا رہی ہے کہ ایمان کی شناخت حب ایمانی کے سوا اور کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی دنیا میں ایک انسانی زندگی کے لئے خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی چاہت اور الفت اور رشتہ علائق کی جتنی باتیں ہو سکتی ہیں وہ سب ان آٹھ قسموں میں آگئی ہیں جو یہاں بیان کر دی گئی ہیں اور جس ترتیب سے بیان کی گئی ہیں انسانی علائق کی وابستگیوں کی قدرتی ترتیب ہے

سب سے پہلے ماں باپ کی محبت کی زنجیر ڈھلتی ہے اور ہمارے پاؤں میں پڑتی ہے پھر اولاد ہے اور اولاد کی محبت بھی ایک بوجھل زنجیر ڈال دیتی ہے۔ پھر بھائیوں کی محبت ہے بیوی کے لئے شوہر کی شوہر کے لئے بیوی کی محبت ہے۔ خاندان اور برادری کی رشتہ داریاں ہیں۔ مال و دولت کا عشق ہے، کاروبار اور تجارت کی گہرائیاں ہیں، مکان و جائداد کی دلفریبیاں ہیں۔ فرمایا ان محبتوں میں سے کوئی چیز بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے زیادہ محبوب ہو جاتی ہے اس طرح کہ دونوں محبتوں میں

اگر مقابلہ ہو جائے تو قدم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف نہ بڑھیں کسی دوسرے محبوب کی طرف بڑھیں تو ایمان ناقص ہو گیا اس کی شناخت باقی نہ رہی کسوٹی پہ پورے نہ اترے اور تم ان لوگوں کی طرح ہو گئے جن کی شناخت یہ بتلائی گئی ہے کہ یحبونھم کحب اللہ میں نہ ہوئے جن کی شناخت یہ بتلائی گئی ہے کہ والذین امنوا اشد حبا للہ ط

اس بارے میں آیات و احادیث بے شمار ہیں اور خطبہ کا وقت محدود ہے بخاری و مسلم کی ایک مشہور حدیث کبھی نہ کبھی ضرور تمہارے کانوں میں پڑی ہو گی لیکن تمہیں ان معاملات پر غور کرنے کی مہلت کب ملتی ہے۔ حضرت انس رض سے مروی ہے کہ فرمایا لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین تم میں سے کوئی آدمی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایسا نہ ہو جائے کہ وہ اپنے دل کو ٹٹولے تو میری محبت تمام محبوب انسانوں سے اس حدیث میں ایمان کی صاف صاف نفی کر دی گئی ہے اور اگرچہ لوگوں نے اس نفی کو نفی کمال پہ محمول کیا ہے لیکن بھولنا نہیں چاہئے کہ صاف صاف نفی کر دی ہے کہ کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے دل و دماغ کی ایسی حالت نہ ہو جائے کہ دنیا میں انسانی محبت کے جتنے رشتے ہو سکتے ہیں ان سب سے زیادہ اللہ کے رسول ﷺ کا رشتہ ہو جائے سارے رشتے اس رشتے کے آگے ہیچ ہو جائیں ساری محبتیں اس رشتے کے سامنے سرد پڑ جائیں۔ ساری زنجیریں اس زنجیر عشق کی موجودگی میں بے اثر ہو جائیں۔

امام بخاری رح عبداللہ بن ہشام سے ایک اور روایت بھی لائے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تھے آپ ﷺ نے حضرت عمر رض کا ہاتھ اپنے دست اقدس میں لے رکھا تھا۔ حضرت عمر رض کہہ رہے تھے۔

یارسول اللہ لانت احب الی من کل شیئ الا نفسی التی بین جنبی ط

یارسول اللہ یقیناً آپ کی ذات اقدس مجھے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پیاری ہے مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ اپنی جان سے بھی زیادہ کیونکہ اپنے نفس کی چاہت طبیعت انسانی کی جبلت ہے۔ آپ نے فرمایا۔

لا یا الذی نفسی بیدہ حتی اکون احب الیک من نفسک

نہیں اتنا کافی نہیں اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ایمان کا معاملہ پورا ہونے والا نہیں جب تک میں تجھے تیرے نفس سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔

جب حضرت عمرؓ نے یہ سنا تو انشراح صدر ہوگیا۔ فوراً ایکار اٹھے اَلْاٰنَ وَاللّٰہِ لانت احب الیّ من نفسی ہاں ہاں خدا کی قسم اب آپ مجھے اپنے نفس سے بھی زیادہ محبوب ہو گئے۔ تب آنحضرتؐ نے فرمایا الآن عمر اب اے عمر ایمان کا معاملہ پورا ہوگیا۔

بس یہی ایک شناخت تھی جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے بتائی تھی، اس کے سوا ایمان کی سچی شناخت اور کوئی نہیں ہوسکتی صحابہ کرامؓ میں سے ایک ایک فرد کی زندگی کا مطالعہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ اس شناخت کے سوا اور کوئی شناخت وہ نہیں جانتے تھے ان کی پوری "عقائد نفسی" اور "فقہ اکبر" اسی ایک کلمہ عقیدت سمٹ آئی تھی۔ ان کا ایمان مجمل تھا تو یہ تھا۔ ایمان مفصل تھا تو یہ تھا ان کی اشعریت اور ماتریدیت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ کسی کی محبت میں ساری محبتیں محو کردیجئے اور کسی ایک کی راہ میں دنیا جہان کی ساری چیزیں قربان کردیجئے۔

انہیں تو تمہارے ان گھڑے ہوئے اختلافی عقائد کی خبر تھی، نہ تمہاری بنائی ہوئی فرقہ بندیوں کی۔

ان کا سارا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی راہ میں جان و مال قربان

کرنا ہے اور ان کا سارا مذہب، مشرب، طریقت، اور فرقہ بندی اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ محبت کیجئے اور اس میں سب کچھ بھول جائیے اصحاب اشارات کے اقوال اس مقام میں بے حد متواتر وارد ہوئے ہیں۔ سید الطائفہ بغدادیؒ سے کسی نے پوچھا ایمان کی تعریف کیا ہے فرمایا۔

اما عندکم فالاعتقاد باللہ ورسولہ واما عندنا فالتفانی اللہ ورسولہ

تمہارے نزدیک تو تعریف یہ ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول پر اعتقاد رکھا جائے اور ہمارے مذہب میں ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں فنا ہو جائے۔

اب تم میں سے جس کسی کو ایمان کی فکر ہو یہ کسوٹی لے لے اور اس پر کس کر دیکھ لے واقعی سچا ایمان ہے یا نہیں۔ میں تمہیں یہ بھی بتلادوں کہ کسنا اور پرکھنے کا طریقہ کیا ہے کیونکہ سونا پسند ہر آدمی کرتا ہے لیکن کسنا اور پرکھنا صرف سنار ہی جانتا ہے تم اپنے دل کو ٹٹولو اور ایک ایک بات سامنے لاکر دیکھو کیا جواب ملتا ہے؟ اگر اللہ اور اس کے رسول کی سچائی کی راہ میں تمہیں نفس کی خواہشیں روک رہی ہیں اور ان کی روک دل پر چل رہی ہے تو یقین کر لو کہ ایمان کا نشیمن ابھی تمہارے دل کے اندر نہیں بسا ہے اگر اللہ اور اس کے رسول کی راہ میں تمہیں مال خرچ کرنا دوبھر ہو رہا ہے اور دل چاہتا ہے کسی طرح اس خرچ سے بچے رہیں تو یقین کر لو کہ تمہارے اندر مال پرستی کی علامت تو پوری طرح پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن اس بات کی علامت پیدا نہ ہو سکی جس کا نام ایمان ہے۔

اگر اللہ کے رسولؐ کا ایک صاف صاف فرمان تمہارے سامنے آجاتا ہے اور تم اس پر عمل کرنے سے جھجکتے ہو کہ کسی دوسرے انسان کی تیراد وہ کتنا ہی بڑا اور

کتنا ہی مقدس ہو رائے اس کے خلاف ہے تو گو تم محسوس نہ کرو لیکن تمہیں اللہ کا رسول احب نہیں ہوا، وہ انسان ہو گیا، جس کی رائے کی خاطر صاحب وحی و عظمت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان پیچھے ڈال رہے ہو۔

اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم سنتے ہو لیکن وہ تمہارے دل کو نہیں لگتا اس لئے مدتوں کی کوئی دت، کوئی رسم، کوئی ریت، کوئی سنی ہوئی اور مانی ہوئی بات تم پر چھا گئی ہے اور اسے چھوڑ دینا شاق گزر رہا ہے تو سمجھ لو کہ کسوٹی کا فیصلہ تمہارے خلاف گیا۔ تمہارے پاس ایمان نہیں ہے ایمان صرف اس دل میں ہے کہ کوئی معاملہ ہو، کوئی موافقہ ہو، کوئی راہ ہو لیکن جب ٹٹول کر دیکھا جائے کہ احب کسی کی ذات ہے اور کس کا حکم ہے تو بغیر ایک لمحے کے تامل کے جواب ملے اللہ اور اس کے رسولؐ کی ذات۔ اللہ اور اس کے رسول کا حکم، اللہ اور اس کا رسول اور صرف اللہ اور اس کا رسول۔

اجتماعی زندگی کی بنیاد

برادران عزیز! تم میں سے اکثر اس بات سے بے خبر نہ ہوں گے کہ بہت سے خدا کے بندے ایسے ہیں جو اپنے معاملات میرے سامنے پیش کرتے ہیں اور اخلاص و محبت کی بنا پر مشورہ کے طالب ہوتے ہیں اس طرح بے شمار مختلف اور متضاد قسم کے معاملات اور مسلمانانِ ہند کی افرادِ زندگی کے واقعات جو میرے علم میں آئے وہ بہت کم لوگوں کے سامنے آتے ہوں گے اور اسی علم و تجربہ کی بنا پر غیر صحیح طور پر طول و عرض ہند کے ہر مسلمان کے حالات کی یکسانیت پر قیاس و اطلاق کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکال لینا میرے لئے کچھ مشکل نہیں کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی زندگی اتنی برباد، اتنی مخدوش، اتنی ظلم و حیوانیت سے لبریز ہے اور جن امراض میں گھری ہوئی ہے وہ اس درجہ مایوس کن ہیں کہ صرف یہی نہیں کہ مستقبل قریب میں ان کے سنبھلنے کی امید نہیں بلکہ یہ ان کے برباد و غارت ہو جانے کی ویسی ہی توقع ہے جیسے یہ امید کہ صبح آفتاب اپنے ساتھ روشنی و نور یقیناً لائے گا۔

لوگوں کے معاملات و مقدمات ان کی داستان غم انگیز، ان کی روداد عبرت خیز سن کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شاید ہی مسلمانوں کا کوئی گھر ایسا ہو جو اس ظلم و جور کا شکار نہ ہو۔ ورنہ سو فی صدی اسی مہلک مرض میں گرفتار ہیں کہ ان کی منزل زندگی برباد ہے تم سمجھے کہ منزل زندگی کیا ہے؟ تم جو کہتے ہو کہ ہمارا گھر، تو بتاؤ کہ تمہارے نزدیک گھر کا کیا مطلب سمجھتے ہو کہ کچی پکی اینٹوں کو چن کر ایک چار دیواری قائم

کر دی یا پتھر اور لوہے کی ایک سربہ فلک عمارت کھڑی کر دی یا لکڑی کے ستونوں اور خس و خاشاک سے ایک احاطہ گھیر لیا اور وہ گھر ہو گیا؟ مگر تم اچھی طرح سمجھ لو کہ ان تعمیروں اور گذاروں کی تدبیروں سے گھر نہیں بنا کرتا گھر تو نام ہے ملی جلی خاندانی زندگی کا۔ اسی کو کہتے ہیں منزلی زندگی، اسی منزلی زندگی کے قیام پر قرآن نے زور دیا ہے، اسی منزلی زندگی کے احیاء ترویج اور پابندی پر جناب محمدؐ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی تعلیمات میں اشارہ فرمایا ہے اسی منزلی زندگی کے لئے جس کی خوبیاں جس کے فوائد۔ اور جس کی اہمیت کو دنیا نے اور بالخصوص خطۂ عرب نے پس پشت ڈال دیا تھا، رحمت الٰہی و رافت خداوندی جوش میں آئی اور پیکر رحمت و مجسمہ رافت۔

وبالمؤمنین رؤف الرحیم جس پر تمہارے شیرازے کا انتظار شاق اور تمہاری انفرادی و اجتماعی اصلاح اور سود و بہبود کی غرض غالب تھی تم میں آیا اور تمہیں انسانیت کے درس دیئے تمہاری انفرادی، اجتماعی معاشرتی تمدنی، دینی و دنیوی زندگی کے سود و زیاں کے اصول بتائے اور اپنے عمل و اسوہ کا نمونہ دکھایا اور اپنی منزلی زندگی کو تمہاری دنیاوی اور دینی ترقی کا حکمت خداوندی نے سبب بنیاد بنا دیا ہے مگر صد ہزار افسوس کہ تم نے جس طرح اور ہزاروں روگ اپنے جسم و روح میں پیدا کر لئے ہیں۔ تمہاری اس خاندانی زندگی میں بھی ہزاروں ہزار بیماریاں لگ گئی ہیں۔ تم میں کتنی ہی دنیا کی شان و شوکت پیدا ہو جائے تم ذاتی طور پر کتنے ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو جاؤ۔ تمہارے سامنے جبر و حکومت کے اقراری سجدے کتنے ہی ہوتے رہیں لیکن اگر تمہاری خاندانی و منزلی زندگی تیرہ و مکدر ہے تو انفرادی ہو خواہ اجتماعی، تمہاری ساری شان و شوکت اور نام و نمود بے کار ہے اور تم ہرگز فلاح یافتہ فرد یا قوم نہیں کہے جا سکتے۔

بلحاظ اعمال و باعتبار افعال ہر شخص ایک خاص سانچے میں ڈھل کر اپنا اپنا آئینہ اخلاق و کمال پیش کرتا ہے تو کوئی سانچہ ایسا بھی تو ہونا چاہیئے کہ اس سے خانگی زندگی کا جائزہ لیا جا سکے اور اجتماعی زندگی پر کبھی جا سکے تو اس آزمائش و امتحان کے لئے نیز شریعت نے ہمیں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی جانچ پڑتال کیلئے منزلی زندگی کا ایک سانچہ اور معیار بنا دیا ہے۔ جس سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اس کی گھریلو زندگی کا کیا حال ہے اور جب ہم اس معیار کو لے کر کسی کی گھریلو زندگی کو دیکھتے ہیں تو تم جانتے ہو کہ نتیجہ کیسا نکلتا ہے۔

افسوس کہ مسلمان اس امتحان میں سب سے زیادہ ناکام و برباد پائے جاتے ہیں۔ ان کی گھریلو زندگی، آج جتنی ناشاد و نامراد ہے ان کی گھریلو زندگی آج جس قدر محتاج اصلاح ہے ان کی گھریلو زندگی آج جتنی قابل ماتم ہے اتنی کبھی کسی زمانہ میں نہ تھی۔

گھریلو زندگی کے فرائض سے جس درجہ آج یہ قوم غافل ہے گھریلو زندگی کے فوائد سے جس درجہ آج یہ قوم ناآشنا و محروم ہے اس پر جتنا افسوس کیا جائے ان کی بدبختی پر ماتم کیا جائے بجا ہے۔

حقوق اللہ یعنی اللہ کی ذات اور اس کی صفات کے لئے اسی کی ٹھیرائی ہوئی حد بندیوں کے اندر چند اعتقادات کچھ اعمال اور بعض پابندیاں تھیں۔

لیکن اس معاملہ میں تم کہاں پہنچ گئے ہو، تم میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جو اس سے ناواقف ہو کہ اللہ کی ذات جو مالک تھی، قادر تھی، خالق تھی اس کو ایک عضو معطل اور بت بے جان قرار دے رکھا ہے انسانی ڈھانچوں اور خود ساختہ آستانوں پر اپنے جہل اور وہم پرستیوں کی وجہ سے۔ ارباب من دون اللہ اور خدا جانے کیا کیا مسجود و معبود بنا کر صریح شرک اور فسق و فجور میں

مبتلا ہو کر رہ گئے ہو ، جادہ حقیقت سے دور اور گمراہیوں اور قبیحات میں پھنس کر روح اسلام کھو بیٹھے ہو۔

یہ ہے وہ حال جو اللہ کے حقوق کے بارے میں تم نے بنا رکھا ہے۔

حقوق عباد :۔ تعلیم نبوی ، اعمال صحابہ اور بلاغت قرآنی کے مطالعہ سے جس کو دیکھنے اور سننے کی ہمیں مہلت نہیں ملتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑی نعمت ان احکام اور احکام کی تعمیل میں پوشیدہ تھی اور جس میں سے ایک خاص بلکہ خاص الخاص گھریلو زندگی تھی وہی تم نے برباد کر دی ہے۔ اور اب گھریلو زندگی کے لئے جہاں کہیں اور جس مسلمان کے گھر میں نفوس اور تلاش کی جائے وہ معدوم ہوگی گویا وہ چیز جو یکسر خیر و برکت اور قرآن کی بولی میں رحمت تھی اس سے آج مسلمان کا گھر تقریباً خالی ہے یعنی تمہارا کوئی گوشۂ زندگانی اتنا گندہ و تاریک نہیں ہے جتنا گھریلو زندگی کا نقشہ گندہ و تاریک ہے۔

قرآن نے جہاں ہر چیز کے پرکھنے کی کسوٹی بنائی ہے وہاں اسلامی خاندانی زندگی کی جانچ کے لئے بھی کسوٹی بنا دی ہے اس کے پیش نظر فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے گھر کی چھت کے نیچے قرآن کے ان احکام کی پابندی کا کیا حال ہے۔

باپ کے ذمہ فرائض ہیں اولاد کے ، اولاد کے ذمہ فرائض ہیں والدین کے ، شوہر کے ذمہ فرائض ہیں بیوی کے ، بیوی کے ذمہ اللہ کے ٹھہرائے ہوئے شوہر کے حقوق ہیں ، بیوی کو چاہیئے کہ وہ انہیں بجا لائے اور شوہر پر یہ فرض ہے کہ بیوی جو ہر طرف سے منہ موڑ کر اور دنیا جہان کے تعلقات سے دست بردار ہو کر شوہر کی چار دیواری میں اسی کی ہو کر رہ گئی ہے اس کی رضا جوئی کو مقدم رکھے اور حق ادا کرنے میں کوتاہی نہ کرے تاکہ پاک اور سعید زندگی پیدا ہو۔ بلاغت قرآنی

نے اس چیز البیصاط کے جامع الفاظ سے ظاہر کیا ہے یعنی پاک اللہ سعید زندگی کی ایسی شان وشوکت کہ ہر وصف وصفت کی قلبی تسکین و روحانی وابستگی زوجین محسوس کریں اور اس کے لطف وبرکات سے دونوں لذت اندوز ہوں۔ لیکن تمہاری زندگی میں جو چیز یکسر عنقا ہے اور تمہاری زندگی جن صعوبات اور سوانح سے برہنہ ہے وہ ہر قسم کی ذلت، نگینت اور معصومیت و نگہ نسائی ہے۔ کاش تم کبھی اپنی اس حالت پر غور کرنے کے لئے ایک لمحہ بھی اپنے پر معصیت اوقات حیات سے نکال سکتے۔

حقوق عباد میں سے گھریلو زندگی کی برکات اور سکینہ قلب کا پہلا انعام قرآنی بول چال میں تو وہ تھا جو تم نے ابھی سنا۔ اس کے علاوہ بھی دو انعام الٰہی و عطائے خداوندی اور بھی ہیں یعنی۔

جعل بینکم مودۃ ورحمۃ

اس زندگی کی بنیاد اور اس کا انعام مودہ ورحمۃ ہے اب گویا تین انعام ہوئے (۱) سکون راحت اور چین جب تم گھر میں قدم رکھو تو کوئی ایسا تو ہو جو تمہاری راہ میں آنکھوں کا فرش بچھاتا ہو۔ تمہاری تسکین دل ودماغ اور راحت جسم وروح کا سبب ہو جس کی ذات سے اللہ کا منشا پورا ہوتا ہے۔ لتسکنوا الیہا۔ (۲) مودت، دوستی باہمی ارتباط و محبت (۳) رحمت اعجاز قرآنی ہے کہ اللہ نے رحمت کو بھی جو اس کی خاص الخاص ملکیت تھی تمہارے خصائل حسنہ نیک میں سے ایک قرار دیدیا۔

رحمت کیا ہے؟ رحمت و مودت میں فرق کیا ہے۔

مودت تو باہمی ربط و نسبت تھی جو اپنی انتہا میں محبت ہو گئی اور رحمت یہ ہے کہ محبت نے اتنی ترقی کی کہ جب وہ اپنی آخری حد تک پہنچی تو

رحمت نام پایا۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کے ساتھ یہی رشتۂ محبت تھا جو کبھی بالمومنین رؤف الرحیم کا لقب پایا۔ کبھی وما ارسلناک الا رحمت للعالمین سے یاد کیا گیا۔ بس رحمت کیا ہوئی انتہائی ہمدردی، رحم وعفو وبخشش ودرگذر، چشم پوشی وغیرہ۔

پس قرآن کے مقرر کردہ معیار کے مطابق کیا تمہاری منزلی یا خاندانی زندگی میں یہ تین چیزیں۔ سکون، مودت اور رحمت پائی جاتی ہیں۔ کیا تمہاری منزلی زندگی کی یہ شان ہے کہ جب تم گھر کی چہار دیواری میں قدم رکھو تو راحت وچین تمہیں گھیرے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے اور ہرگز ایسا نہیں ہے میں جانتا ہوں کہ تم اپنے گھروں سے نکلتے وقت ایک بیقرار ہستی، ایک مضطر دل، ایک بے چین، اور بے جان انسانی ڈھانچہ چھوڑ کر جاتے ہو تو پھر تم کیوں کر امید رکھ سکتے ہو کہ گھر کی چار دیواری میں قدم رکھتے ہی سکون ومسرت ورحمت تمہارا خیر مقدم کرے گی۔

قرآن کی عدالت میں، بنی نوع کی عدالت میں، انسانیت کی عدالت میں ان تمام بے قراریوں، بے چینیوں اور بالفاظ صحیح برکتوں اور سعادتوں کے چھن جانے کا سبب شوہروں کا بیویوں پر ظلم ہے، یہ چیز بلاشبہ عام تھی لیکن بعثت نبوی سے قبل مگر قرآن نے آکے تبلایا کہ شوہر اور بیوی میں باعتبار حقوق کوئی فرق نہیں ہے۔ معصیت ہے اگر بیوی شوہر کا حق ادا نہ کرے۔

اور ظلم ومعصیت ہے اگر شوہر بیوی کے حقوق ادا کرنے میں غفلت وبے پرواہی اور بے نیازی برتنے، غور کیا، اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ کے ٹھہرائے ہوئے حدود سے تجاوز کے جرم کا ارتکاب ہوگا۔ اگر اپنے گھروں کی چار دیواری میں بیوی بنا کر تم نے جس کو بند کر رکھا ہے اس کے ان حقوق کا پاس ولحاظ کرو جو

قرآن نے اسے بخشے ہیں۔

افسوس کہ مسلمانوں کی معیشت اور ان کی گھریلو زندگی کا بالکل یہی حال ہے سبب یہ ہے کہ منزلی زندگی کا سانچہ ہی بگڑ گیا ہے اور جب اخلاق و عادات کا سانچہ کسی فرد و جماعت کا ٹیڑھا ہو جاتا ہے تو اس سے غلط شکلیں بنتی ہیں سب ٹیڑھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ آج مسلمان کیا باعتبار فرد اور کیا باعتبار جماعت اس درجہ پست و ذلیل حالت میں اسی لئے ہے کہ وہ کتاب و سنت سے دور جا پڑا ہے جھوٹی فخاری اور ڈینگ میں مبتلا، اوہام پرستیوں اور اپنی گھڑی ہوئی جماعت بندیوں میں مقید اوہام پرستیوں اور اپنی گھڑی ہوئی جماعت بندیوں میں گرفتار ہے نیز اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا سانچہ ٹیڑھا ہو چکا ہے۔ ناصح کی نصیحت، درد مندوں کے مشوروں کے لئے صلاحیت قبول سے بھی عاجز و شہید سنت ہو چکا ہے۔ بیوی کے حقوق ادا کرو ورنہ نماز و روزہ بے کار ہے۔ سن لو۔ اگر تم بیوی کا حق ادا نہیں کرتے تو تمہاری خیر و برکت بھی ہرگز قبول نہیں۔ پہلے ان کا حق ادا کرو پھر دین کے دوسرے فرائض کو پورا کرو۔ تمہاری غذا اور تمہارے لباس میں یکسانیت ہونی چاہئے اگر ایسا نہیں کر سکتے تو قرآن کی بولی میں تم شدید معصیت کے مرتکب ہوتے ہو۔ یا تو انھیں ٹھیک طور پر بیوی بنا کر رکھو یا طلاق دے کر ان کا راستہ کھول دو۔ سرحوھن سراحا جمیلا۔ ایسا مت کرو کہ بیچ میں روک لو۔ ولا تضاروھن ان کو مضرت نہ پہنچاؤ نیز اشد شدید معصیت و ظلم ہوگا کہ انھیں ادھر میں لٹکائے رکھو، نہ ان کی خبرگیری کرو نہ ان کو اجازت دو طلاق دو کہ اپنے سود و صلاح کا اور کوئی انتظام کریں کالمعلقہ قرآنی الفاظ ہیں یعنی ان کو اٹکائے رکھنا نہ خود پوچھنا نہ انکو آزاد کرنا حالانکہ جب کبھی اور جہاں کہیں ایسا ہو بیوی کو حق ہے کہ وہ تفریق کا مطالبہ کرے شریعت نے ہرگز اس حق سے انھیں محروم نہیں کیا۔ اگرچہ ظالم شوہروں نے اس حق دالنہات

کا دروازہ ان پر بند رکھا ہے۔ بیویاں تمہارے نزدیک تو لونڈیاں ہیں۔ ہاں نزول قرآن سے پہلے لونڈیاں ہی تھیں۔ لونڈیاں ہی نہیں جائداد منقولہ مگر قرآن ہی تھا جس نے اس انسانیت سوز ظلم کا استیصال کیا اور دونوں کو برابر کا درجہ دیا ہے۔

تم نے تو سمجھ لیا ہے کہ مرد کے لئے جائز ہے کہ وہ عیاشیاں کرے اور گھر کی ملکہ مالکہ پر ظلم کرے مگر صبر وضبط تاکہ نتیجہ یہ ہوا کہ تمہاری بد اعمالیوں اور بدسلوکیوں سے تنگ آکر انھوں نے آغوش دین سے نکلنا اور مرتد اور عیسائی ہونا شروع کر دیا۔ غور کرو تمہارے ظلم وشرارت نے دین کو کتنا زبردست صدمہ اور کتنا ناقابل تلافی نقصان پہنچایا، کیا کبھی سوچا؟ مگر اس سوچنے کی زحمت نفس پرستی دیتی ہی کب ہے، کبھی سوچا کہ تمہاری ان گمراہیوں نے اب تک کتنی عفت وعصمت کی دیویوں کو تمہارے ظلم وجور کے خلاف احتجاج کے باعث آغوش دین سے چھین کر آغوش کفر وعسائیت میں دے دیا ہے۔ جو اسی موقعہ کی تاک میں ہر جگہ جال پھیلائے بیٹھا ہے پس ان معصوم ومظلوم بندگان الٰہی کی حمایت اور تمہارے ظلم وستم کی پاداش میں تم پر جتنے بھی گوناگوں عذاب الٰہی نازل ہوں اور جتنی بھی ذلتوں اور نکبتوں کا تمہیں شکار ہونا پڑے کم ہے۔

پنجاب و دہلی کے تازہ واقعات ارتداد کا حوالہ دیتے ہوئے۔ مجھے غصہ آتا ہے ان وحشی وظالم شوہروں پر جو ان غیور، غریب اور بے زبان وشریف بیویوں کو اس درجہ مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ غیر اخلاقی وغیر اسلامی افعال پر اتر آئیں شرم وحیا ناموس کو طاق پر رکھیں اور ظالم شوہروں سے مخلصی ونجات پانے کے لئے ارتداد جیسے گناہ عظیم کا ارتکاب کریں اور تمہاری بد اعمالیوں کی طویل فہرست میں تمہارے ایک ایسے ناقابلِ عفو اور فوری گرفت کے ظلم وبربریت کا اضافہ ہو۔

ظالمو! کیا آسمان سے تمہیں کو دل دیا گیا ہے اور آنکھ کہ قدم قدم پر رکھتے پھریں

اور وہ دل اور خواہشات نفس سے محروم خلق ہوتی ہیں۔ اگر ایسا سمجھتے ہو تو سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ کیا تمہاری آنکھوں سے بصارت بھی جاتی رہی۔ اگر دل کی بصارت سے محروم ہو چکے ہو۔ بد نصیبو! تمہاری موجودہ ذلت، حرماں ناکامی و نامرادی تمہارے کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔ تمہاری ہی بے دردی اور ظلم کا خمیازہ ہے جو تم دن رات یار و اغیار کے ساتھ کرتے رہتے ہو کہ نہ تمہاری زبان سے آج اپنے محفوظ ہیں نہ ہاتھ سے بیگانے مصئوں اور حیرانی اس بات پر ہے، ماتم اس کا ہے کہ سب کچھ کرنے کے باوجود اس درجہ نادان بن جاتے ہو گویا کچھ کیا ہی نہیں۔ آہ کہ اس احساس معصیت وتمیز وجرائم کی قوت ہی سلب ہو گئی ہے پھر شکوہ یہ ہے کہ اللہ نے خیر و برکت ہی اٹھا لی ہے اور اپنے انعام و برکات سے محروم کر دیا ہے۔ نعمت کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ حالانکہ اللہ فرماتا ہے۔ وما انا بظلام للعبید اللہ اپنے بندوں کے لئے ظالم نہیں ہے۔ نیز دوسری جگہ امساک انعام کا صاف صاف سبب فرما دیا ہے بما کسبت ایدی الناس یہ عذاب تو تمہاری بد اعمالیوں کی پاداش میں ہے کاش قرآن میں تدبر کرنے کی توفیق نہیں ہوتی جو تمہارے فلاح و صلاح اور بہبود و بہبود کا ضامن اور دستور العمل تھا۔

چنانچہ دہلی کے ایک مسلمان وکیل نے یہ طریقہ یعنی ارتداد تقریباً پندرہ سال ہوتے ہیں کہ ایجاد کیا اور یہ حیلہ و نسخہ تراشا کہ ایسی خواتین کے لئے یہ ایک مؤثر و تیر بہدف علاج ہے مگر افسوس اس کے نتائج و عواقب پر نہ غور کیا نہ ان نتائج کی اصلاح کی کوئی تجویز سوچی اور نہ سبب و علت پر کسی کی نظر گئی کہ اگر علت دور ہو جائے تو علاج خود بخود ہو گیا اور مریض نے ٹھوکر تو کھائی مگر سنبھالا دے کر تندرست ہو گیا۔

اس معاملہ اہم میں علمائے ملت کی مجرمانہ غفلت بھی کچھ رنج و ملال کا سبب

نہیں۔ عوام تو عوام کالانعام ہی ٹھہرے ان کو بھی میں نے کتنی مرتبہ توجہ دلائی چونکا یا مگر ایک دو انگڑائیوں کے بعد یہ پھر جیوں کے تیوں سو گئے، بعض جگہ اگر کچھ اصلاح کار کی طرف قدم اٹھایا بھی گیا تو غیر موثر و ناکام طریق پر نتیجہ جو ہونا چاہئے ہو رہا ہے۔

بدبختو! کیا آرام کی زندگی اپنی ان بداعمالیوں کے ساتھ بسر کر رہے ہو۔ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ گھر جس کو جنت کا ایک ٹکڑا کہا گیا ہے کیا وہ تمہارا گھر ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ ایسا گھر تو وہ ہے جس میں سکون ہو پراگندگی نہ ہو۔ مودت ہو۔ انتشار و استکراہ نہ ہو، رحمت ہو، کلفت و زحمت نہ ہو، اور یہ چیز وہیں ملے گی جہاں لوگ ایک دوسرے کے حق کا پاس کرتے ہوں گے۔ جہاں دوسرے کے حق کا ضیاع و اتلاف ہو گا۔ وہاں خیر و برکت کی محرومی اور ذلت و نامرادی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے خاندانی زندگی جہاں اور جس گھر کی خرابی ہو گی نہ اولاد کی تربیت ہو گی نہ امن ہو گا، نہ سکون ہو گا۔ نہ مودت ہو گی نہ خیر و برکت بہرحال اسلامی زندگی کا جہاں تک تعلق ہے وہ زندگی نہ ہو گی بلکہ ایک لعنت ہو گی مستقل لعنت، دوامی لعنت،

یاد رکھو! کہ تمہاری بہتری کبھی جبھی ممکن ہے جب تمہاری عورتیں تم سے خوش ہوں اور بہتر، چنانچہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ خیرکم خیرکم لاہلہ و خیارکم خیارکم لنسائکم تم میں اچھا وہی ہے جو اپنے اہل و عورت کی نظر میں بھی اچھا ہے اور اسے تم سے کوئی شکایت نہیں۔

وقت ہو اور تمہاری نظر میں وہاں تک پہنچ سکیں تو خود نظر کرو صاف معلوم ہو گا کہ طاقت بشری کا جہاں تک تعلق ہے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسوۂ پاک میں یہ سب کچھ دکھا دیا ہے اور اس عہد سعادت یا مابعد کے سال و زمانہ میں جو ایک طرف سچی آزادی کا زمانہ اور دوسری طرف تکمیل شرافت و شریعت کا

کا نہ مانہ تھا۔ کہیں بھی اس حیوانیت وظلم کا نام و نشان نہ تھا۔

مگر تم نے بدبختو! تم نے ہی اغیار و کفار کی سفاکانہ عادات بھی سیکھیں نہ صرف سیکھیں بلکہ تمہاری سرشت و فطرت میں طبیعت ثانی بنکر داخل ہو گئیں اور تمہارے رگ وپے میں جاری و ساری اور تم، تم گھر بلو زندگی، پاک، وصاف اور سنہری زندگی، سکون، مودت اور رحمت کی زندگی اور اس کی برکات سے محروم ہو گئے۔ منصف و عادل حقیقی کا دست انتظام اٹھا اور تم سے تمام برکات اسلامیہ چھین لے گیا۔

بلاشبہ اسلام نے اجازت دی ہے کہ اگر حالات ایسے ہی آپڑیں کہ تمہیں دوسری بیویوں کی ضرورت ہو تو تم ایسا کر سکتے ہو، لیکن اس شرط و قید کے ساتھ کہ ہر بیوی کے ساتھ عدالت قائم رکھو۔ عدالت کا نام سن کر کانپو نہیں۔ عدالت ہی کی شرط پر تم کو اجازت عقد ثانی مل سکتی ہے کھانے پینے میں بھی انصاف و عدالت پہننے اوڑھنے میں بھی عدالت اور تعلقات زناشوی میں انصاف و عدالت، اگر ایسا نہیں کر سکتے تو پھر لازم نہیں ہے لازم نہیں فرض اور فرض بھی ایسا کہ بلا اس فرض کی تعمیل و تکمیل کے دیگر فرائض بھی کالعدم کہ پہلے طلاق دے کر ان کو حسن سلوک کے ساتھ رخصت کر دو۔ پھر عقد ثانی کرو۔ یاد رکھو کہ عقد ثانی کہہ رہا ہوں۔ خوب غور سے سن لو۔ کہ عقد ثانی کہہ رہا ہوں۔ عیاشی و حرام کاری کی اجازت نہیں دے رہا ہوں جس کی شریعت نے سخت ممانعت کی ہے بلکہ جس قدر سختی اس جبر کے روکنے میں ہوئی ہے کسی دوسرے مسئلہ شرعیہ میں نہیں ہوئی۔

پس تم کو لازم ہے کہ اپنی اولین فرصت میں اپنی زندگی کا جائزہ لو اور دیکھو کہ تمہاری منزل زندگی کا کیا حال ہے؟ آیا وہ قرآن کے احکام کے عین مطابق ہے یا وہ تباہ ہو رہی ہے۔ تم کو اگر اللہ احتساب کی توفیق دے تو تم میں سے جو شخص

چاہیے کہ وہ اپنی زندگیوں کا احتساب کرے آیا وہ سب کے حقوق ٹھیک ٹھیک ادا کر رہا ہے یا نہیں۔ پوری سچائی سے اس پر عامل ہے یا نہیں۔ خوب اچھی طرح سن لو۔ یہ حق حقوق اللہ میں سے نہیں ہے۔ اللہ کو اپنے حق کے بارے میں اختیار ہے باز پرس کرے یا بخش دے۔ یہ بندوں کے حقوق ہیں۔ اور اسے خدا کبھی نہ بخشے گا جب تک بندے نہ بخشیں لہذا ڈرو اس بات سے کہ بندوں خصوصاً اپنی بیوی کے حق کو ظالمانہ طریقے سے تلف کرو اور باز آؤ اس جسارت و شرارت سے کہ ان مظلوموں کو اتنا مجبور کرو کہ وہ ارتداد پر اتر آئیں اور تمہارے پنجۂ ظلم سے نجات پانے کی اس کے سوا اور کوئی راہ انہیں نظر نہ آئے۔

میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس منبر پر کھڑے ہو کر اس کی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے یقین دلاتا ہوں کہ منزلی زندگی کی خوبی ہی، تعمیر ملت اور مسلمانوں کی قومی و اجتماعی زندگی کے قصر رفیع کی خشت اولیں ہے۔ لہذا گھر کی زندگی میں ان برکتوں اور سعادتوں کو تلاش کرو جو تمہیں قرآن نے دی تھیں۔

یا ایہا الذین امنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ ولا تموتن الا وانتم مسلمون۔

ارکان اسلام کی بنیاد

ابھی تھوڑے دن کی بات ہے کہ میں نے تم کو یاد دلایا تھا کہ قرآن حکیم نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی جو پہچان قرار دی تھی وہ کون سا عمل ہے، نماز نو نماز اتنی اہم علامت ہے کہ وہ اسلام کی پہچان قرار پائی۔ جس جماعت میں پائی جائے وہ مسلمان جماعت ہے۔ جس میں نہ پائی جائے وہ مسلمان جماعت نہیں ہے اسی طرح شریعت کے جتنے اعمال وارکان ہیں اپنی اپنی جگہ فضیلت رکھتے ہیں۔ اور سچے مسلمان کی پہچان اور علامت کا کام دیتے ہیں۔ لیکن آج میں چاہتا ہوں کہ چند کلمے ایسے بھی بتاؤں جو نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج سب سے زیادہ اہم ہے بلکہ شریعت کے جتنے احکام و اوامر ہیں ان سب سے زیادہ اہم ہے۔ کیوں؟ اس لئے جڑ ہے۔ ارکان شریعت تو شاخیں ہیں، پھل ہیں، پتے ہیں مگر جڑ نہیں ہیں جڑ کیا ہے؟ یہ ہے جس پر میں اب توجہ دلاؤں گا، اگر یہ نہیں ہے تو عمل بے کار، عبث لا یعنی ہو جاتے ہیں اور میں دیکھتا ہوں کہ بدقسمتی سے ظاہر و معلوم ارکان اسلام پر کسی کا عامل ہو جانا ہی مفتیان دین کی بارگاہ سے اس کے مومن و متقی ہونے کی سند دلا دیا کرتا ہے۔ حالانکہ یہ وہ گمراہی ہے جس میں اکثر و بیشتر گم اور حقیقت سے دور ہو گئے ہیں۔

شریعت کے جتنے احکام و اعمال ہیں ان کے متعلق یاد رکھنا چاہیے کہ ان میں سے ہر ایک کے لئے مقاصد اور وسائل ہیں مقصد ہی فی نفسہ مطلوب ہوتا ہے جس کے بغیر نہ اعمال اعمال رہتے ہیں نہ ارکان ارکان، ہر عمل شریعت جو

شارع نے تجویز کیا اس کی غرض و غایت کیا تھی، اس میں کیا لم اور کیا راز تھا؟ یاد رکھو کہ ہر عمل کے ماتحت ایک مقصد تھا اور اہم مقصد، ایسا مقصد جو انسانیت کی روح اور تخلیق آدم کا سبب تھا، رشد و ہدایت کا سبب تھا، اور بعثت انبیا کا سبب اس مقصد کو جب ڈھونڈنا چاہا تو معلوم ہوا کہ تمہیں وہ چیز نہیں سکتی، جب تک کچھ اور کام نہ کرو۔ اور اسی کا نام ہے وسیلہ۔ اور یہ وسیلہ بھی اسی لیے ضروری ہوا کہ اس کے بغیر مقصد نہیں ملتا۔ مثلاً تمہارے پاس وقت کی حکومت کے چلتے ہوئے نوٹ ہونگے یہ نوٹ کیا ہے؟ دیکھنے میں تو یہ چھدام کا بھی کاغذ نہیں ہے۔ لیکن اس میں لکھا ہوتا ہے ایک ہزار روپیہ۔ یہ ایک ہزار روپیہ تم تسلیم کر لیتے ہو اور تسلیم اس لئے کر لیتے ہو کہ حکومت ضمانت دیتی ہے۔ اور چونکہ تم نے اور بازار نے حکومت کی ساکھ اور ضمانت کا اعتبار کر لیا ہے اور اس کا سکہ تمہارے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس لئے اس کی قیمت ایک ہزار ہوتے ہیں، تم کوئی چوں و چرا نہیں کرتے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں اور تم کو بھی یقین ہے کہ اگر حکومت ایک منٹ کے لئے کبھی اپنی ضمانت نوٹوں پر سے اٹھالے تو وہ کاغذ کا ایک ردّی پرزہ ہے، اور بس، مگر یہی پرزہ کاغذ تمہاری ایک ہزار روپیہ کی مالیت کی ضروریات کی مطلب براری کی دستاویز اور وسیلہ ہے تمہاری حاجت روائی کا نیز زندگی کی معیشت کے لئے تم کو جو بہت سی چیزیں چاہئیں ان کے لئے گویا کاغذ مقصد تو نہ تھا مگر مقصد کا وسیلہ ہو گیا۔ اور چونکہ مقصد کا وسیلہ ہو گیا۔ لہٰذا اسے لوہے کی الماریوں مستحکم ترین اور محفوظ ترین تہہ خانوں اور گھر کی کوٹھریوں میں عمیق ترین جگھوں میں پوشیدہ کر کے رکھتے ہو کیونکہ یہ کاغذ چھدام کا نہیں ایک ہزار کا ہے لہٰذا اس کے لئے اتنے اہتمام اور پوشیدہ ترین جگھوں کی تلاش و جستجو میں تم مصروف ہو۔

اب تم خود اندازہ کرو کہ کیا اعمال وشریعت کے مقاصد نہ ہوں گے اور وہ صرف عملوں پر ہی منحصر وموقوف رہے درآنحالیکہ ایک ردی کاغذ کا پرزہ اپنے اندر اہمیت ومقاصد رکھتا ہے۔ یاد رکھو کہ اعمال شریعت مقاصد میں داخل نہیں ہیں وسائل میں داخل ہیں اور مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ جب تک وسائل نہ ہوں۔ اللہ کے کلام نے بتایا ہے۔ صاحب وحی نے بتادیا ہے۔ صحابہ کی زندگیوں سے واضح ہے کاش تمہاری آنکھوں میں بصارت کے ساتھ دلوں کی آنکھ میں بھی روشنی ہوتی اللہ کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر عمل کا نتیجہ ومقصد کیا ہے۔ مثلاً وہ بتاتا ہے کہ نماز سے کیا ملتا ہے؟ جو فرض قرار دی گئی ہے۔

تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر یعنی اگر نماز اپنے شرائط کے ساتھ تم نے قائم کرلی تو وہ تم میں ایسی روح پیدا کر دے گی کہ فحشاء اور منکرات کی لعنتیں تم سے دور ہو جائیں گی۔ جاہلیت عرب کے شعراء وادباء کے اسناد کے حوالہ سے فرمایا کہ فحشا ہر قسم کی برائی کا نام ہے۔ نہ کہ مخصوص برائیوں کا نام، جیساکہ فلسفی دماغ کے اکثر مفسرین وواضعین فقہ وشارحین مسائل نے بیہودہ دفاتر لکھ ڈالے ہیں اسی طرح منکر، ،ہر قسم کی بری بات چھوٹی ہو خواہ بڑی، کم ہو خواہ زیادہ، عمل سے ہو خواہ ارادہ سے، نہ شرط ہے نہ خصوصیت کہ یہی منشاء قرآن وفرمودہ رسول ہے لہذا نماز پر جس جماعت نے عملدرآمد شروع کیا دیکھیں گے کہ اس میں نماز کی فضیلت پیدا ہوئی نہیں۔ ہاتھ کو دیکھیں گے۔ پاؤں کو دیکھیں گے زبان کو دیکھیں گے اور اگر بن پڑا تو دل کبھی چیر کر دیکھیں گے۔ نماز کے بعد تمہیں یہ دیکھنا ہوگا کہ پاؤں اب بھی برائیوں کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ زبان غیبت میں ہنوز مصروف ہے، ہاتھ اب بھی ظلم وعدوان کے لئے ویسا ہی اٹھتا ہے۔ بیوی کے لئے اچھا شوہر نہیں ہے۔ بیٹے کے لئے شفیق باپ نہیں ہے۔

بھائی کے لئے مہربان بھائی نہیں ہے۔ ہمسایہ کے لئے ہمدرد ہمسایہ نہیں ہے تو ہم اس جگہ سے اعلان کر سکتے ہیں کہ وہ نماز، نماز ہی نہیں ہے دھوکا ہے۔ فریب ہے۔ اگرچہ دلوں کا حال علام الغیوب بہتر جانتا ہے۔ پس وہ کاغذ جو سیلہ تھا ایک ہزار کا، وہ ایک ہزار کا وسیلہ نہ رہا بلکہ ردی کا غذ کا ایک پرزہ ہو کر رہ گیا

کتب علیکم الصیام .... لعلکم تتقون

کیا روزہ بھوک اور پیاس کا نام ہے؟ نہیں! تو پھر کیا شب کے آخری حصہ میں اچھی اچھی غذاؤں سے معدہ کو بھر لینے اور سارا دن خوشبودار ڈکار لیتے رہنے کا نام ہے اگر یہ بھی نہیں تو پھر تقویٰ کیا ہے۔

اللہ کے رسول کا فیصلہ موجود ہے فرمایا کتنے ہی روزہ دار ہیں جن کو ان کے روزوں سے بھوک اور پیاس جوع و العطش کے سوا کچھ نہیں ملتا، نہ ان کو کوئی روحانی برکت حاصل ہوگی نہ آخرت میں کوئی ثواب ملے گا۔ ورنہ اس روزے کے بے شمار فضائل ہیں۔ مگر حاصل کیسے ہوں، کبھی جب پھر کتنی سچائی کی کوئی چھین باقی ہوتی، صداقت اور خلوص کا رجاء الٰہی کا ارجاع خداوندی کا اگر کوئی جذبہ دل میں پنہاں ہوتا اور جب یہ صفات معدوم ہیں تو اعمال شرعی کا نتیجہ بھی معلوم افراد نہیں بلکہ جماعت اگر برکات و فیوض سے محروم ہے تو پھر شکایت کیوں معلوم ہوا کہ یا تو لوگ ارکان اسلام کو ترک کئے ہوئے ہیں یا کرتے ہیں تو رسم اور ریت کے طور پر، آج یہی حال مسلمانوں کا بھی ہے نماز پڑھتے ہیں کیوں پڑھتے ہیں۔ رسم ورواج ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ روزہ رکھتے ہیں۔ کیوں رکھتے ہیں ریت اور چلن ایسا ہی دیکھتے ہیں۔ پس جو چیز اہم تھی اور جس کے اثرات و ثمرات، فیوض و برکات منہم بالشان تھے جب وہ رسم ورواج ریت اور چلن کے دائرہ میں محدود ہو گیا تو پھر کیسی برکت کہاں کا انعام نحن نفتح یا لظوا صراط ہم تو ظاہر پر فتویٰ

دیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے قرآن کہتا ہے ویل للمطففین۔ بس معلوم ہو گیا کہ روزہ نماز، زکواۃ اور حج اعمال و ارکان اسلام وسائل ہیں۔ بلکہ لازمی وسائل مگر مقصد نہیں ہیں نیز یہ کہ ہر کاغذ ہزارہ کا نہیں ہے، وہی ہے جس میں حکومت کی مہر اور اس کی گارنٹی ہو، اور جس کو تم چھپا چھپا کر جیبوں میں رکھتے ہو، محفوظ کر کے تالوں میں رکھتے ہو، بھاری بھاری الماریوں میں رکھتے ہو، اور پھر بھی رکھو گے بس عام اس سے کہ معاملہ افراد کا ہو یا جماعت کا، مسلم جماعت و فرد وہی ہے جس کو قرآن ورسول کے مفہوم میں سند حاصل ہو۔ اور اسلامی اعمال و ارکان جو کچھ مقاصد رکھتے ہیں اپنے عملوں سے تم نے انھیں حاصل کر لیا ہو۔ مسجد کے باہر نکلتے ہی کسی مسلمان کی تم نے غیبت کی تو نماز فعل عبث، بیوی کے ساتھ بدسلوکی کی تو وہ چیز نہ رہی۔ جس کو اللہ نے۔

الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر کہا ہے۔ کچھ اور چیز ہو تو ہو۔

چراغ کی مثال دیتے ہوئے حضرت امام نے فرمایا کہ نماز اگر تم کو برائیوں سے نہیں روکتی تو سمجھ لو کہ نماز نے تمہارے دل کی زمین میں صلاحیت ہی نہیں پائی کہ اس میں روشنی پیدا کرتی اور دل کی زمین میں صلاحیت اس لئے نہیں کہ تمہاری منزلی زندگی برباد ہے۔ تم میں جتھہ بندی، اونچ نیچ، چھوت چھات جھوٹی فخاری اور اسی قسم و قبیل کے ہزاروں عیوب اور دل کی بیماریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ بس یہی وجہ ہے کہ تمہارا ہر عمل، حقیقت سے خالی، اخلاص سے دور اور بلحاظ نتائج و مقاصد فعل عبث ہو کر رہ جاتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کو ایک گورنر کی تلاش ہوئی۔ کسی شخص نے ایک آدمی کا نام پیش کر کے کہا کہ اس سے بہتر آدمی گورنری کے لئے نہیں مل سکتا۔ آپ نے دریافت کیا۔ کیسے؟ جواب دیا میں نے اس کو ہمیشہ نماز روزہ میں سرگرم پایا ہے

آپ نے دریافت کیا۔ کیا کبھی سفر میں تمہارا اس کا ساتھ ہوا ہے۔ جواب دیا نہیں
دریافت کیا لین دین میں؟ جواب تھا نہیں؟ اچھا پھر سلوک کے بارے میں کیا کہتے
ہو جو لوگوں کے ساتھ اس کا ہے۔ جواب ملا اس معاملہ میں کبھی کچھ نہیں کہہ سکتا
فرمایا۔ تو پھر کیسے کہتے ہو کہ گورنری کے لئے وہ بہتر ہے اور موزوں شخص ہے غور
کرو گے تو معلوم ہوگا کہ حضرت عمر کا یہ فیصلہ انسانی خوبیوں کی جانچ کے لئے
بہترین معیار ہے۔ آدمی کے اپنے اعمال و خصائل اور خصائص کی صحیح جانچ
انھیں تین حالتوں میں ہو سکتی ہے۔ سفر کے عالم میں وہ اپنے آپ کو
بہت کچھ لئے دیئے رہتا ہے پھر بھی اس کے خصائل ظاہر ہوئے بغیر نہیں
رہ سکتے۔ لین دین میں اس کے اعمال و نیت کی سچی جانچ پوشیدہ ہوتی ہے
باہم سلوک و رواداری اس کی طبعی خصائل کا مظاہرہ کئے بغیر نہیں رہ سکتی
صرف نماز پڑھنے سے کوئی شخص متقی، مومن نہیں ہو جاتا چہ جائیکہ، گورنری جیسی
ذمہ داری کی خدمت اس کو سپرد کر دی جائے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ ہی کا قول ہے
"غرتنی جلوسی فی المساجد" دھوکا کھا گیا میں مسجد میں بہت بیٹھنے سے اصل
دغایت دل کی نیکی اور نفس کی پاکی ہے۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ اس کا کیا حال ہے، اگر وہ
چیز پیدا نہ ہوئی تو یہ سارے اعمال فعل عبث سے زیادہ نہیں۔ لیکن اگر اعمال
شریعت کی بجا آوری سے تم میں دل کی نیکی، نفس کی پاکی اخلاق اور چال چلن
کی درستی پیدا ہو گئی ہے تو سمجھو کہ تمہاری نماز وہی نماز ہے جس کے قائم کرنے کا
قرآن میں حکم ہے یہ ساری چیزیں سانچے ہیں جن میں ڈھل کر تمہاری روح پاک
وصاف ہو گئی ہے اور تم خصائص اسلامی کے حامل و مالک ہو۔ کیسے ممکن ہے
کہ ایک شخص نماز پڑھے اور غیبت سے اس کی زبان آلودہ ہو۔

پس اب غور کرکے اس راز کو جو اگر چہ راز نہ تھا مگر قرآن سے اغراض،

حدیث سے انکار، صحابہ کی زندگیوں کے مطالعہ سے غفلت کی بدولت تمہارے لئے اب راز ہو گیا۔ خوب سمجھ لو کہ شریعت مطہرہ کے جتنے اعمال وارکان ہیں وہ کچھ خاص خوبی ہم میں پیدا کرنا چاہتے ہیں اور انھیں خوبیوں کے حصول و مجموعے سے تم صفات بشریت اور خصائص و اوصاف انسانیت سے متصف ہو کر اخلاق کا اعلیٰ نمونہ بن سکتے ہو اور وہ اپنے اندر وہ خاص شان و دلکشی رکھتے ہیں جو اغیار کو کھینچ کر اسلام کے قدموں میں لایا کرتی تھی تم اور حیف کہ تم نے جس دن سے اپنے اندر سے انسانیت و اخلاق کے یہ اوصاف خارج کئے سرمستیوں اور اوہام پرستیوں میں مبتلا ہوئے اس دن سے تم پر ذلت بلا، ابتلاء نگونساری اور غلامی و محکومی مسلط کر دی گئی کاش تم اب چونکتے، غفلت کی چادر منہ پر سے ہٹا کر دیکھتے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور تم کس حال میں محو خواب ہو؟

ایک اہم فریضہ دین

بیسویں صدی کی حیرت انگیز ایجادات میں ریڈیو بھی ہے جس کی مدد سے میں اپنی آواز اس بڑی جماعت کے ہر فرد کے کانوں تک پہنچا سکتا ہوں لیکن افسوس کہ ابھی تک کوئی آلہ ایجاد نہیں ہوا جس کی مدد سے آپ کے قلوب تک آواز پہنچا سکوں ۔

میری آواز گذشتہ ۱۵ برسوں سے اسی میدان میں ہر سال دو بار کم و بیش ایک لاکھ مسلمانوں کے پردۂ گوش سے ٹکرا کر رہ جاتی ہے لیکن تمہارے قلوب کے قفل کھولنے میں ناکام رہی ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا آلہ ایجاد ہوتا جس سے تمہارے وابستہ قلوب کے پٹ کھل جاتے اور میں ان حقائق کو تمہارے اعماق قلب میں اتار سکتا جو تمہاری بہبودی و فلاح کے ضامن ہیں جو لوگ رفتار زمانہ سے باخبر ہیں وہ جانتے ہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب کے پیرو اپنے اپنے مذاہب کی اصلاح و ترمیم کی طرف مائل ہیں ۔
اصلاح کا یہ سلسلہ گذشتہ تین سو سال سے قائم ہے ۔ عیسائیوں نے اس اصلاح کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ عیسوی مذہب کے احکام اقتضائے زمانہ و تغیر ماحول کا ساتھ نہ دے سکے یہی حال ہمارے ہندو بھائیوں کا ہے کہ وہ جب تک منوجی کے شاستر میں ترمیم و اصلاح نہ کریں وہ مقتضیات زمانہ سے مقابلہ کے اہل نہیں ہو سکتے اور ان کو ہر ہر قدم پر منوجی کے شاستر میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے ۔ شاید حقوق نسواں کے متعلق دیگر مذاہب کے پیرو اپنے اپنے مذاہب کے احکام کو توڑ مروڑ کر اس قابل بنا رہے ہیں کہ وہ مقتضیات زمانہ کے مطابق ہو سکیں ۔

لیکن میں علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ مسلمانوں کو مذہبی احکام میں اس طرح کی ترمیم و اصلاح کی یکسر ضرورت نہیں کیونکہ ان کی شریعت کے قوانین جامع و مکمل ہیں۔ اس میں نہ ترمیم کی گنجائش ہے نہ اصلاح کی۔ دوسری قوموں کو اگر زندہ رہنے کے لئے اپنے مذاہب میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہے تو مسلمانوں کو ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اپنی شریعت کو اور مضبوط پکڑیں اور قوانین اسلام کی شدت سے پیروی کریں۔ دوسری قوموں کی فلاح و بہبود اگر اپنے اپنے مذاہب سے دوری اختیار کرنے میں ہے تو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا راز اپنے مذہب سے گرویدگی و اتباع کامل میں مضمر ہے۔

لیکن مسلمان اپنے مذہب سے بُعد اختیار کر رہے ہیں اور جو شے ان کی ترقی بہبود و فلاح کی ضامن ہے اس سے روگردانی کر رہے ہیں۔ آپ خیال کرتے ہوں گے کہ مسلمان اپنی شفقت دینی اور گرویدگیٔ مذہب کے لئے مشہور ہیں۔ یہ صحیح ہے لیکن ان کا شغف صورت پرستی ہے اور ان کی گرویدگی صرف ہیئت ظاہری سے ہے وہ روح عمل وہ اسپرٹ جو ان احکام اور امر و نواہی کے پس پردہ کام کرتی ہے وہ ان پیروان احکام سے یکسر مفقود ہے۔

اس جماعت میں ایک کثیر تعداد ان لوگوں کی ہے جو نماز کی شدت سے پابند ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ ان کی نماز صرف ایک ہیئت، ایک صورت اور ایک ڈھانچہ سے زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتی۔ نماز کی وہ اسپرٹ وہ روح عمل ان میں موجود نہیں جس کے آثار نماز پڑھنے والوں میں پائے جائیں اور جس کی شناخت مطلق کا کلام ربانی ناطق ہے اگر وہ روح نماز ان نماز پڑھنے والوں میں ہوتی تو اس کے آثار بھی یقیناً ظاہر ہوتے۔

مسلمان فی الواقع احکام دین سے تلعب و استہزاء کر رہے ہیں۔ افسوس کہ تم کو عربی سے اتنا بُعد ہو گیا ہے کہ مجھے شبہ ہے کہ لفظ تلعب تمہاری سمجھ میں آیا کہ نہیں کیا

اس لفظ کے ترجمہ کی ضرورت ہوگی؟ تلعب کے معنی کھیل کرنے کے مسلمانوں نے
اس سے مذاق کر رکھا ہے اور اس کا ٹھٹھا اڑا رہے ہیں۔

میرا پہلے خیال تھا کہ مسلمانوں کی اصلاح حال میں سب سے بڑی روک علماء و مشائخ کا وجود ہے لیکن تجربہ سے میرا خیال باطل ثابت ہوا۔ علماء و مشائخ کا گروہ ہرگز کسی اصلاحی تحریک میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ سب سے بڑی رکاوٹ ان مسلمانوں کی طرف سے ہوتی ہے جو اپنی بہترین نفس پرستی کا مظاہرہ اس موقع پر کرتے ہیں۔ مسلمان زبانی دعوے تو بڑے لمبے چوڑے کرتے ہیں کہ ہم کو مذہب سے سروکار ہے۔ فرقہ پرستی و فرقہ بندی کی ذہنیت سے بالاتر ہیں۔ لیکن جب امتحان کا وقت آتا ہے تو ساری قلعی کھل جاتی ہے اور اس وقت پنجابی ٹولی اور میمن جماعت اور فرقہ بوہرہ وغیرہ متعدد ٹولیاں اپنے نام و نمود کی خاطر اپنی تمام قوت کے ساتھ اپنے اپنے فرقوں کی ہستی کو ثابت کرنے کے لئے نکل پڑتی ہے۔

زکوٰۃ کی تنظیم میں جو اصل رکاوٹ ہے وہ انہیں فرقہ پرستوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ کوئی میمن سیٹھ یا بوہرہ تاجر یا پنجابی دولت مند زکوٰۃ کو اس لئے کسی جماعتی نظام کے ماتحت نہیں کرنا چاہتا کہ اس سے اس کو نام و نمود حاصل کرنے کا موقع نہیں رہے گا۔ آج تو یہ حال ہے کہ ہر گلی کوچہ میں شور ہے کہ فلاں امیر الامراء نے زکوٰۃ میں اس قدر کثیر رقم نکالی۔ اور فلاں سیٹھ صاحب کے یہاں زکوٰۃ بٹ رہی ہے۔ کل جب یہ سارا فنڈ جماعتی نظام کے تحت ہو جائے گا تو اس کا تو موقع کہاں رہے گا۔ ضرورت ہے کہ زکوٰۃ ایک تنظیم کے ماتحت ہو جو واضح شریعت کا منشا ہے اور اگر مسلمان صرف اسی تنظیم زکوٰۃ سے عہدہ برآ ہو جائیں تو میں پوری ذمہ داری کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ پھر مسلمانوں کو کسی دوسری شے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ اقتصادی اونچ نیچ جس نے آج کل یورپ امریکہ کے ماہرین اقتصادیات و سیاسیات کو پریشان کر رکھا

ہے اور ان سے اس کا صحیح عمل نہیں ہوتا۔ اس کا مؤثر بے خطا حکمی اور نہایت سہل علاج تو اسلام کے اندر اسی زکوٰۃ کے حکم میں موجود ہے لیکن مسلمانوں نے فریضۂ زکوٰۃ کی ادائیگی میں جس کوتاہی عمل کا ثبوت دیا ہے وہ یقیناً احکام دین کے ساتھ تمسخر و استہزاء کا مرادف ہے۔

احکام شریعت پہ کامل ۳۵ سال تک میں نے پوری طرح غور و خوض کیا اور اس ۳۵ سال کے عرصہ میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جس کی کوئی صبح کوئی شام اس فکر سے خالی گزری ہو۔ اور میں اس نتیجہ پہ پہونچا ہوں کہ واضع شریعت کا منشا یہ ہے کہ اس کے احکام ایک جماعتی نظام کے ماتحت اجراء پائیں لیکن مسلمانوں نے اس جماعتی نظام کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔

دین اسلام کے دو عظیم الشان ستون نماز اور زکوٰۃ ہوئے۔ جن کے متعلق قرآن کریم میں بکثرت ساتھ ساتھ احکام نازل ہوئے۔ قرآن حکیم میں بکثرت اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ایک ہی جگہ نظر آئیں گے۔ ان دونوں عظیم الشان حکموں کا اجراء ایک جماعتی نظام کے ماتحت ہونا ضروری ہے۔

فریضۂ نماز کی ادائیگی میں (گو وہ صرف صورت ہی سہی یہ جماعتی نظام تو خیر ایک حد تک نظر بھی آتا ہے۔ سینکڑوں مسجدیں نمازیوں سے آباد ہیں جہاں نماز باجماعت ادا ہوتی ہے۔ اور عیدین کے موقع پہ یہ اجتماع اور زیادہ نظر آتا ہے لیکن عظیم الشان فریضۂ زکوٰۃ سے مسلمان فی الواقع علیحدہ ہیں۔

کاش مجھ میں ایسی قوت ہوتی یا وہ شے موجود ہوتی جس کی مدد سے میں تمہارے مقفل قلوب کے پٹ کھول سکتا تاکہ میری آواز تمہارے کانوں میں نہیں بلکہ دل میں سما سکتی۔ اور تم اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ سکتے۔"

خطبہ عید اضحیٰ

انجمن تبلیغ الاسلام کلکتہ یقیناً شکریہ کی مستحق ہیں کہ اس کی مساعی مفید سے مفید تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس میدان میں پہلے میری آواز ایک محدود حلقہ تک پہنچی تھی پچھلے چند سالوں سے انجمن کی مساعی اور سائنس کی ایک مفید ایجاد کی امداد سے پورے میدان پہنچنے لگی۔ لیکن اس مرتبہ جیسا کہ مجھے یقین دلایا گیا ہے۔ میری آواز ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچ رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ مجھے اس بات کا بھی یقین دلایا گیا ہے کہ ہمالیہ کی چوٹی، سمندر کی موج اور ریگستان عرب کے بگولے بھی میری آواز کو روک نہیں رہے اور میری آواز مشرق و مغرب کے محلوں اور وادیوں سے ٹکرا رہی ہے ہونے کو تو یہ سب کچھ ہے اور جو کچھ ہے سزاوار تحسین و تعریف، بمبئی کلکتہ سے بارہ سو میل کے فاصلہ پر ہے، پشاور کلکتہ سے پندرہ سو میل دور ہے وہاں بھی میری آواز پہنچ رہی ہے۔ لیکن میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تمہارے کانوں سے تمہارے دلوں کی دنیا کتنی دور ہے۔ جہاں میری آواز نہیں پہنچتی ؟ تمہارے کانوں کے پردوں سے ٹکرا کر رہ جاتی ہے اور دل کوئی اثر، کوئی سبق، اور کوئی عزت قبول نہیں کرتا، تمہارے دلوں کی اس بے اثری اور عدم صلاحیت اس دنیا کی ویرانی کا یہ عالم کیوں اس دروازے پر غفلت کے بھاری قفل کس لئے اقرار و انکار کا سبب کیا ہے ؟ ایں ورق کہ سیاہ گشتہ مدعا ایں جاست، میرے مخاطب تو تمہارے دل تھے، تمہارے کان نہیں، وہ صرف ذریعہ تھا دلوں تک بات

پہنچانے کا مگر میں جانتا ہوں کہ اعراض مسلسل اور افکار بیہم نے اب اس قابل ہی نہ رکھا کہ تمہارے دلوں کو مخاطب کیا جائے۔ اس لئے میں دل کا نام نہیں لیتا اور تمہارے کانوں سے خطاب کرتا ہوں۔"

۱۹۰۶ء میں والد مرحوم کی موجودگی میں سب سے پہلے اسی مقام سے اسی ممبر پہ کھڑے ہو کر میری ایک ہی آواز جو حقیقت کی آواز ہے بلند ہوتی آئی ہے اور آج ۱۹۳۶ء میں جبکہ پورے ۳۰ برس کا قرن گزر چکا ہے باستثناء درمیان کے چند سالوں کے جبکہ وقت کے اہم اور ملک کے نازک صورت حال نے مجھے کلکتہ سے جبراً دور و معذور رکھا، میں اسی حقیقت کا اعادہ کرتا ہوں، اور تمہیں توجہ دلاتا رہا ہوں۔ لیکن تم نے اب تک میری ایک بات نہ سنی یہی وجہ ہے کہ آج میں تمہارے بے حس دل کو نہیں تمہارے کانوں تک اپنی آواز وہی حقیقت کی آواز پہنچاتا ہوں کیونکہ تم نے اپنے دلوں پہ غفلتوں کے اتنے پردے ڈال لئے ہیں۔ امتیاز و عرفان کے اس مرکز پہ اتنے قفل چڑھا لئے ہیں کہ اس دل کو وہی دل جسے آج تم عید کے پر تکلف کپڑوں میں چھپائے بیٹھے ہو مخاطب نہیں کر سکتا۔

جانتا ہوں کہ تم نے ہمیشہ میری بات ٹھکرائی ہے۔ صبح شباب کی بات نہ سنی اگرچہ حقیقت تھی۔ اچھا! جوانی کی دوپہر کی بات پہ کان نہ لگایا جو سراسر صداقت تھی، اچھا! تو کیا اب شام زندگی کی بات بھی نہ مانو گے، نہ مانو۔ نہ سنو۔ تم میری بات سے انکار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ میری بات سے انکار حقیقت سے انکار ہے۔ اور تم حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔ تم نے میری بات سے انکار کر کے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ حقیقت سے انکار کر کے کوئی شخص فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ میں جو کہتا ہوں سراسر حقیقت ہے۔ تم نے میری بات سے انکار کر کے اپنی اجتماعی عزت کو صدمہ پہنچایا۔ حقیقت سے انکار کر کے کوئی شخص عزت حاصل نہیں کر سکتا

سن رکھو کہ حقیقت میرے ساتھ ہے، حقیقت میری آواز ہے وہ کسی طرح ٹھکرائی جا نہیں سکتی۔

جس حقیقت کو ایک مدت سے میں تمہارے سامنے رکھتا آیا ہوں، آج پھر اسی حقیقت کو تمہارے کانوں تک پہنچاتا ہوں۔ دل کا نام میں اس لئے نہیں لیتا کہ اس سے کام لینے کی تمہیں ضد ہے۔ جو منزل انوار تھا۔ اب وہ نفس پرستیوں اور نفسانی اغراض کا تمہارا دفینہ ہے۔ لیکن کیا اتنے بڑے انسانی ہجوم میں پانچ دل بھی ایسے نہیں جن میں کچھ صلاحیت باقی ہو اور وہ اس حقیقت کو قبول کر سکیں۔ میں پورے تیس برس کے غور و فکر کے بعد کہ اس طویل زمانے کا کوئی سورج اس کی کوئی شام ایسی نہیں گزری کہ میرے غور و فکر سے خالی گئی ہو۔ اور میں نے پوری توجہ اور چھان بین اور دل سوزی کے ساتھ غور و فکر نہ کیا ہو۔ اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کی اجتماعی صلاح و فلاح بجز اس کے کسی دوسری معاملت پر موقوف نہیں ہے۔ جو قرآن کے ہر صفحے پر لکھا ہوا تم دیکھو گے، یعنی

اقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ

اور یہی دو مسائل ایسے مسئلے ہیں کہ جن کو تم نے سب سے زیادہ غفلت کے حوالے کر دیا ہے۔ قرآن حکیم نے اس مسئلہ پر سب سے زیادہ تاکید کی مگر آج دونوں مسائل کو تم نے سب سے زیادہ پس پشت ڈال دیا ہے۔ سب سے زیادہ غفلت، وہ غفلت جو انکار تو نہیں لیکن قریب انکار ضرور ہے، اسی غفلت کی نذر کر دیا ہے۔ حالانکہ کفر و اسلام کے امتیاز کے سلسلہ میں بھی اسی نماز و زکوٰۃ کو معیار قرار دیا گیا۔ چنانچہ فرمایا۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ

فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ

اگر وہ اپنی پہلی بداعمالیوں سے باز آجائیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ کی پابندی کا اقرار کریں تو وہ بھی تمہاری برادری میں شامل کئے جا سکتے ہیں معلوم ہوا کہ شرط اسلام، انحصار و مدار اسلام، نیک عملی کے ساتھ ساتھ مشروط ہے قیام صلوٰۃ و ادائے زکوٰۃ پر غور کرو گے تو سمجھو گے کہ اسلامی اعمال و احکام قطعاً اجتماعیت کے حامل ہیں۔

اسلام اپنے حلقہ بگوش افراد سے خود انہی کے مفاد کے لئے مطالبہ کرتا ہے کہ اس کا ہر عمل اجتماعی ہو، اسی لئے فرض قرار دیا گیا ہے کہ نماز ہر مسلمان بہ استثنائے حالت مجبوری جماعت کے ساتھ ادا کرے۔ اگر مشاغل معاش و ذرائع روزی مخل ہوں تو لازم ہے کہ کم سے کم ایک وقت کی نماز ہر روز جماعت سے ادا کرے۔

اسی طرح زکوٰۃ کے بارے میں بھی حکم ہے۔ مسلمان کی زکوٰۃ بھی اجتماعی صورت سے حاصل و تقسیم کی جائے۔ کچھ پرواہ نہیں اگر پورے شہر کی تنظیم نہیں اور آج میں اس غلط فہمی کی بھی تردید کردوں جو بعض حلقوں میں ظاہر کی جارہی ہے کہ اس کے لئے امارت کی شرط ہے۔ امارت کی قطعاً کوئی شرط نہیں۔ الا یہ کہ وہ ایک اولیٰ صورت ہے۔ لیکن اگر امارت، حالات کے تقاضہ یا ماحول کے امر سے بعید الامکان یا ناممکن ہے تو اس چیز کو جائز یا ناجائز بہانہ بنا کر اللہ کے ایک واضح، صریح اور تاکیدی حکم و اسلام کے ایک اہم فریضہ و دین کے ایک رکن میں لیت و لعل، حیل و حجت، یقیناً قابل مواخذہ لائق سخت وعید، جو لوگ فرداً فرداً زکوٰۃ اپنے طور پر ادا کرتے ہیں میں پہلے بتا چکا ہوں کہ درست نہیں ہے آج ایک قدم اور آگے بڑھتا ہوں اور اس ممبر پر سے پوری ذمہ داری کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ صرف یہی نہیں کہ ایسی زکوٰۃ جو انفرادی طور پر ادا کی

گئی ہے درست نہیں ہے بلکہ صحیح اور واضح یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ ہی نہیں ہے۔ ایسی رقم کو کوئی دوسرا نام دیا جا سکتا ہے جو چاہو رکھ لو مگر زکوٰۃ نام نہیں دیا جا سکتا۔

بس جب تم بحیثیت مسلمان اجتماعی طور یا قرآن کے کسی حکم اور منشائے فطرت کے ماتحت اپنے اعمال خصوصاً نماز و زکوٰۃ کو تنظیم کے ساتھ ادا نہیں کر سکتے تم سے وہ تمام دینی برکات اور وعدے جن کی تم کو تلاش ہے ہمیشہ تم سے دور رہیں گے اور جس دن تم نے اجتماعی شکل اور اعمال میں اجتماعی حسنِ نظام پیدا کر لیا یقین کرو کہ چھینی ہوئی تمام دولت تم کو سونپ دی جائے گی۔

میں تم کو آج پھر تاکید کرتا ہوں کہ اپنے اعمال میں اجتماعیت کی صورت پیدا کرو اٹھو، اور ہر قصبہ اور ہر محلہ میں کم سے کم پانچ آدمیوں کی ایک کمیٹی بنا لو۔ چھ بھی نہیں صرف پانچ، جو زکوٰۃ کی تحصیل و تنظیم کرے، اور اسے پوری ذمہ داری اور ... باقاعدگی کے ساتھ صرف کرے۔ تم دیکھو گے کہ بہت جلد پورا محلہ بلکہ پورا شہر تمہاری کمیٹی کا ممبر بن جائے گا اور یہ ایک نمونہ ہوگا جس کی تقلید کر کے خیر و برکت کے متلاشی اپنی سعادتوں اور گم شدہ متاع دولت و رحمت ڈھونڈیں گے۔ کیا تم میں ایسے پانچ دل بھی نہیں جو میری بات بگوشِ دل سن سکیں۔

یاد رکھو، محض فکری وسائل سے تم اپنے کھوئے ہوئے وقار اور دولت کو حاصل نہیں کر سکتے، بنیادی چیز جس کو تم نے اپنی غفلتوں اور گمراہیوں کی نذر کر دیا ہے یعنی عمل اور عمل اجتماعی، جب تک اس پر استوار اور مضبوطی کے ساتھ قائم نہیں ہوتے تم کو اس وقت تک کھویا ہوا وقار اور چھینی ہوئی دولت واپس نہیں مل سکتی، فکری وسائل کو محض دماغ کے اندرونی حصہ کا رنگ و روغن سمجھو یہ باہر کا رنگ و روغن نہیں ہے۔ باہر کی دیواریں جب ہی رنگین ہوں گی جب عمل کا رنگ و روغن ابھر آئے۔ اور عمل میں جب ہی رنگ و روغن پیدا ہوگا۔ جب

جڑ اور بنیاد مضبوط رکھو گے، تم کسی درخت کو ہرا بھرا اور سبز و شاداب رکھنے کے لئے شاخوں اور پتوں پہ پانی ڈالو گے تو درخت ہرگز سرسبز نہ ہوگا البتہ اگر تم جڑ میں پانی دو گے تو تمام درخت سبز و شاداب رہے گا لہٰذا اگر تم اپنے وقار اور چھنی ہوئی دولت کی واپسی کے کھوج میں ہو۔ اگر تم موجودہ پستی سے دوبارہ بامِ رفعت پہ پہنچنا چاہتے ہو تو جڑ بنیاد اور اصل کی شادابی کی فکر کرو، یعنی اپنی نمازوں پہ استوار ہو جاؤ۔ اور اجتماعی شکل میں زکوٰۃ کی تنظیم و تقسیم پہ عامل، کہ یہی دونوں عمل اصل اور بنیاد ہیں، اور انہی پہ قائم و عامل ہونے پہ کھوئی ہوئی دولت کی واپسی کا مدار و انحصار ہے۔

هذا، وان احسن الكلام كلام الله الملك العلام

فبشر عباد الذين يستمعون القول فيتبعون

احسنه واولئك هم المفلحون ٥

خطبۂ جمعہ

برادرانِ عزیز! میں کتنے جمعوں سے کوشش کر رہا ہوں کہ ایک حقیقت تمہارے دلوں میں اتار دوں۔ معلوم نہیں تمہارے دل و دماغ کا کیا حال ہے؟ تم نے اسلام کے دو فریضوں کو جو سب سے زیادہ اہم تھے سب سے زیادہ غفلت کے حوالے کر دیا ہے اور یہی تمہارے جسمِ ملّت کا اصل رنگ ہے یہ دو فریضے کون سے ہیں؟ یقیناً تم سات دلوں کے اندر بھول نہیں گئے ہوگے قیامِ صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ۔

تمہاری زندگی کے دو عملی پہلو ہیں۔ ایک وہ جو تمہاری اکیلی زندگی کا ہوتا ہے ایک وہ جو دوسروں کے ساتھ مل جل کر پیدا کر لیتے ہو پہلے کو انفرادی کہتے ہیں۔ دوسرے کو جماعتی زندگی کے یہ دونوں پہلو اس طرح کے واقع ہیں کہ ان میں جب تک کوئی خاص امتیازی رنگ پیدا نہ ہو، وہ کوئی ممتاز اور مستقل ہستی پیدا نہیں کر سکتے، یہ رنگ کس چیز سے بنتا ہے؟ عمل سے اور صرف عمل سے کیونکہ محض فکر حالت کا امتیاز یہاں کام نہیں دے سکتا۔ فکر جب فکر ہے اسے محض دماغ کا اندرونی رنگ و روغن سمجھو باہر کا رنگ و روغن نہیں ہے دیواریں جب ہی رنگین ہوں گی کہ عمل کا رنگ و روغن ابھر آئے۔ کچھ خاص طرح کے اعمال ہونے

چاہئیں۔ جن سے ایک فرد کی انفرادی زندگی، دوسری زندگیوں سے ممتاز ہو جائے دنیا میں جتنی جماعتیں اپنی اجتماعی زندگی کا استقلال رکھتی ہیں۔ تم غور کرو گے تو ان کا کوئی نہ کوئی عملی رنگ ضرور ملے گا۔ ایسا رنگ جو عام رنگوں میں انہیں صاف صاف نمایاں کر رہا ہے۔ تم دیکھتے ہی بول اٹھتے ہو یہ تو فلاں جماعت ہے یہ تو فلاں جماعت کا فرد ہے۔

اعمال کے اس امتیاز کو ٹھیک رنگوں کا سا امتیاز سمجھو، تم سمجھتے ہو یہ تو لال رنگ ہے، یہ ہرا رنگ ہے، یہ پیلا رنگ ہے اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تمہاری نگاہیں اس تشخیص دیکھنے میں امتیاز نہ کر پائیں۔ اسی طرح جماعتی اعمال کے بھی خاص خاص رنگ بن جاتے ہیں ہر رنگ دوسرے رنگ سے اپنا الگ روپ رکھتا ہے۔ تم ایک جماعت کو دیکھتے ہو اور فوراً اس کی عملی خصوصیات کا رنگ دیکھ کر پہچان لیتے ہو کہ یہ تو لال رنگ والی جماعت ہے۔ یہ ہرے رنگ والی جماعت ہے اعمال کے یہی مختلف رنگ ہیں جن سے مختلف جماعتیں بنتی ہیں۔ انہی رنگوں سے انہیں نشوونما ملتی ہے۔ انہی سے انسانی مستقل ہستی قائم رہتی ہے انہی کی پختگی سے ان کی پختگی ہوتی ہے اور پھر یہی رنگ ہیں کہ اگر دھیمے اور مدھم پڑ گئے تو جماعت کی جماعتی ہستی بھی کمزور پڑ گئی۔ اگر نابود ہو گئے تو جماعت بھی فنا ہو گئی۔

یہ دیکھو! ایک صاحب میرے سامنے لال رنگ کی شال اوڑھے بیٹھے ہیں۔ شالیں یہاں اور لوگوں کے کاندھوں پر بھی ہیں اور میری نگاہیں انہیں گن سکتی ہیں یا تم بھی گن لو! اس پہلی ہی صف میں پانچ شالیں موجود ہیں لیکن اتنی شالیں ہونے پر بھی اس شال کی ممتاز ہستی اپنی جگہ نمایاں ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم ایسی دوسری شالوں کو الگ کر کے پہچان نہ لو! کیوں؟ اس لئے

کہ گو شالیں یہاں بہت سی ہیں مگر لال رنگ کی شال یہی ایک ہے دوسری کوئی نہیں۔
اب غور کرو کس طرح رنگت کی لالی اس کا امتیازی نشان بن گئی ہے؟ یہی اس کی ممتاز ہستی ہے اسی سے اس کی ہستی کا انفراد و استقلال ہے۔ اسی سے اس کی ساری شناخت ہے اسی سے یہ تمام اشاروں کی مشارٌ الیہ بن رہی ہے اچھا اب فرض کرو چند دنوں کے بعد اس کا رنگ مدھم پڑ جائے، شوخ لال کی جگہ ہلکا گلابی رنگ رہ جائے۔ پھر کیا اس کا امتیازی رنگ بھی مدھم نہیں پڑ جائیگا تمہارا سر ہل رہا ہے یعنی بلا تامل تصدیق کر رہے ہو کہ ہاں ایسا ہی ہوگا اچھا فرض کرو ایک وقت ایسا آئے گا کہ اس کی رنگت کا وہ مدھم رنگ بھی باقی نہ رہے۔ میں تمہاری شال کے لئے ایک بدشگونی نہیں کر رہا ہوں۔ مثال دے رہا ہوں۔ فرض کرو لال رنگ بالکل غائب ہو جائے۔ پھر کیا ہوگا؟ یقیناً تم کہوگے کہ اس شال کی امتیازی ہستی بالکل ختم ہو گئی۔ شال اب بھی ہے لیکن وہ ممتاز شال نہ رہی جو لالی کی رنگت سے ابھر آئی تھی۔ یہی حال انسانی جماعتوں کا بھی ہے ہر جماعت جو دوسری جماعتوں سے اپنی جماعتی ہستی میں ممتاز ہوتی ہے کوئی نہ کوئی عملی رنگ ضرور رکھتی ہے اور اسی رنگ سے اس کی زندگی کا قیام ظہور میں آتا ہے جب تک یہ عملی رنگ قائم ہے جماعت کی ہستی بھی قائم ہے جہاں یہ رنگ گیا جماعت کی ہستی بھی رخصت ہو گئی۔
اچھا سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن حکیم نے مسلمانوں کی جماعتی زندگی کے لئے کوئی عملی بنیاد قرار دی ہے؟ اور اگر قرار دی ہے تو وہ کیا ہے؟ کاش ایسے سوالوں کی خلش تمہارے دلوں میں پیدا ہوا کرے۔
تم یہ سوال سامنے رکھ کر قرآن حکیم کا مطالعہ کرو، تمہیں بہت سے اعمال ملیں گے۔ جن پر قرآن نے مختلف پیرایوں میں زور دیا ہے لیکن تم دیکھوگے کہ وہ اعمال جنھیں وہ سب سے اونچی جگہ دیتا ہے سب سے زیادہ نمایاں کرتا ہے۔ سب سے

زیادہ دہرا دہرا کر بیان کرتا ہے اور پھر صاف صاف قطعی لفظوں میں انہیں مسلمانوں کے لئے بہ حیثیت ایک جماعت کے عملی نشان قرار دیتا ہے صرف دو ہی عمل ہیں۔ قیام صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ لیس لہما ثالث

قرآن کریم کی سب سے پہلی آیت جس نے مسلمانوں کو ظالموں کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھانے کی اجازت دی تھی سورہ حج میں ہے۔

اذن للذین یقاتلون بانہم ظلموا ، وان اللہ علیٰ نصرھم لقدیر ۝

جن مسلمانوں کے خلاف جنگ کی جارہی ہے ، اب انہیں اجازت ہے اور یہ اجازت اس لئے ہے کہ وہ مظلوم ہیں اور خدا ضرور اس پر قادر ہے کہ مظلوموں کو سہارا دے ۔

پھر اس کے بعد یہ واضح کیا گیا کہ اگر ان مظلوموں کو مدد ملی اور ان کے قدم ملک میں جم گئے تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا ؟ یعنی اس انقلاب حال سے جو جماعت پیدا ہوگی وہ کیسی جماعت ہوگی ؟ اس کا عملی امتیاز کیا ہوگا ؟ چنانچہ فرمایا۔

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ ، امروا بالمعروف ۔ نھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور ۝

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ملک میں ان کے قدم جمادیں تو ایک ایسی جماعت پیدا ہوجائے گی جو نماز کا اہتمام کرے گی ۔ زکوٰۃ ادا کرے گی ۔ نیکی کا حکم دے گی ۔ برائی سے مانع ہوگی ۔ اور انجام کار اللہ کے ہاتھ ہے ۔

اب دیکھو یہ محل وصف و امتیاز کا محل تھا یعنی یہ حقیقت آشکارا کرتی تھی کہ یہ مظلوم مسلمان نصرت الٰہی کے مستحق ہیں کیونکہ اگر انہیں نصرت ملی تو ایک بہتر

واضح جماعت پیدا ہوجائیگی اور اس کی جماعتی زندگی کی امتیازی خصوصیات ہوں گی لیکن یہ خصوصیات بیان کرتے ہوئے اور کسی عمل کا ذکر نہیں کیا گیا صرف اقامت صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ کا ہی ذکر کیا آگے چل کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اوصاف بھی آگئے ہیں اور ان میں اجمالاً ساری باتیں آجاتی ہیں۔ تاہم خصوصیت کے ساتھ یہ دو عمل ضرور نمایاں کئے گئے، یہاں روزے اور حج کا ذکر نہیں کیا گیا حالانکہ وہ بھی چار عملی رکنوں میں دو رکن ہیں۔ صرف نماز اور زکوٰۃ ہی کو خصوصیت کے ساتھ اظہار کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ وحی و نبوت کی تعلیم و تزکیہ سے جو جماعت تیار ہورہی تھی اس کا بہ حیثیت ایک جماعت کے امتیازی وصف یہی تھا کہ نماز قائم کرے گی اور ادائے نماز کا نظام استوار ہوگا اس کے انفرادی زندگی کے عملی اوصاف بہت سے ہیں لیکن جماعتی زندگی کا ممتاز وصف یہی دو عمل ہوئے

سورۃ توبہ میں جہاں جنگ کے احکام بیان کئے گئے ہیں پہلے فرمایا۔

فان تابوا، واقاموا الصلوٰۃ۔ واٰتوا الزکوٰۃ۔ فخلوا سبیلھم

پھر آگے چل کر تصریح کی :۔

فان تابوا۔ واقاموا الصلوٰۃ۔ واٰتوا الزکوٰۃ فاخوانکم فی الدین :۔ یعنی وہ لوگ اگر اپنی روش سے باز آجائیں نیز نماز کا اہتمام کریں۔ زکوٰۃ دینے لگیں تو پھر تم میں اور ان میں کوئی تفرقہ نہیں رہا۔ وہ تمہارے دینی بھائی ہوگئے غور کرو! اس موقع پر یہ بات واضح کرتی تھی کہ اگر یہ لوگ ظلم و شرارت سے باز آجائیں اور مسلمان ہوجائیں تو تم میں اور ان میں کوئی تفرقہ نہیں رہے گا لیکن یہاں مسلمان ہونے کے لئے بطور شرط کے کن اعمال کا ذکر کیا گیا؟ صرف قیام صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا۔ اگر ان لوگوں کی جماعتی زندگی ایسی ہوجائے کہ نماز کا اہتمام کریں زکوٰۃ کی ادائےگی میں سرگرم ہوجائیں۔ تو پھر یہ تمہارے دینی بھائی ہوگئے۔ اس سے معلوم

ہوا کہ قرآن کے نزدیک کسی انسانی جماعت کے، مسلم جماعت ہونے کی علامت صرف یہی دو عمل ہیں۔ جس جماعت کی جماعتی زندگی میں یہ دو عمل نمایاں ہیں وہ مسلمان ہے۔ جس میں نہیں ہیں وہ مسلمان نہیں۔

اسی طرح قرآن کے بے شمار مقامات ہیں جو اس حقیقت کا صاف صاف اعلان کر رہے ہیں سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات اسلام کے عقائد و اعمال کے باب میں ... اصل و اساس کا حکم رکھتی ہیں یاد کرو ان میں بھی جن دو عملوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہی دو عمل ہیں۔ تیسرے کو کوئی جگہ نہیں ملی ہے۔

الذین یومنون بالغیب ویقیمون الصلوٰۃ و مما رزقنٰھم ینفقون والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالاٰخرۃ ھم یوقنون ہ

جہاں تک اعتقاد کا تعلق ہے یہاں ایمان بالغیب، ایمان بالقرآن۔ ایمان بالکتاب اور ایمان بالآخرۃ کا ذکر کیا گیا ہے لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے صرف دو ہی عمل بیان کئے گئے ہیں۔ (۱) یقیمون الصلوٰۃ (۲) مما رزقنٰھم ینفقون۔

یقیناً تصریحات کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ قرآن کے نزدیک دوسرے اعمال غیر ضروری ہیں۔ خصوصاً روزہ اور حج کہ نماز اور زکوٰۃ ہی کی طرح بنیادی ارکان میں داخل ہیں۔ صاف مطلب ہے کہ وہ تمام ارکان کتنے ہی ضروری ہوں یا نہ ہوں مگر اسلامی زندگی کی عملی شرط اور عملی شناخت نہیں ہیں یہ درجہ صرف انہی دو عملوں کو حاصل ہوا اگر پوچھا جائے ایک انسان کو اسلامی زندگی بسر کرنے کے لئے کیا کیا اعمال بجا لانے چاہئیں تو قرآن جواب دے گا کہ بہت سے اعمال بجا لانے چاہئیں۔ اور ان میں سے ہر عمل اسلامی زندگی کے ضروری عناصر میں

سے ہے لیکن اگر پوچھا جائے کہ کسی جماعت کے مسلمان ہونے کی پہچان کیا ہے؟ یعنی وہ کون سی نمایاں خصوصیت ہے جو ایک گروہ کو عام گروہوں سے الگ کرکے مسلم گروہ کو عام گروہوں سے الگ کرکے مسلم گروہ بنا دیتی ہے؟ تو قرآن کا جواب صرف یہ ہوگا کہ نماز کا اہتمام اور زکوٰۃ کا انتظام جس گروہ میں یہ دو باتیں پائی جائیں سمجھ لو وہ مسلمان ہے جس میں نہ پائی جائیں سمجھ لو وہ مسلمان نہیں۔

یہیں سے یہیں اس مسئلہ کا حل بھی مل گیا، جو ترک صلوٰۃ کے کفر اور عدم کفر کی نسبت مختلف فیہ چلا آتا ہے دراصل اس باب میں قرآن نے فرد اور جماعت کا جو فرق ملحوظ رکھا ہے اس پر غور نہیں کیا گیا اسی لئے طرح طرح کے الجھاؤ پیدا ہوگئے اور سمجھنے کی جگہ اور الجھنے لگے۔ نماز اور زکوٰۃ کے ترک کی دو حالتیں ہیں دونوں کا حکم ایک نہیں۔ ایک یہ ہے کہ کوئی شخص بحیثیت ایک فرد کے انہیں ترک کردے پہلی صورت میں یہ گناہ ہے نہایت سخت گناہ۔ دوسری صورت میں کفر ہے صریح کفر۔

بات صاف ہے مگر غور کرنے کی ضرورت ہے اسے اچھی طرح سمجھ لو۔ اگر ایک شخص اپنی انفرادی زندگی میں نماز کا تارک ہورہا ہے تو یہ ایک فرد کی عملی کوتاہی ہے مگر جماعت کا جماعتی امتیاز قائم ہے کیونکہ اگر زید سے کوتاہی ہورہی ہے تو عمرو سے کوتاہی نہیں ہورہی ہے۔ بکر کی سرگرمی میں فرق نہیں آیا ہے لیکن اگر مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی پیدا ہوگئی ہے جس کے ہر فرد نے یہ عمل ترک کردیا ہے اور تمام لوگ اسی حالت پر قانع ہوگئے ہیں تو یہ صرف چند افراد کی انفرادی کوتاہی عمل ہی نہیں ہوئی بلکہ ایک پوری جماعت کا اپنا جماعتی امتیاز کھو دینا ہوا۔ اور اگر جماعتی امتیاز باقی نہیں رہا تو پھر جماعت جماعت نہیں رہی اس کا شمار مسلمانوں میں نہ ہوگا۔

میں نے چند لفظوں میں تمہیں ایسے مسئلہ کا حل بتلا دیا ہے جس کے حل کے

لئے بے شمار کتابیں بھی کافی نہیں ہوئی تھیں۔ تم اس پر جس قدر غور کرتے جاؤ گے اسلامی اصول و قواعد، بے شمار حقائق آشکارا ہوتے جائیں گے۔ یہی معنی ان روایتوں کے ہیں جن میں کسی بستی کے مسلم اور غیر مسلم ہونے کی علامت یہ بتلائی ہے کہ اذان کے وقت کا انتظار کرو۔ اگر اذان کے وقت صدا اٹھتی ہے تو بستی مسلمانوں کی ہے۔ نہیں اٹھتی تو مسلمانوں کی نہیں۔ کیونکہ مسلمانوں کی جماعت کا عملی اور بیرونی امتیاز اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ فکر و اعتقاد تمہارے مکان کے اندر کی دیواروں کا رنگ و روغن ہے اسے باہر سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ باہر سے تو باہر کی دیواروں پر نظر پڑے گی۔ اگر اس کی رنگت سبز ہے تو کہیں گے سبز مکان ہے نہیں ہے تو کہیں گے نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم صحیح ترمذی وغیرہ میں پڑھتے ہیں۔ صحابہ اعمال میں سے کسی عمل کے فقدان کو کفر سے تعبیر نہیں کرتے تھے مگر نماز کے فقدان کو۔ وکان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

لا یرون شیئاً ترکہ کفراً غیر الصلوٰۃ

اگر حقیقت حال یہ ہے تو کیا ضروری نہیں کہ تم چند لمحوں کے لئے غور کرو آج تمہاری زندگی کا یہ جماعتی امتیاز قائم ہے یا مفقود ہو گیا ہے؟

فبشر یا عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ

⁂

خطبۂ عید اضحیٰ

الحمد للہ الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون ومن اللہ المومنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد انّ سیّدنا ونبیّنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ۔

برادرانِ عزیز! تمہیں معلوم ہے کہ خطبہ کے چند گنے ہوئے منٹ جو میرے حصہ میں آتے ہیں، میں کوشش کرتا ہوں کہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ اہم بات تمہارے کانوں تک پہنچا دوں۔ لیکن آج صبح سے ایک خاص چیز میرے دماغ میں گردش کر رہی ہے اور اس کا اظہار کئے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔ اور نہ واقعات کے تاثر اور حقائق کے نتائج سے کوئی بھی انکار و اغماض کر سکتا ہے۔

میں تمہیں بتلانا چاہتا ہوں کہ اس چیز کا جس کو میں تمہارے سامنے جلد بیان کروں گا، مجھ پہ حد درجہ اثر پڑا ہے، یہاں تک کہ دماغ کے ایک ایک ریشہ میں

رچ گیا ہے، وہ کیا چیز ہے؟ دو واقعے جن کو میں چند منٹوں کے اندر تمہارے کانوں میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں، اور جن سے دفتر کے دفتر، وقت کی حقیقتوں کے تمہارے سامنے کھل جاتے ہیں۔

پہلا واقعہ یوروپ کی علمی تاریخ کا واقعہ ہے اور دوسرا واقعہ اسلام کا ایک علمی اور تاریخی واقعہ ہے۔ تم میں اسکول اور کالج کے طلبا بھی موجود ہیں جنھوں نے یقیناً اس واقعہ کو اپنے اسباق اور لکچروں میں پڑھا اور سنا ہوگا اور نا ممکن نہیں اگر تم نے کبھی کبھی کسی علمی مجلس و تذکرہ میں اسے سنا اور دیکھا ہو۔ یہ واقعہ میں نے آج سے پینتیس سال قبل مطالعہ کیا تھا اور جسے اس وقت تمہیں وقت کی مناسبت کے اعتبار سے بتانا اور یاد دلانا چاہتا ہوں۔

علمی ایجاد کے وقت میں۔ سترھویں صدی کے اوائل میں یوروپ نے جہاں اور بہت سے مفید ایجادیں کی تھیں، ایک ایجاد دوربین تھی ... ہاں دوربین۔ وہ دوربین نہیں جو تم گھوڑدوڑ دیکھنے کے لئے، ریس والے دن اپنی جیبوں میں لیجاتے ہو بلکہ وہ دوربین جسے موجد نے اس مقصد کے لئے ایجاد کیا تھا کہ فضائے سماوی کو دیکھا جاسکے، ستاروں، سیّاروں، چاند اور سورج کی حقیقتوں کو پرکھا اور جانچا جاسکے، اور انسانی معلومات میں سئے نئے تجربے نظر آئیں علم کو وسعت کے لئے، بحث و نظر کے لئے ایک نیا میدان نوع انسان کے سامنے آئے۔ غور و فکر کرنے والے دل و دماغ اپنی صلاحیتوں کو مفید کاموں میں استعمال کر سکیں۔ نیز اسی سترھویں صدی کی یہ تحقیقات، کہ چاند دوسرے سیارگان کے مقابلہ میں زمین سے نسبتاً قریب ہے۔ نیز یہ تحقیق کہ زمین گردش کرتی ہے۔ یہ تمام مفید ایجادیں اور علمی تحقیقات، جس کی وہ، محقق گیلیلو ہے یہ وہ وقت ہے کہ یوروپ میں مذہبی تعصبات کی ہوائیں چل رہی تھیں اور جہل و

تعصب کی یہ طوفان خیزیاں انسانی خون پانی کی طرح بہا رہی تھیں۔ ٹھیک اسی زمانہ میں جب اس موجد و محقق نے اپنی تحقیق شائع کی کہ زمین کھمی ہوئی یا کھڑی نہیں ہے۔ بلکہ سورج کے گرد ایک محور پر، ایک نظام خاص کے ماتحت گردش کر رہی ہے تو اس کے خلاف تمام ملک میں آگ بھڑک اٹھی۔ مذہبی مجالس، مذہبی عدالتیں اور اس عدالت کی اعلیٰ بارگاہ سے، گلیلیو، موجد و محقق وقت کے خلاف کفر کے فتوے صادر کئے گئے اور کہا گیا کہ اس نے مذہب کی توہین کی ہے۔ رسم اعتقاد اور تورات کی روایات کے خلاف الحاد و زندقہ کے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ نیز نظام مذہب پر براہ راست حملہ ہے۔ مقدس پاپایان مذہب کو روحانی اذیت پہنچائی ہے چنانچہ [illegible] مذہبی عدالت اعلیٰ کی طرف سے مذہب کے نام پر زیادہ سے زیادہ وحشیانہ مظالم کئے جائیں۔ کیوں؟ کس پر۔ جس کا جرم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک حقیقت ایک علمی تحقیق وقت کی ایک مفید ایجاد سے کیوں قوم کو روشناس کر دیا ہے اور اس لئے کہ دور تاریکی سے نوع انسان کو علم و حکمت کی روشنی میں کیوں لا رہا ہے، یہ تھا گلیلیو، اور یہ تھا اس کا جرم و قصور اور یہ تھا سترھویں صدی کے مقدس پیشوایان مذہب کا عدل۔

فرمائش و فہمائش کی گئی کہ گلیلیو، تو یہ مت کہہ کہ زمین گھومتی ہے، مگر دوستو، حقیقت حقیقت ہے وہ پرواہ نہیں کرتی۔ خس و خاشاک کیا رائے رکھتی ہے۔ اس کی اس نے کبھی پرواہی نہیں کی۔ گلیلو نے انکار کیا۔ مذہبی مقدس عدالت کے سامنے بلایا گیا اسی کی زبان سے تحقیقات اور علمی ایجاد پر بیان لیا گیا، اور حکم دیا گیا کہ اس "کفر" سے عدالت کے سامنے اظہار معذرت و توبہ کرے گھٹنے ٹیک کر طالب عفو ہو، ورنہ دہکتی ہوئی آگ میں جھونک دیئے جانے پہ آمادہ ہو جائے۔

عقوبت و سزا کے لئے مستعد ہو جائے اور طرح طرح کے عتاب برداشت کرنے پر تیار۔

گلیلو پہلے تو اپنی بات پر اڑا رہا۔ اور اس نے اپنی تحقیقات کو جرم اور توہین مذہب تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ تو صرف علمی اکتشاف، دریافت اور نظریہ ہے، اہانت مذہب سے اس چیز کو کیا واسطہ۔ مگر جب عدالت کے اشارے سے جلاد آگے بڑھے تو کانپ اٹھا۔ آخر غریب بوڑھا تھا ہمت نے جواب دے دیا۔ دل مضبوط اور پاؤں ثابت قدم نہ رہے ڈگمگایا اور پھر بولا۔ بہتر ہے میں توبہ کرتا ہوں۔ گھٹنے ٹیکے، معذرت کی، اور معافی مانگ لی۔ رہائی کا حکم پا کر واپس چلا۔ ہنوز عدالت برخواست نہ ہوئی تھی دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ کھڑا ہو گیا اور گھوم کر عدالت کو مخاطب کر کے بولا۔ زمین اب بھی گھوم رہی ہے۔ گرفتار کر لیا گیا۔ بوڑھاپے کے دروازے پر پہنچ جانے کے باوجود اب ہمت جوان ہو گئی تھی کڑک کر بولا۔ میں گھٹنا ٹیک سکتا ہوں۔ مجھ پر تمہاری قہر و غضب کی بجلی گر سکتی ہے۔ تمہاری عدالت میرے جسم کو عذاب و عقوبت میں مبتلا کر سکتی ہے، مگر زمین۔ زمین پر تمہارا بس نہیں، اس پر تو تمہارے کفر کا فتویٰ نہیں لگ سکتا، اور علمی تحقیق، تو ایک علم ہے، ایک حقیقت ہے، حقیقت تو تمہارے سامنے گھٹنے نہ ٹیکے گی بلکہ اس کے خلاف تم۔ تم ایک دن حقیقت کے سامنے جھک جانے پر مجبور ہو گے

ڈریپر (Draper) نے جن الفاظ کے ساتھ تاریخ کے نہ محو ہونے والے اوراق پر، اس حقیقت اور ان مقدس درندوں کے بے دردانہ مظالم کا نقشہ کھینچا ہے، اس کا ایک ایک حرف میرے دل پر کھد گیا ہے۔ موحد و محقق کے ساتھ مذہب کے نام پر ظالموں کے اس سلوک نے یہ کیا کہ گو گلیلو موت کی ابدی نیند میں سلا دیا گیا۔ مگر ایک جماعت کا ضمیر اچانک جاگ اٹھا گلیلو کے الفاظ

کہ میرے توبہ کرنے سے حقیقت کا کیا نقصان جو بہر حال حقیقت ہے حقیقت کو اس کی کیا پرواکہ کسی کے ساتھ کیا ہوتا ہے، کون کرتا ہے؟ کیوں کرتا ہے؟ وہ ہر حال میں حقیقت ہے۔ حقیقت کسی کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیک سکتی بلکہ دنیا خود حقیقت کے سامنے جھکتی ہے، ابھرے

اور ایک دن، جو اس دن سے زیادہ دور نہ تھا، ایسا آیا کہ لوگ گلیلو کی پرستش کر رہے تھے۔

یوروپ کی تاریخ میں تجسس و تحقیقات کی یہ حقیقت آج بھی ابھرے ہوئے نقوش اور روشن نمود کے ساتھ موجود ہے۔

دوسرا واقعہ، اسلامی دور حکومت کی ایک علمی و تاریخی حقیقت ہے یہ واقعہ احمد بن حنبل رح کا واقعہ ہے۔ خلیفہ واثق اور مامون کے زمانے میں خلق قرآن کا ایک فتنہ اٹھتا ہے۔ بارگاہ خلافت کے پُر جلال ایوانِ سطوت سے آواز اٹھتی ہے کہ قرآن کو مخلوق مان لیا جائے۔ اغراض کے بندے کس زمانے میں نہ تھے منصب و جاگیر کے خواہاں کس زمانے میں کم رہے ہیں۔ کتنوں نے تو فوراً تسلیم کر لیا۔ کتنے ایسے بھی تھے جو اس گھونٹ کو آسانی سے پی لینے پر آمادہ نظر نہ آتے تھے۔ کتنے خوف و دہشت کے سبب انکار تو نہ کر سکتے تھے مگر تاویلیں تلاش کر رہے تھے، کتنے ایسے بھی تھے جو وطن چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ کچھ حق و صداقت کے پیکر ایسے یقیناً تھے اور جن کے وجود سے زمانہ کبھی خالی نہیں رہا۔ جو علی الاعلان کہہ رہے تھے کہ قرآن میں تاویل کی قطعاً گنجائش نہیں۔ نیز یہ کہ ھو کلام اللہ غیر مخلوق ط "قرآن اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں" خلفائے عباسیہ کا دربار، معتزلہ کی کثرت، ان کا اصرار، وقت کے جتنے علماء تھے ان کا اقرار تذبذب، تاویل یا فرار، امر حقیقت یہ ہے کہ ایک عجیب ابتلاء آزمائش، دار و گیر کا زمانہ تھا، جنہوں نے انکار کیا

تھا جیل کی کوٹھریوں میں بند اور مبتلائے عذاب تھے، جو کمزور دل کے تھے، اقرار کر کے نکل آئے لیکن امام احمد بن حنبلؒ جیسے بزرگ نے جیل کی کوٹھری، تازیانہ کی مار، کوڑوں اور دُرّوں کے غیر انسانی عذاب کو پسند فرمایا، بلکہ خود دعوت دی تھی، ہرگز آمادہ نہ ہوئے کہ باطل کے سامنے گھٹنے ٹیک کر، جھک کر جان بچانے کو ترجیح دیں۔ اگرچہ حکومت نے اپنے خفیہ کارندوں سے امام حنبلؒ سے کہلوایا کہ جان بچانا فرض ہے، اثر نہ ہوا عہدے اور منصب کی ترغیب دی گئی، منھ پھیر لیا، عذاب و عقاب کا خوف دلایا گیا، مسکرا دیئے، امام ممدوح کے ساتھ ایک صاحب اور تھے جب سزا کو برداشت نہ کر سکے تو لطائف الحیل کے ساتھ جیل کے باہر آ گئے انھیں بھی مشورہ دیا لیکن حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا اور فرمایا۔

اعطونی شیئاً من کتاب اللّٰہ او من سنۃ رسولہ

دوستو! میرے سامنے ایک حقیقت ہے، وقت کی سختیاں چیز کیا ہیں۔ ان سختیوں کو دوام نہیں، فنا ہے۔ جسم فنا ہوا تو سختیاں بھی نابود سمجھو، مجھے زمانہ کی کڑی اس روشنی سے ہٹا نہیں سکتی جو میرے سامنے ہے۔ بدستور کوڑے کھاتے ہیں حتیٰ کہ تمام منہ لہو سے تر ہو جاتا ہے۔ جب حالت حد درجہ نازک ہو گئی تو علماء کی ایک جماعت، جسے علماء کہنا ہی، علماء کی توہین ہے، آئی اور طرح طرح حیلوں سے اس وجودِ عظیم کو جادۂ حق سے منحرف کرنا چاہا۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا میرے ساتھ آؤ۔ جیل کی کوٹھری کے ایک دریچے میں لے گئے۔ کھڑکی کھولی، باہر ہزارہا مخلوق آج کی گفتگو سننے اور نتیجہ فکر قلمبند کرنے کے لئے موجود کھڑی تھی۔ ہاتھوں میں قلم دامن میں دوات، آپ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا، تم کون ہو؟ اور یہاں کیوں آئے ہو؟ جواب ملا۔ ہم طالبانِ علم ہیں اور اس لئے آئے ہیں کہ یہ آپ کا آخری وقت ہے۔ اس مسئلہ کی بابت آپ کی رائے قلمبند

گرمیں گے۔ تاکہ وہ امت اور خلف کے لیئے دلیل ہو۔ جواب سن کر آپ نے اس جماعت سے خطاب فرمایا، تم نے سن لیا، اور میری ذمہ داری کا اندازہ کیا، اگر میں آج اس حقیقت پر ثابت قدم نہ رہا تو کل قیامت کے دن امت رسول اقدسؐ، اور اللہ کو کیا جواب دوں گا اور موت تو بہرحال آنی ہے، میں جانتا ہوں کہ بہت سے علماء اقرار کر کے جیل سے چھوٹ چکے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اگر میں بھی پسند کر دوں تو اسی طرح اقرار کر کے چھوٹ سکتا ہوں، یہی نہیں اعزاز بھی ملے گا، آرام بھی ہو گا، ورنہ یہی عذاب ہتا آنکہ موت مجھے آغوش میں لے لیگی کیا میں ایک بدعت کے سامنے جھک جاؤں۔ کیا ایک باطل کو قبول کر لوں، کیا وقت کی چند کڑواہٹوں کے خوف سے، حقیقت سے انکار کر دوں؟ کیا امت میں ایک فتنہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ جاؤں؟ یہ ہرگز نہ ہوگا۔ ناممکن ہے کہ میں نظام قرآن درہم برہم کروں۔ مجھے یہ تمام مصائب منظور، مگر حقیقت سے روگردانی، سچائی سے انکار، مجھ سے یہ توقع عبث۔ جاؤ خلیفہ وقت کو بتاؤ۔

اللہ اللہ، ۳۵ برس ہوئے کہ میں نے ان تاریخی اور علمی حقائق کو دیکھا تھا اور یہ دونوں واقعے اس درجہ مجھ پر اثر انداز ہوئے کہ میرے دماغ کے گوشے گوشے میں آج بس گئے ہیں حتیٰ کہ اکثر اوقات یہ واقعات خواب میں متشکل ہو کر مجھے نظر آتے رہتے ہیں، حقیقت بہرحال حقیقت ہے۔

میرا معاملہ کلکتہ میں محدود نہیں ہے، کلکتہ کا کوئی گوشہ بھی میرے سامنے نہیں، ایک چیز اور یاد رکھو، ایک چیز اور یاد رکھو، ایک لمحہ کے لئے بھی نہ بھولو۔ تم مجھ سے ساری فرمائشیں کر سکتے ہو، مجھ سے سب کچھ لے سکتے ہو، مگر ایک سیکنڈ کی خاطر، ایک سکنڈ کے پچاسویں حصہ کے لئے بھی، میری نسبت یہ توقع نہ کرنا کہ میں نے جس حقیقت کو اپنی بصیرت کی روشنی میں دیکھ لیا ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح

تم اس چھپتے ہوئے سورج کو دیکھ رہے ہو اس حقیقت ہے۔ ہاں اسی حقیقت ہے۔ ہاں اسی حقیقت سے ایک انچ بھی ہٹ جاؤں گا۔ زمانے کی تلخیاں یا کروڑ روپے کا لالچ جو بھی ہو مجھے اس حقیقت سے برگشتہ نہیں کرسکتا اور لوگوں کی خواہش حقیقت کے سامنے چیز ہی کیا ہے۔ سارے انسان یہ تو خس وخاشاک کے ڈھیر ہیں خس وخاشاک۔ ہاں خس وخاشاک یعنی مٹی کے ڈھیر ہیں۔ حقیقت کے آگے اس مٹی کے ڈھیر کی کیا حقیقت ہے۔ بکھیوں کا گرتو ہیں۔ تم کو اگر مکھیاں گھیرلیں، تو کیا تم مکھیوں کے سامنے سر جھکا دوگے، یقیناً نہیں بلکہ ان پر قابو حاصل کروگے۔

مجھے جو کچھ ملا ہے حقیقت کی روشنی میں ملا ہے۔ قبول عام کے لئے میں نے کبھی کسی کی پیروی نہیں کی، بلکہ اپنی راہ خود بنائی ہے، کوئی لالچ مجھے لبھا نہیں سکا کسی کی ہیبت کی مجھے مرعوب نہیں کرسکی جس راہ کو درست، حق اور سچی سمجھ کر سچائی کے ساتھ، بصیرت کی روشنی میں اختیار کیا، اسی جادۂ حق وصواب پر آج تک قائم ہوں اور اس کے نتائج کو اتنا ہی قریب دیکھ رہا ہوں جتنا تم مجھ کو انسانی جنگل، ذرات کا یہ صحرا! اس کی نبضیں تو میرے ہاتھ میں ہیں۔ حقیقت کے سامنے ان وجوہ کی خواہشات کا شمار ہی کیا، حقیقت بہر حال حقیقت ہے۔

ھٰذا وان احسن الکلام کلام اللہ الملک العلوم ط

⁂ ⁂ ⁂

جب آگرہ خلافت کانفرنس
منعقد ہوئی تو مولانا صدر تھے۔
اس موقعہ پر انھوں نے دو
تقریریں کیں، ایک کانفرنس
کے افتتاح کے موقع پر اور
دوسری اختتام پر، چنانچہ
دونوں تقریریں افتتاحی تقریر
اور اختتامی تقریر کے عنوان
سے درج ذیل ہیں۔

آگرہ خلافت کانفرنس

(افتتاحی تقریر)

حضرات! آپ کے صوبے کی غالباً یہ تیسری مجلس خلافت ہے، جس کی صدارت کی خدمت کے لئے آپ نے از راہ لطف و نوازش مجھ کو منتخب فرمایا ہے میں اس لطف و عنایت کے لئے آپ تمام بزرگوں اور عزیزوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس خدمت کے انجام دینے میں آپ عزیزوں کی مساعدت میری مدد کرے گی اور اللہ تعالیٰ توفیق دیگا کہ اس کو بہتر امیدوں کے ساتھ ختم کروں۔

اس مجلس کا افتتاح کرتے ہوئے جن بیانات کی ضرورت تھی میں سمجھتا ہوں کہ وہ اتنی مرتبہ بیان میں آچکے ہیں، بارہا ران کا تذکرہ کیا جا چکا ہے، بار بار مجلسوں میں وہ پیش ہو چکے ہیں۔ زبانوں پر بھی بار بار ان کا اعادہ ہو چکا ہے، قلم نے بھی بار بار ان کی تکرار کی ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ان مسائل کی نسبت اس وقت اور زیادہ تفصیل سے کام لینا غیر ضروری ہے، لیکن اگر اس کی ضرورت ہوتی کہ میں وقت کے مسئلوں کی نسبت، تحریک خلافت کی نسبت، آزادی ہند کی تحریک کی نسبت، آپ کی خدمت میں گذارشات کرنا ضروری محسوس کرتا، تب بھی میں سمجھتا ہوں کہ کم سے کم ایک ایسی آبادی میں، ایک ایسے شہر میں جیسا کہ یہ شہر ہے اور جیسا کہ یہ شہر ہے اور جیسی کہ اس شہر کی تاریخ ہے میں سمجھتا ہوں کہ ان تمام بیانات کی جو

انسان کی گویائی کر سکتی ہے، کچھ ضرورت تھی۔

آپ سمجھتے ہیں کہ اس دنیا میں جس طرح خدا کی سچائی کے مختلف بھیس ہیں۔ خدا کی سچائی کے لئے مختلف نقاب ہیں، اگرچہ بھیس مختلف ہوتے ہیں، لیکن صورت مختلف نہیں ہوتی اسی طرح سچائی کی بھی مختلف زبانیں ہیں، اور سچائی ہمیشہ ان مختلف زبانوں سے اپنی فصاحت و بلاغت آپ کے کانوں تک پہنچاتی ہے۔

میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ سچائی کی زبان ایک تو وہ ہے جس کا تعلق ہماری آپ کی دی ہوئی گویائی سے ہے جو زبان سے تعلق رکھتی ہے، وہ آواز جو حلق سے نکلتی ہے۔ ایک گویائی تو وہ ہے جو زبان سے تعلق رکھتی ہے جس کے لئے زبان کو گویائی اور تکلّم کی ضرورت ہے، لیکن اس دنیا میں ایک دوسری خاموش بلاغت اور گویائی بھی ہے، وہ گویائی، جس کے لئے کانوں کی ضرورت نہیں ہے کہ کان سنیں، بلکہ اس گویائی کو آنکھوں کی ضرورت ہے تاکہ وہ آنکھیں اس کا مطالعہ کریں۔

میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ حقیقتاً اٹھارہ مہینے گزرنے کے بعد جو آپ کی اس تحریک کے بعد گزر چکے ہیں، جو تحریکِ خلافت اور آزادیٔ ہند کی تحریک پر گزر چکے ہیں، اگر ایک ایسی مجلس میں جو میرے چاروں طرف فراہم ہے، اس امر کی ضرورت ہے کہ اُس کے آگے ماتم اور فریاد کی جاوے، التجاؤں کا ہاتھ پھیلایا جاوے، تمام حقائق و معارف کا دفتر کھولا جائے۔ تو میرے عزیزو، خاص کر وہ جو شہر آگرہ کے باشندے ہیں، بلکہ جو ہندوستان کی گزشتہ تاریخ کے مدفن کے باشندے ہیں، اگر اب بھی ان کی ضرورت ہے خطبوں کی تقریروں کی، تو وہ ان تقریروں کے لئے میری گویائی کا انتظار نہ کریں۔ آیئے ہم اور آپ چشمِ تصور سے کام لیں اور چند منٹوں کے لئے اُس جمنا کے کنارے پہنچیں جس کو آج ہی میں نے علی گڈھ سے آتے ہوئے دیکھا ہے، میں نے اس جمنا میں اتنا پانی بھی نہ پایا، جتنا خون ان پانچ سالوں میں مسلمانوں کا بہہ چکا ہے۔ اگر آپ میری ہمراہی کریں گے

تو میں آپ کے لئے ایک اچھی آواز کی زبان کو، ایک بہترین دفتر عبرت کو وہاں مہیا پاتا ہوں۔ وہاں زبان نہیں ہے۔ ۔ وہاں ایک مجسم فصاحت موجود ہے، وہاں ایک مجسم خطبہ موجود ہے۔ وہ جملہ عمارت موجود ہے، جو ہندوستان کی گذشتہ عظمت پر ماتم کر رہی ہے۔ وہاں شاہجہاں کا مدفن اور آرام گاہ موجود ہے، اس سے بڑھ کر بھی کوئی زبان ہو سکتی ہے جو تمہارے کانوں کو مخاطب کر سکتی ہے ؟

میں نہیں سمجھتا کہ اس آبادی میں، اس تہذیب کے مدفن میں، اس عالم کی قربان گاہ میں میں کون سی چیز پیش کروں؟ اس زمین کے ایک ایک چپے کی خاموشی بھی آواز موجود ہے۔ اس کے ایک ایک ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں، ان ٹوٹی ہوئی اینٹوں میں، جن کا غبار ہوا میں اڑ رہا ہے، نصیحت موجود ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر میرا فرض ایک خطیب کا فرض نہیں ہے، ایک مقرر کا فرض نہیں ہے۔ البتہ میرا فرض ایک فریادی اور ماتمی کا فرض ہے، جو آپ کے آگے اس لئے نہیں آیا ہے کہ آپ کو کچھ سنائے، بلکہ ماتم کرے اور آپ سے امید کرے کہ اگر آپ کی زندگی کے چند لمحے آپ کے معاملاتِ دنیا اجازت دیں تو آپ بھی اس کے ماتم میں شریک ہوں،

اٹھارہ مہینے کا زمانہ گذر چکا ہے کہ ہم نے اس سفر کا اعلان کیا تھا، اس اٹھارہ مہینے کے اندر تحریک خلافت کی کتنی منزلیں ہیں جو ہمارے سامنے آئیں اور ہم طے کر چکے ہیں۔ میں اس وقت مسئلہ خلافت پر، مقامات مقدسہ پر ہندوستان کی آزادی پر، جو مسلمانوں کے لئے ویسا ہی فرضِ شرعی ہے۔ جیسا تحفظِ خلافت و دفاع، میں مناسب نہیں سمجھتا کہ ان مسائل پر کچھ عرض کروں۔ اس کے لئے آپ کے پاس خاموش گویائی موجود ہے جو آپ کے دلوں کو متنبہ کر سکتی ہے۔

اس وقت اس جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے سب سے پہلے جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ احتساب کی نظر ڈالیں اور اندازہ کریں کہ اس اٹھارہ مہینے

کے اندر جو سفر پیش آیا تھا۔ اس میں ہم نے کونسی منزلیں طے کیں؟ اور آگے کون سی منزلیں باقی ہیں؟ اس بارے میں آپ کے صوبے کو علاوہ تاریخی خصوصیت کے ایک اور خصوصیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا، تو آپ ہی کا صوبہ ہے، جس کی کانفرنس میں سب سے پہلے اس عمل عظیم کا اعلان کیا گیا ہے، جس کو آپ "نان کوآپریشن کے نام سے سن چکے ہیں۔

میرٹھ میں خلافت کا جو جلسہ ہوا، اس میں مہاتما گاندھی جی بھی شریک تھے، اس میرٹھ کے جلسے میں سب سے پہلے ترکِ موالات کا خلافت کمیٹی کی جانب سے بطور ایک عملِ دفاع کے، بطور ایک امرِ احتجاج کے اعلان کیا گیا، آپ ہی کا صوبہ ہے جس میں سب سے پہلے ہم نے اس سفر کے کوچ کا اعلان کیا۔ اٹھارہ مہینے گزر چکے، اٹھارہ مہینے کی مایوسیاں بھی گذر چکیں، اب ہمارا اولین فرض ہے کہ ہم اپنے سفر کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک نظر ڈالیں کہ اب تک ہم نے کتنا سفر طے کیا ہے۔ عجیب نہیں کہ ہمارے سفر کے متعلق بہت سی کمزوریاں، شکوک وشبہات، جو ہم میں سے بعض دلوں کے لئے موجب خلش ہوا کرتے ہیں، عجب نہیں کہ نظر ڈالنے کے بعد خود بخود ان کا ازالہ ہو جائے۔

اس پر نظر ڈالتے ہوئے سب سے پہلے آپ کو یہ حقیقت اپنے سامنے لانا چاہیئے کہ اس سفر سے آپ کا مقصد کیا تھا؟ اور سعی و قربانی کا جو میدان آپ کے سامنے آیا تھا، کیا تھا؟ اس میں ایک بڑی عالمگیر غلطی ہے۔ یہ میں نے اس لئے کہا کہ وہ محض چند قدموں سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ نوعِ انسان کی غلطی ہے۔ انسان جب کسی کام کے لئے قدم اٹھاتا ہے، تو وہ اس میدان کو ڈھونڈتا ہے، جو اس کے وجود سے باہر ہو، اور جو سب سے پہلا میدان اس کے سامنے ہے، اس کو نظر انداز کر دیتا ہے، اس لئے ہم کو چاہیئے کہ ہم متعین کریں کہ مقصدِ حالات کے لئے مدافعت کا

جو میدان تھا، وہ کون سا تھا؟ کیا وہ میدان وہ تھا جو ہندوستان کے رقبے کے باہر ہے، یا اس کے علاوہ دوسرا میدان بھی تھا؟

اس بارے میں فی الحقیقت دو میدان تھے، جو آپ کو پیش آئے تھے پہلا میدان جو آپ کی کامیابی کے لئے اولین قیام گاہ تھا، وہ میدان ہندوستان کے باہر کا میدان نہ تھا، وہ عراق وشام کا، ایشیائے کوچک اور سمرنا کا نہ تھا، جہاں مسلمانوں کا خون بہہ چکا ہے۔ وہ میدان آپ کے ایمان کا، عزم کا، عمل کا میدان تھا، اور ان تمام لفظوں کی جگہ ایک لفظ بول دیں۔ وہ میدان آپ کے ملک کا تھا اور آپ کے ملک کی فتح وشکست کا تھا۔ جب تک آپ اسے فتح نہ کرتے دنیا کی کامیابی آپ کا استقبال نہ کر سکتی۔ آپ کی کامیابی اس پر موقوف تھی کہ سب سے پہلے آپ اپنے میدان کو استوار کرتے اپنے پہلے میدان کا ہتھیار اور سازوسامان سنوارا ہوتا، جب تک اسے فتح نہ کرتے دوسرے میدان میں قدم نہ رکھ سکتے۔

تحریک خلافت کے لئے سب سے پہلے خود ہندوستان کا میدان تھا، خود مسلمانوں کا میدان تھا، ہندوستان کی بسنے والی قوموں کا میدان تھا۔ سب سے پہلی منزل جو آپ کو پیش آئی۔ وہ تھی جس میں آپ کی تحریک محض اپنی زندگی کی ابتدائی گھڑیاں کاٹ رہی تھی۔ جس وقت بے چارگی کا یہ حال تھا کہ ہزاروں زبانیں موجود تھیں، جن پر خلافت کا نعرہ تھا، لیکن کوئی متفقہ میدانِ عمل آپ کے سامنے نہ تھا۔ مجالس کے مقصد سے یہ معاملہ آگے نہیں گزرا تھا۔ وہ ابتدائی گھڑیاں آج تحریک خلافت پر گزر چکی ہیں، جب یہ معاملہ محض دلوں میں تھا۔ اس سے زیادہ اور کوئی قوت اس کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ہم کو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم وتوفیق فرمائی کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ باوجود

ہماری درماندگی کے ہمارے ترکِ عمل کے، عدم استحقاق کے اللہ کے فضل و رحمت نے اپنا دروازہ کھول دیا اور ہم کو کامیابی عطا کی، اور نتیجہ یہ نکلا کہ چند مہینوں کے اندر ہم نے یہ پہلا میدان فتح کر لیا۔ جب دنیا کی آنکھ کھلی، تو اُس نے محسوس کیا کہ یہ محدود جماعت کی تحریک نہیں ہے بلکہ ہندوستان کا متفقہ مسئلہ ہے یہ پہلا میدان تھا، جو تحریک خلافت کو پیش کیا اور اس کو کامیابی کے ساتھ اس تحریک نے فتح کر لیا۔

اس کے بعد دوسری منزل ہے جو اس تحریک کو پیش آئی اس تحریک کی فتح مندی کے لیے ضرورت تھی کہ یہ تحریک کسی خاص جماعت کی تحریک نہ ہو، بلکہ اس ملک کے لئے ملکی تحریک بنجائے یہ دوسری منزل تھی جو تحریک خلافت کو پیش آئی ضرورت تھی کہ یہ تحریک، سات کروڑ دلوں میں گھر نہ بناتی بلکہ تینتیس کروڑ کے دلوں میں اپنا گھر بناتی، یہ ہندو بھائی ہمارے کندھوں سے کندھا جوڑ کر کھڑے ہو جاتے اور ان کی ہمدردی بھی اس تحریک میں شامل ہو جاتی اس لئے نہیں کہ فی الوقت مسلمانوں کے مطالبات کی کامیابی اسی چیز پر موقوف تھی کہ ہم اپنے بھائیوں کو اس مدد کی زحمت دیتے، ہم میں سے ہر شخص جس کے دل میں ایمان موجود ہے، اس کو یقین ہونا چاہئے کہ اس دنیا میں کسی مقصد کی کامیابی محض انسانوں کی تعداد پر موقوف نہیں ہے، بلکہ ہر تحریک کی کامیابی، ایمان اور عملی کی طاقت پر موقوف ہے، اس سے پہلے میں بار بار اعلان کر چکا ہوں اور آج اعلان کرتا ہوں کہ در اصل اس مقصد کی کامیابی کے لیے ہندوستان کے کسی رقبے میں سے کسی ایک بھائی کو بھی اس امر کی زحمت دینے کے لئے ہم مجبور تھے کہ وہ ہمیں مدد دیتا۔ اگر مسلمان کامیابی حاصل کر سکتے تھے تو اللہ پر اللہ کی نصرت پر، اپنے ایمان پر اعتماد کر کے، لیکن بلاشبہ جبکہ مسئلے خلافت کا

یہ حال تھا، تو اس کے ساتھ ہی اس امر کی ضرورت تھی کہ تحریک خلافت کے ضمن میں خود ہندوستان کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا جس وقت تک ملک میں عام تحریک پیدا نہ ہوتی اور فی الحقیقت تحریکِ خلافت کی کامیابی میں ایک خوبی یہ ہے کہ اس نے ایسے طاقتور ہنگامے کے ساتھ کل ہندوستان کے مسئلے کو زندہ کر دیا جو چالیس سال کی کوشش سے ہندوستان کو نہ ملا تھا۔ اس کامیابی کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں صرف تحریک خلافت ہی موجود نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کا مسئلہ بھی پوری طاقت کے ساتھ زندہ ہو گیا ہے۔ اس مسئلے کی کامیابی کے لیے اس امر کی ضرورت تھی کہ یہ تحریک صرف سات کروڑ کی تحریک نہ ہوتی بلکہ اس کے ضمن میں عام ہندوستانیوں کی سوئی ہوئی قسمت جاگ اٹھتی اور عام مسئلہ پیدا ہو جاتا، اگر آپ کے دل مایوسی میں ڈوبے ہوئے ہیں تو میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ امید دلاؤں کہ یہ مسئلہ خلافت کی دوسری منزل ہے جہاں اس نے کامیابی حاصل کی۔

میں اس منظر خلافت کو ایک منٹ کے لیے فراموش نہیں کر سکتا کہ جوں ہی مسئلہ خلافت ہندوستان میں چھڑ گیا، ہندوستان کے تمام گوشوں میں سے ہمارے ہندو بھائیوں نے کامل صداقت کے ساتھ تحریک خلافت کا استقبال کیا اور اپنی تمام ہمدردیاں اس کے لیے وقف کر دیں، لیکن جہاں اس کا تعلق ملک کے مسئلے سے ہے۔ وہاں کہا جا سکتا ہے کہ یہ مسئلہ چند رفقاء میں محدود تھا، میں نام لوں گا مہاتما گاندھی جی کا کہ وہ اس تحریک کے ایک اولین اور سب سے بڑے قابل عزت رفیق تھے کہ جنہوں نے اس تحریک کا ساتھ دیا تھا۔ مگر اس وقت تک اس مسئلہ نے تمام ہندوستان کے قومی مسئلے کی صورت اختیار نہیں کی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ سامان کر دیا کہ تحریک خلافت کی روشنی نے ہندوستان کے چراغ کو روشن کر دیا، یہ مسئلہ خلافت کی دوسری فتحمندی تھی، جو اس کو ہندوستان کے میدان میں حاصل ہوئی۔

ہندوستان کے لئے، ہندوستان کی آزادی کے لئے، صداقت و حق پہنچنے کے بہترین اور اعلیٰ ترین فرائض ادا کرنے کے لئے ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کا اتفاق اور ان کی ایک جہتی ضروری ہے، میرا قصد نہ تھا کہ مستقل طور پر اس مسئلہ کے متعلق کچھ کہوں کیوں کہ الحمد للہ یہ مسئلہ عمل تک پہنچ چکا ہے، اب اس امر کی ضرورت نہیں ہے کہ اس پر بحث کی جائے لیکن چونکہ تحریک خلافت کی تیسری منزل کے ضمن میں یہ مسئلہ چھڑ گیا ہے، لہٰذا آپ اجازت دیں گے کہ میں اس کے لئے کچھ کہہ دوں۔

ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا مسئلہ اگرچہ اپنے ایک سیاسی مسئلہ ہونے کے لحاظ سے ہندوستان کی نجات کے لئے ایک ضروری مسئلہ رہا ہے، لیکن یہ مسئلہ آج تحریک خلافت کی بدولت ہی ہمارے سامنے نہیں آیا ہے۔ بلکہ ہندوستان میں ایسے لوگ موجود تھے کہ تحریک خلافت کی بنا پر نہیں بلکہ چونکہ انھوں نے اپنی ہدایت کے لئے، اپنی ہر فکر اور ہر کام کے لئے صرف ایک ہی راستہ ہدایت کا پکڑ لیا تھا۔ اس لئے اسلام کے اصولوں نے اسلامی تعلیم نے ان کو مجبور کیا تھا کہ اس کا ہندوستان میں اعلان کریں۔

تحریک خلافت سے تقریباً دس سال پہلے میں نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ اگر ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین شرعی اور اسلامی فرائض انجام دینا چاہتے ہیں تو بحیثیت ہندوستانی ہونے کے نہیں۔ یہ بھی ایک سچی حیثیت ہے۔ مگر سب سے پہلی حیثیت یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے ان کا فرض ہے کہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ ہو جائیں یہ اپنے سینے میں وہ دل رکھتا ہوں کہ جس کے لئے ہدایت کی کوئی شعاعیں نہیں ہو سکتیں۔ جو فاطر السموات نے بھیجی ہوں، میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں ہندوستان کے مسلمان بہترین فرائض انجام نہیں دے سکتے، جب تک وہ احکام اسلامیہ کے ماتحت ہندوستان کے ہندوؤں سے پوری سچائی کے ساتھ اتحاد و اتفاق نہ کرلیں، یہ اعتقاد قرآن مجید کی نص قطعی پر مبنی تھا۔ فی الحقیقت یہ وہ چیز ہے۔

جہاں ایک ترک موالات کے اصول کو ہمارے سامنے نمایاں کرنی ہے، اور دوسری طرف ہندو مسلمانوں کے مسئلہ کو واضح کرتی ہے، ترک موالات کے ضمن میں قرآن مجید کے احکام کیا ہیں؟ موالات، ولایت سے ہے۔ ولایت کے معنی ہیں، محبت اور اعانت اور نصرت تو ترک موالات یعنی مددگاری کے ہر طرح کے تعلقات کو منقطع کر لینا۔ جب تک وہ جماعت اپنے ظلم سے باز نہ آئے۔

قرآن مجید نے دنیا کی تمام غیر مسلم قوموں کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ یہ تقسیم سورۂ ممتحنہ میں موجود ہے۔ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ دو قسم کی قومیں دنیا میں ہو سکتی ہیں ایک تو وہ غیر مسلمان قومیں ہیں، جو مسلمانوں پر حملہ نہیں کرتیں، مسلمانوں کی حکومت اور خلافت پر حملہ نہیں کرتیں۔ ایسی غیر مسلم قومیں جنہوں نے نہ تو حملہ کیا ہے اور نہ مسلمانوں کی آبادیوں اور بستیوں پر حملہ کرنا چاہتی ہیں، ایسی قوموں کے لئے قرآن ایک لمحہ کے لئے بھی مسلمانوں کو نہیں روکتا کہ ان کے ساتھ مصالحت کریں اور بہتر سے بہتر اور اچھے سے اچھا سلوک کریں لیکن جن غیر مسلمان قوموں کا یہ حال ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ قتال کریں، مسلمانوں کو ان کی بستیوں سے نکالیں، تو ان قوموں کی نسبت بلاشبہ قرآن مجید کی یہ تعلیم ہے اور قرآن مجید کا یہ قانون، کمال انصاف اور عدالت پر مبنی ہے جس کو خود خدا کی فطرت نے قائم کیا ہے۔ اسی عالمگیر اور ہمہ گیر عدالت کی بنا پر قرآن مجید کا اعلان ہے کہ ایسی غیر مسلمان قوموں کے ساتھ مسلمان کوئی ایسا تعلق نہ رکھیں جو محبت، دوستی صلح دوستداری اور کسی طرح کی اعانت و نصرت کا ہو، یہ حکم قطعی متعدد آیات قرآن میں موجود ہے۔ سورۂ ممتحنہ میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے نہیں روکتا کہ جن مسلمانوں نے تم سے نہ لڑائی لڑی ہو، نہ قتال کیا ہو نہ مسلمانوں کو ان آبادیوں سے نکالا ہے، اگر مسلمان ایسے نامسلمان کے ساتھ اتحاد کریں، اور ہر طرح کی نیکی کا بہتر سے بہتر سلوک جو وہ کر سکتے ہیں، کریں ایک منٹ کیلئے

قرآن انھیں اس سے نہیں روکتا، قرآن دنیا میں دشمنی کا پیام نہیں لایا ہے، وہ تو محبت کا پیام لایا ہے، اس لئے محبت کے قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ٹھیک اسی قانون کے مطابق جس کی رو سے عدالت مجرم کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کرتی ہے مسلمان بھی ایسی غیر مسلمان قوموں کے ساتھ کوئی تعلق محبت، اعانت اور نصرت کا نہیں رکھ سکتا جو ان کی دشمن ہوں اس تقسیم کے رو سے آپ کے سامنے ترک موالات کا مسئلہ واضح طور پر آگیا۔۔۔ گزشتہ پانچ سال کے اندر دنیا میں وہ واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں، جنکے بعد برٹش گورنمنٹ مسلمانوں کے مقابلہ میں فریق محارب ہو گئی ہے، یعنی لڑنے والی فریق ہے میں نے "فریق محارب" پر زور دیا ہے، بہت سے لوگ یہاں محارب اور غیر محارب پر زور نہیں دیتے۔ میں نے غیر محارب اور محارب پر زور دیا ہے۔ برٹش گورنمنٹ اسلام اور مسلمانوں کے مقابلہ میں ازروئے شریعت فریق محارب ہو گئی ہے اس لئے بموجب اسی نص قطعی کے اور بموجب گیارہ سے زیادہ آیتوں اور اسلام کے قانون کے مسلمانوں کے لئے یہ حرام اور ناجائز ہو گیا، فسق ہو گیا، نفاق ہو گیا، قریب قریب کفر ہو گیا ہے کہ وہ برٹش گورنمنٹ سے اپنی استطاعت کے اندر محبت و اعانت و فاداری و اعانت کا کوئی تعلق رکھیں، اور اگر وہ کوئی تعلق اسطرح کا رکھیں گے تو ایک منٹ کے لئے بھی ان کو یہ حق نہ ہو گا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کی صف میں جگہ دیں قرآن نے کہا ہے کہ جو مسلمان ایسے وقتوں میں الیسی حالتوں میں اس محارب قوم کے ساتھ اور اس کے شرکاء کے ساتھ رشتہ موالات کا رکھتا ہے، اگر وہ زمین پر اپنے آپ کو مسلمان کہے لیکن اللہ کے نزدیک اس کا شمار مومنوں میں نہ ہو گا، کفار میں ہو گا۔

آج بھی میں یہ اعلان کرتا ہوں کیونکہ صلح کی خبریں اڑ رہی ہیں، ہر مسلمان کے دل پر یہ حقیقت نقش ہے اور ہونا چاہیئے کہ جب تک انگریزی گورنمنٹ اپنے اس ابلیسانہ گھمنڈ سے باز نہ آجائے، مسلمانوں کے مطالبات شرعی کو پورا نہ کردے عراق

کی سرزمین اس کی مداخلت سے پاک نہ ہو جائے۔ ایشیائے کوچک میں اس کی کوئی طاقت مخالفت نہ کرے قسطنطنیہ سے تمام شرائط اور پابندیاں اٹھا نہ لی جائیں، ہندوستان کو آزادی نہ دی جائے اس وقت تک انگریزی گورنمنٹ مسلمانوں کے مقابلہ میں فریق محارب ہے، اگر مسلمانوں کے دل میں ایک آخری چنگاری بھی ایمان کی باقی ہے تو کسی مسلمان کیلئے جائز نہیں ہے کہ وہ صلح یا صفائی کا ہاتھ انگریزوں کی طرف بڑھا سکے مسلمان اپنے ان آباد شہروں کو چھوڑ دے، جنگلوں میں چلا جائے، وہاں سانپوں کے ساتھ صلح کرے، بچھوؤں کے ساتھ صلح کرے، مگر انگریزی گورنمنٹ کے ساتھ صلح نہیں کر سکتا۔

لیکن ہاں جس آن اور جس لمحہ حالات میں تبدیلی ہو جائے حالات پلٹ جائیں، جو فریق محارب ہے، وہ فریق محارب نہ رہے، بلکہ اس حکم میں آجائے جس کو تم سن چکے ہو، یعنی جن لوگوں نے مسلمان سے قتال نہیں کیا ہے، ان کی آبادیوں پر قبضہ نہیں کیا ہے، اُن کو دیس نکالا نہیں گیا ہے، اور یہی نہیں کہ خود ظلم نہ کیا ہو، بلکہ دوسروں کو بھی ظلم پر نہ ابھارا ہو۔ جس آن برٹش گورنمنٹ میں یہ تبدیلی ہو جائے گی، حقیقی تبدیلی آجائے گی دھوکے کی نہیں، جس میں چالیس سال سے ہندوستان الجھا ہوا ہے، بمجرد حالات کی تبدیلی کے حکم بھی بدل جائے گا، اور مسلمانوں میں سے ہر فرد تیار ہو گا کہ صلح اور اتفاق کا ہاتھ بڑھائے، لیکن جب تک گورنمنٹ فریق محارب ہے۔ خلافت کے مطالبات پورے نہیں کرتے جب تک ہندوستان کو پسے اور حقیقی معنوں میں سوراج نہیں دیتی یعنی کوئی نئی اور کسی قدر ترقی یافتہ ریفارم کی اسکیم نہیں بلکہ سوراج، جس وقت تک انگریزی گورنمنٹ ان تمام امور کو پورا نہیں کرتی، اس وقت تک مسلمانوں کے لئے اسکا وجود اس کے ایجنٹوں کا وجود، اس کے گورنروں کا وجود، اس کی عدالتوں کا وجود، ظلم و ستم کی کارروائیاں ہیں، ان کا وجود لڑنے والوں کا وجود ہے، مسلمان کے لئے ممکن ہے کہ وہ بچھوؤں کو ہتھیلی پر رکھ دودھ پلائے، مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ انگریزوں کے ساتھ صلح کرے

لیکن جیسا میں نے عرض کیا، یہ ایک ضمنی حقیقت تھی، اصل مسئلہ جس پر میں گامزن فرسائی کر رہا ہوں، یہ تھا کہ ہندوستان کی نجات کے لئے ہندوستان میں مسلمانوں کے بہترین فرائض کے انجام دینے کے لئے ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے، یہ میرا عقیدہ ہے، جس کا اعلان ۱۹۱۱ء میں الہلال کے پہلے ہی نمبر میں کر چکا ہوں، میں امید کرتا ہوں کہ ایسے لوگ موجود ہونگے جنہوں نے الہلال کو فراموش نہ کیا ہوگا۔ الہلال کے پہلے نمبر میں جس بڑے نمایاں مقصد کا اعلان کیا گیا تھا، کیا تھا، میں فخر کے ساتھ اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہندو مسلمانوں کا اتفاق تھا۔ میں نے مسلمانوں کو دعوت دی تھی کہ احکام شرعی کی رو سے مسلمانوں کے لئے اگر کوئی فریق ہو سکتا ہے جو نہ صرف ایشیا کو، مشرق کو، بلکہ اس تمام کرہ ارضی کی سچائی کو چیلنج دے رہا ہے اس کو مٹا رہا ہے جس کے غرور سے اللہ کی عالمگیر صداقت کو سب سے بڑا خطرہ ہے وہ برٹش گورنمنٹ کے سوا کوئی دوسری طاقت نہیں ہے، اس لئے مسلمانوں کا فرض ہے کہ احکام شرع کو سامنے رکھ کر حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھ کر جو انھوں نے اہل مدینہ اور بت پرست لوگوں سے مصالحت کرتے ہوئے عملاً پیش کیا ہے اور عملاً و حکماً جو تعلیم قرآن نے دی ہے ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض شرعی ہے کہ ہندوستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ پیمان محبت باندھیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک نیشن ہو جائیں۔

پہلے میں ایک لفظ لکھوں گا اپنا، اور اس کے بعد آپکو ایک لفظ سناؤں گا ایک دوسری زبان کا، میرے الفاظ یہ تھے کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان، ہندوستان کے بائیس کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں ہندوستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں اب میں مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے وہ محمدؐ کی آواز تھی، اس وجود مقدس نے عہد نامہ لکھا، بجنسہ یہ اسکے الفاظ ہیں، ہم ان قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں صلح کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب

مل کر ایک "اُمۃ واحدہ" بننا چاہتے ہیں "اُمۃ" کے معنی ہیں قوم اور نیشن اور واحدہ کے معنی ہیں ایک۔

اگر میں نے اپنی اپیل میں کہہ دیا کہ ہندوستان کے مسلمان اپنا بہترین فرض اسی وقت انجام دینگے، جب وہ ہندوؤں کے ساتھ ایک ہو جائیں گے تو یہی وہ لفظ ہے جو اللہ کے رسول نے بھی اسوقت لکھایا تھا کہ ہم سب مل کر قریش کے مقابلہ میں ایک نیشن ہو جائینگے جن مقاصد کی بنا پر جناب سرور کائنات نے یہ عہد کیا تھا اس سے زیادہ وجوہ آج آپکے لئے موجود ہیں اگر اسوقت صرف قریش مکہ کی ایک جماعت تھی، جو اسلام کی غربت میں دھمکی دے رہی تھی، تو آج اس غربت ثانیہ میں صرف مٹھی بھر قریش نہیں بلکہ کرۂ ارضی کی وہ تہائی بسنے والی قومیں اسلام کو ہٹانا چاہتی ہیں۔ اگر رسول خدا مٹھی بھر قریش مکہ کے مقابلہ میں ابوسفیان کے مقابلے میں، اطراف مدینہ کے تمام قبائل سے اتفاق کر سکتے تھے تو آج اس عظیم الشان قوت کے غرور، گھمنڈ، خونخواری کے مقابلے میں جو تمام مشرق کی آزادی کو پامال کرنا چاہتی ہے، کیا ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض نہیں ہے کہ اپنے بائیس کروڑ ہندوؤں کیساتھ ملکر ایک ہو جائیں

بہرحال ہندو مسلمانوں کے اتفاق کے سلسلہ میں آپکے سامنے میں یہ حقیقت لانا چاہتا تھا کہ اگر مسلمانوں نے محبت کا ہاتھ، رفاقت کا ہاتھ، ایک جہتی کا ہاتھ اپنے ہمسایوں کی طرف بڑھایا ہے، تو ان کا یہ عمل، محض کوئی وقتی اور دفاعی نہیں ہے، پولیٹیکل چال نہیں ہے، بلکہ یقین کرنا چاہیے کہ مسلمانوں نے محبت کا آغوش خود نہیں کھولا ہے بلکہ ان کے خدا نے ان کے قوانین شریعت نے کھلوایا ہے، چونکہ بنیاد شریعت پر ہے، اس لئے عزیزان من، آج ترک موالات کے سلسلہ میں نہیں بلکہ بیس تیس سال پیشتر بھی میرا یہی اعتقاد تھا، دوستو! میں اپنی زندگی کا اگر کوئی کام سمجھتا ہوں تو مجھے یقین ہے کہ میں ہندوستان کے ان انسانوں میں ہوں، جن کو خدا نے کتاب اللہ کی طرف بلایا ہے، میں اپنے لئے کوئی خدمت سمجھتا ہوں تو وہ صرف یہی ہے کہ کتاب اللہ کی طرف انسانوں کو بلاؤں، مسلمان اپنے ہندو

بھائیوں سے تمام کاموں میں الگ تھے، علی گڑھ کی پالیسی جو سلمہ قومی پالیسی سمجھی جاتی تھی کہ وہ ہندوؤں سے علیحدہ رہیں، میں نے دعوت دی کہ اگر مسلمان ہندوستان کی زندگی میں بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنے عظیم الشان فرائض انجام دینا چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہونا چاہیے کہ اتفاق کا قدم بڑھائیں اور بائیس کروڑ ہندوؤں کے ساتھ ایک ہو جائیں، مسلمانوں کے لئے ایسا کرنا ایک مذہبی عمل تھا۔

بہرحال موضوع شب یہ تھا کہ تحریک خلافت نے اندرونی میدان میں دوسری صورت سے جو فتحیابی حاصل کی ہے وہ یہ ہے کہ تحریک خلافت کی بدولت ہندوستان کی آزادی کا سویا ہوا احساس اس قوت کے ساتھ جاگ اٹھا کہ آج اس کا غلغلہ دنیا میں ہے۔

اب تیسری منزل کون ہے اس میدان کی؟ وہ تیسری منزل فی الحقیقت نہایت فیصلہ کن منزل ہے، تحریک خلافت نے ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ کو پنجاب کے مسئلہ کو زندہ کر دیا تھا۔ اب ضروری تھا کہ اس کے لئے کوئی مذہبی شاہراہ عمل ہوتی اور آپکے سامنے کھولی جاتی خلافت کمیٹی نے احکام شرع کے ماتحت فیصلہ کیا کہ ترک موالات، مسلمانوں کے فرائض میں سے ہے، بدبختی سے جہاں مسلمانوں نے اپنے تمام مسائل کو ترک کر دیا ہے، یہ مسئلہ بھی فراموش کر دیا تھا، اس لئے ضرورت تھی کہ اس مسئلے کو زندہ کر دیا جائے۔ خلافت کمیٹی نے یہی کیا سب سے پہلے ترک موالات کا اعلان کلکتہ کے اس اجلاس میں ہوا جو فروری سنہ ۱۹۲۰ء کو ٹاؤن ہال میں ہوا تھا، اور میں اس کا صدر تھا، سب سے پہلے اس کی تحریک وہاں کے خطبۂ صدارت میں کی گئی تھی، اس کے بعد دہلی میں دوسری مرتبہ سربرآوردہ ہندو مسلمانوں کا اجتماع ہوا کہ اس مسئلے کو بحیثیت قوم کے ہم اختیار کر سکتے ہیں، اس سب کمیٹی میں بھی، جس میں مہاتما گاندھی، حکیم اجمل خاں اور میں تھا یہ طے پایا تھا، کمیٹی سے میں نے کہا کہ بحث کی ضرورت نہیں، سب کو معلوم ہے کہ یہ چیز جو ہمارے سامنے آرہی ہے تیرہ سو سال سے موجود ہے، میں نے کہا کہ آپ اپنی رپورٹ تیار کیجئے، اسکے بعد میرٹھ میں

اس صوبے کا پہلا جلسہ ہوا اور اس میں مہاتما گاندھی نے اس تحریک کے مختلف اجزا کو پیش کیا اور جو لوگ موجود تھے وہ تصدیق کریں گے کہ ہاں بھی میں نے اعلان کیا تھا کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ یہ پہلی اپیل ہے، بلکہ فی الحقیقت یہ چیز تیرہ سو برس سے مسلمانوں کے یہاں موجود ہے، اور بحیثیت مسلمان ہونے کے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پر عمل پیرا ہوں - اس وقت اس مسئلے کے عمل میں اگرچہ خلافت کمیٹی کے ارکان شریک تھے - مسلم علماء کی جماعت شریک تھی لیکن یہ واقعہ آپ کو یاد ہوگا کہ یہ مسئلہ چونکہ نہایت پیچیدہ شکل میں ملک کے سامنے آیا تھا، اس لئے ہندوستان کی سب سے بڑی جماعت انڈین نیشنل کانگریس نے اس میں شرکت نہیں کی تھی، یہ آخری میدان تھا جس میں ہمیں فتح حاصل کرنا تھی، میں آپکو یاد دلاؤں گا اللہ تعالیٰ کے کرم کو - یہ تیسری منزل بھی سامنے آئی - اور تحریک خلافت نے نہایت کامیابی سے فتح کیا، ایک معرکہ وہ تھا، جو کلکتہ میں گرم ہوا، دوسرا وہ تھا جو ناگپور میں گرم ہوا - اس دوسرے معرکے میں بیس ہزار ہندوستان کے ہندو مسلمانوں نے متفقہ آواز میں، جس میں ایک آواز بھی خلاف نہ تھی، ترک موالات کے ساتھ اتفاق کیا - اور یہ تیسری فتحمندی مسئلہ خلافت کو ہندوستان کے میدان میں حاصل ہوئی -

اب تیسرا میدان جسے آپ ڈھونڈ رہے ہیں وہ بھی اسی ہندوستان کے اندر موجود تھا، جبتک آپ کے اندر خود آپکی قوت واپس نہ آجاتی، جبتک آپ خود اپنے دلوں کے معاملات صاف نہ کر لیتے، جبتک آپکے کاموں میں عمل کی سچی روح نہ پیدا ہو جاتی اسوقت تک آپ دشمنوں کے مقابلہ میں کیا کامیابی حاصل کر سکتے تھے؟

اصلی میدان ہندوستان کا میدان تھا، اندرونی میدان تھا، اصلی فتح و شکست کا فیصلہ ہندوستان کے اندر ہونے والا تھا، اگر آپ اپنے ملک کے اتفاق کے میدان میں ترک موالات کے میدان میں، قربانی کے ولولے کے میدان میں، مختصر یہ کہ ایمان کے میدان میں کامیابی حاصل کر لیتے تو دنیا کی کون سی قوت ہے، جو آپکو شکست دے سکتی تھی؟ اگر آسمان

کی تمام بجلیاں اتر آئیں، ہمالہ کی چٹانیں اپنی صفیں کھڑی کر لیں، تو بھی ایمان کو ایک منٹ کے لئے بھی شکست نہیں دے سکتیں۔ سب سے بڑی ضرورت اسی بات کی ہے کہ آپ سب سے پہلے اپنے دلوں کے میدان کو فتح کر لیں، ایمان کے میدان کو، استقامت کے میدان کو قربانیوں کے میدان کو، ملک کے اتفاق کے میدان کو سر کر لیں، جبتک ان میدانوں کو فتح نہ کر لیتے دشمنوں کے مقابلے میں کیسے بازی جیت سکتے تھے؟

دنیا میں ہر فکر اور عمل کے دو ہی موجب ہیں، ایک موجب امید کا اور ایک یاس اور ناامیدی کا، اگر امید کی روشنی کو سامنے لائیں تو شبہ نہیں کہ تحریک خلافت نے تمام زمانہ گیوں کو دیکھتے ہوئے اندرونی میدان کی ان تینوں منزلوں کو اللہ کے فضل سے کامیابی کے ساتھ طے کیا، اس کے بعد اس نے ایک ایسی جماعت بنی جس سے بڑھ کر ہندوستان کے لئے کوئی ملکی جماعت نہیں ہو سکتی، یعنی انڈین نیشنل کانگریس میں کامیابی حاصل کی یہ اٹھارہ مہینے جو گزر چکے ہیں۔ تحریک خلافت کی کامیابی کا زمانہ ہے۔ یہ شکست کا نہیں یقیناً کامیابی کا زمانہ تھا۔

لیکن اگر اس کامیابی کا نتیجہ یہ ہو کہ آپ کے اندر گھمنڈ پیدا ہو جائے اور آئندہ عمل کی قوت جاتی رہے، تو پھر یہ کامیابی آپکے لئے سودمند نہیں ہو سکتی، ایک موجب امید کا ہے اس کی روشنی میں آپ نے گزشتہ حالات پر نظر ڈالی۔ تم نے دیکھا کہ تحریک خلافت کی کامیابی کی بیل چڑھی۔ ایک دوسرا موجب بھی ہے، وہ ناامیدی اور خوف کا ہے، ایمان دو پروں سے اڑتا ہے، ایک امید کا دوسرا خوف کا، یہ ہماری بڑی ناکامیابی ہوگی کہ گزشتہ کامیابیوں کا تصور کرتے ہوئے آنیوالی کامیابی کو بھول جائیں۔ بیشک تحریک خلافت نے یہ کامیابی حاصل کی، لیکن ان تمام کامیابیوں کیلئے فیصلہ کن منزل وہ ہے، جو تمہارے غفلت سے بھرے ہوئے سروں سے گزر رہی ہے اگر ان گھڑیوں میں ہندوستان کا ہر بسنے والا جس نے گنگا جمنا کی صاف روانی دیکھی ہے

اور ہندوستان کے اس تاروں بھرے آسمان کو سر پہ اٹھائے ہے، ہر ایک کا فرض ہے کہ اس کامیابی کو حاصل کرے اگر اب بھی تمہارے ایمان کے شعلے نہ بھڑکے، تو ان گزشتہ کامیابیوں کا افسانہ ایک منٹ کے لئے منزل مقصود تک نہ پہنچا سکے گا - اب آخری منزل آگئی ہے - آج یا تو ہمیشہ کے فیصلہ کر دوگے یا ہمیشہ کے لئے ناامیدی کے مدفن میں اس تحریک کو دفن کر دوگے - وہ آخری فیصلہ کن گھڑی آپ کے سامنے آگئی وہ کون سی ہے؟ افسوس کہ وقت کوتاہی کر رہا ہے - میں چاہتا ہوں کہ میرے مسلمان بھائیوں کے سامنے یہ آجائے کہ کون سی منزل ان کا انتظار کر رہی ہے؟ جب تک وہ پوری صداقت کے ساتھ اس کا دھیان اپنے سامنے نہ لائیں گے گزشتہ کامیابیاں سودمند نہیں ہو سکتیں -

میں نہیں سمجھتا کہ اس منزل کا نقشہ کن لفظوں میں آپکی آنکھوں کے سامنے سنواروں میں دنیا کی تمام بولیوں سے قطع نظر کر لیتا ہوں اور مسلمانوں کو دکھانا چاہتا ہوں کہ وہ دنیا کے طرح طرح کے اعلانات کی پرستش کر رہے ہیں، مگر انھیں یاد کرنا چاہئے کہ ان کے پاس ایک الہامی اعلان بھی ہے جبتک وہ اس تعلیم کو اپنے سامنے نہ لائیں گے، ان ان کی کامیابی سودمند نہیں ہو سکتی - وہ اعلان قرآن مجید میں جا بجا دہرایا گیا ہے وہ ایک مختصر سبق، دہراتے ہوئے میں خاص طور سے خطاب کروں گا اپنے مسلمان بھائیوں سے اور التجا کروں گا - اپنے ہندو بھائیوں سے کہ وہ خاص اصطلاح سن کر کبیدہ خاطر نہ ہوں، بلکہ اس حقیقت کو ڈھونڈیں کہ جس طرح بہت سے کنول ہیں - مگر روشنی ایک ہے، سرخ رنگ کے کنول سے روشنی سرخ نہیں ہو سکتی خدا کی سچائی ایک ہے اگرچہ طرح طرح کے ناموں میں پیش کی جائے میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ دنیا میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی کامیابی بھی دنیا کا کوئی وجود، کوئی روح، کوئی آتما بلکہ کوئی ذرہ اس آسمان کے نیچے نہیں پا سکتا، جب تک وہ اس پروگرام پر عمل نہ کرے

جو قرآن نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

قرآن نے اس بارے میں نہایت تفصیل سے بیانات دیئے ہیں لیکن ایک بہت ہی چھوٹا سا بیان بھی ہے، جس کی نسبت تاریخ اسلام کے ایک بہت بڑے امام نے جن کا نام امام شافعیؒ ہے، کہا تھا کہ اگر قرآن کے صرف یہی چند جملے نازل ہو جاتے تو تمام کرہ ارضی کی ہدایت کے لئے کافی تھے، آپ کی تحریک خلافت، ہندوستان کی آزادی کی تحریک ہے، یہ ایک مقصد ہے، جو فتح چاہتا ہے، عمل چاہتا ہے۔ جو لوگ مقصد اور عمل کے ڈھونڈنے والے ہیں، جو مقصد کے عشق میں آنسو بہانے والے ہیں، تو میں کہنا چاہتا ہوں کہ قرآن کا ہر اچھے مقصد کے لئے یہ اعلان ہے کہ اس آسمان کے نیچے نوع انسان کے لئے، انسانوں کی تلاشوں، جستجوؤں، امیدوں کے لئے بڑی بڑی ناکامیاں ہیں۔ بڑے بڑے گھاٹے ٹوٹے ہیں، لیکن دنیا کی اس عام نامرادی سے کون انسان ہے، کون جماعت ہے، جو بچ سکتی ہے، ناکامیابی کی جگہ کامیابی پا سکتی ہے، ناامیدی کی جگہ امید واراس کے دل میں اپنا آشیانہ بنا سکتی ہے، وہ کون انسان ہے؟ وہ انسان ہے، جو دنیا میں ان چار شرطوں کو تولاً اور عملاً اپنے اندر پیدا کر لے، جب تک یہ شرطیں پیدا نہ ہونگی دنیا میں کوئی قوم کامیاب ہو سکتی ہے نہ ملک۔ حتیٰ کہ ہوا میں اڑنے والا پرندہ بھی دنیا میں کامیابی نہیں پا سکتا۔

ان چار شرطوں کے نام سے گھبرا نہ جانا۔ اگر ایک چیز عربی بھیس میں آ جائے تو کیا تم انکار کر دو گے چاہے وہ پہچانی ہوئی ہو۔

پہلی شرط وہ ہے، جس کا نام قرآن مجید کی بولی میں "ایمان" ہے، تم جب ہی کامیابی پا سکتے ہو، جب تمہارے دلوں کے اندر روح کے اندر وہ چیز پیدا ہو جائے، جس کا نام قرآن کی بولی میں ایمان ہے، عربی میں ایمان کے معنی ہیں زوال شک کے، یعنی کامل درجے کا بھروسہ اور علم، کامل درجے کا اقرار تمہارے دل میں پیدا

ہوجائے، جب تک کامل درجے کا یقین تمہارے دلوں میں نہ پیدا ہو، اللہ کی صداقت پر اللہ کی سچائی پر، اللہ کے اصولوں پر، جس وقت تک کامل درجے کا یقین تمہارے قلب کے اندر پیدا نہ ہوگا۔ کامیابی کا کوئی دروازہ نہیں کھل سکتا شک کا اگر ایک کانٹا بھی تمہارے دل میں چبھ رہا ہے، تو تمہیں اپنے اوپر موت کا فیصلہ صادر کرنا چاہیئے تمکو کامیابی نہیں ہوسکتی سب سے پہلی شرط یہی ہے کہ تمہارے اندر ایمان، یقین، اطمینان، جماؤ، تمکین اور اقرار پیدا ہو۔

لیکن کیا محض دل کا یہ کام، دماغ کا یہ فعل تصور کا یہ نقشہ، کامیابی کو پورا کردیگا؟ نہیں۔ ایک دوسری منزل بھی اس کے بعد آتی ہے۔ جب تک وہ دوسری منزل بھی کامیابی کے ساتھ طے نہ کرلوگے، اس پہلی منزل کو طے کرکے کامیابی نہیں پا سکتے اس دوسری منزل یا شرط کا نام قرآن مجید کی بولی میں "عمل صالح" ہے یعنی وہ کام جو اچھا ہے، جسے اچھائی کے ساتھ کرنا، سچائی اور صحیح طریقے سے انجام دینا۔

ایمان کے معنی ہیں، وہ یقین، وہ کامل اطمینان، وہ کامل اقرار، جو عمل سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔ جس وقت یہاں اس کانفرنس کی جگہ ایک چٹیل میدان تھا، کوئی وجود اس شامیانے کا نہ تھا۔ صرف تمہاری خلافت کمیٹی کے ارکان تھے، مگر اس وقت بھی یہ شامیانہ ان چمکتی ہوئی لالٹینوں کے ساتھ موجود تھا، کہاں؟ تمہارے ارکان کے دماغ میں! وہ چیز جو ان کے دماغوں میں موجود تھی، وہ ارادہ، جو ان کے ذہن میں پیدا ہوا تھا پہلی منزل ہوئی، جو مذہب میں آکر ایمان کا نام اختیار کر لیتی ہے، پہلی چیز عمل دماغ ہے، عمل تصور و یقین ہے، اس بنا پر سب سے پہلی منزل ایمان کا ہے، پہلی چیز یہ ہے کہ تمہارے دل کے اندر سچا ارادہ پیدا ہو، سچا عزم پیدا ہو، دوسری منزل عمل الصالحات کی ہے، صرف دماغ کی منزلیں طے کرکے قدم نہ رک جائیں، بلکہ عمل بھی کرو، وہ عمل جو صالح ہو، جو صحیح طریقے پر ہو، جب اسکو پورا کرلیا، تو معنی یہ ہوئے کہ فتحمندی اور کامیابی کی دو منزلیں تم نے طے کرلیں۔

مگر کیا تمہارا کام ختم ہو گیا؟ اس کے بعد کیا تم منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے؟ قرآن مجید کی عالمگیر صداقت بتاتی ہے کہ نہیں، دو منزلوں کے بعد دو منزلیں اور باقی ہیں۔ اپنی ہمت کو آزماؤ کہ ان کے لئے تمہارے تلوے تیار ہیں یا نہیں؟ تمہاری کمر ہمت مضبوط ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو ممکن ہے کہ دو منزلیں تمہارے لئے سود مند نہ ہوں، وہ دو منزلیں یہ ہیں: قرآن مجید نے فرمایا کہ ایمان اور عمل صالح آدمی کے اندر پیدا ہوا۔ یعنی یہ ہوا کہ انسانیت کی جو ایک زنجیر ہے، اس کی ایک کڑی نے اپنے آپ کو درست کر لیا۔ لیکن کیا ایک کڑی کے درست کر لینے کے بعد زنجیر کا پورا کام ہو گیا۔ ہرگز نہیں۔ تم کیا ہو؟ افراد کا مجموعہ بکھری ہوئی کڑیوں کا ڈھیر قرآن کا وجود ماننا ہے اجتماع کا، قوم کا، اس کے نزدیک وجود کڑیوں کا نہیں، بلکہ زنجیر کا ہے تم میں سے ہر وجود ایک کڑی ہے۔ اس کا کام پورا نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ باقی کڑیوں کی خبر نہ لے۔ جب تک باقی کڑیاں مضبوط نہ ہوں گی۔ زنجیر مضبوط نہیں ہو سکتی۔ اس لئے فرمایا کہ کامیابی کا سفر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جب تک تیسری منزل تمہارے سامنے نہ آئے۔ وہ تیسری منزل فصیح و بلیغ لفظوں میں: تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ہے۔ یعنی تم جو ایک کڑی تھے تم نے ایمان کی مضبوطی سے اسے سنوار لیا، لیکن تمہارا کام ختم نہیں ہوا، تمہارا فرض ہے کہ دوسری کڑیوں کو بھی درست کرو، اور انھیں اس طرح درست کر سکتے ہو کہ جس سچائی کو تم نے اپنایا ہے اسے دوسروں میں بھی پھیلاؤ۔ جب تک تم میں یہ بات نہ ہو گی کہ تمہارا دل سچائی کے اعلان کے لئے تڑپنے لگے۔ جب تک تم تواصی حق نہ کرو گے اس وقت تک کامیابی تمہیں مل نہیں سکتی۔

لیکن اگر اس تیسری منزل کے لئے تم تیار ہو گئے، اگر توفیق الٰہی نے تمہاری دستگیری کی تو پھر آخری منزل کون ہے؟ وہ منزل وہ ہے، جو صبر کی منزل کے

لیے لازم و ملزوم ہے اس کے ساتھ اس کی گردن اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ جدا نہیں کی جا سکتی فرمایا حق کی وہ تواصی کریں گے حق کا پیام سنائیں گے۔ حق کی دعوت پہونچائیں گے۔ مگر حق کا یہ حال ہے کہ اس کی راہ میں کوئی قدم نہیں اٹھ سکتا، جب تک وہ قربانیوں کے لیے بھی نہ اٹھے۔ فرمایا کہ صرف حق کا پیام ہی مومن نہ پہونچائے بلکہ صبر کا بھی پہونچائے۔

تم نے اپنی بدبختی سے نہ صرف شریعت کے حکم کو بدلا ہے، بلکہ اپنے طریق عمل سے شریعت کے لفظوں کو، لغتوں کو بھی بدل ڈالا ہے صبر کے معنی کیا ہیں؟ تم سمجھتے ہو کہ صبر کے معنی ہیں بے عزتی اور باطل کی پرستش اور پوجا۔ تم صبر کے معنی یہ سمجھتے ہو۔ لیکن جو شخص صبر کے یہ معنی سمجھتا ہے، اس سے بڑھ کر قرآن مجید کی تحریف لفظی کرنے والا کوئی نہیں اگر صبر کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے حق کے مقابلہ میں مصیبت آ جائے، تو تم صبر کے گوشے میں پناہ لو۔ یعنی ہر طرح کی بے عزتی کو، بے چارگی کو، باطل پرستی کو، قبول کر لو، تو میرے بھائیو! تم سے بڑھ کر قرآن کی تعلیم کو بدلنے والا کوئی نہیں۔

صبر کے معنی اس سے بالکل مختلف ہیں صبر کے معنی ہیں برداشت کے، جھیلنے کے، عمل کے، جو تم مقصد کی راہ میں، اپنے محبوب اور پیارے مقصد کے لیے اٹھاؤ اور اس میں طرح طرح کی مصیبتیں آئیں، طرح طرح کی ڈراؤنی صورتیں آئیں، زنجیریں، اور ہتھکڑیاں آئیں، بلکہ ممکن ہے کہ تمہارے سامنے تختہ آئے اور اس پر ایک پھندا جھول رہا ہو،

یہ سب تمہارے سامنے آ سکتا ہے لیکن اگر تم حق کے پرستار ہو تو تمہارا فرض ہونا چاہئے کہ تمہارے اندر صبر ہو، تمہارے اندر برداشت کی وہ اٹل طاقت، برداشت کا وہ پہاڑ موجود ہو جس پر دنیا کی کوئی شوکت، کوئی تاج و تخت فتحیاب نہ ہو سکے۔

یہ معنی صبر کے ہیں۔

مقصد یہ تھا کہ قرآن مجید نے جو صداقت بنی نوع انسان کے آگے کامیابی کے لئے پیش کی ہے۔ اب سے تیرہ سو برس پیشتر جو ایک اٹل اور لازوال پروگرام بنا دیا ہے۔ یہ اس کی چار دفعات ہیں۔ اگر وہ کوئی سفر ہے، تو یہ اس کی چار منزلیں ہیں۔ کیا تم دنیا میں کوئی کامیابی بلا ایمان کے پا سکتے ہو؟ کیا تم شک کا روگ اپنے پہلو میں لے کر دنیا کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی کامیابی پا سکتے ہو؟ کیا تم دنیا میں ایک مٹھی جو اور چاول بھی پا سکتے ہو، جب تک تمہارے اندر طلب کے لئے سچا جذبہ نہ ہو، کیا ایک لمحہ کے لئے دنیا کی کوئی کامیابی اپنا چہرہ تمہیں دکھا سکتی ہے۔ جب تک حق کی راہ میں قربانی چڑھانے کو تیار نہ ہو۔ خدا کی اس کائنات میں ایک ایک ذرہ کے اندر اس حقیقت کی عالمگیر تصدیق موجود ہے کہ اس دنیا میں کامیابی کا کوئی چہرہ نہیں دیکھ سکتا، جب تک وہ ایمان، حق اور صبر کی منزلوں سے نہ گزرے اللہ کا ہر قانون ہر اڑنے والے پرندے کے لئے بھی ہے۔ کیا خدا اپنا قانون تمہارے لئے بدل دے گا؟ کیا تمہاری غفلتوں کا ساتھ دیگا؟ اگر تم اپنی غفلت کی وجہ سے اس کے دھوکے میں پڑے ہوئے ہو تو تم سے بڑھ کر اپنی موت کی طرف جانے والا کوئی نہیں۔

میرے دوستو، آج ہمارا پہلا فرض یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنی گزشتہ کامیابیوں کے افسانے نہ دہرائیں، بلکہ ہر شخص اپنے عمل کا احتساب کرے اور اپنے دل سے پوچھے کہ کیا واقع اس کے دل کے اندر ایمان کا بجھا ہوا چراغ روشن ہو گیا ہے؟ کیا واقعی اس کے اندر عمل صالح پیدا ہو گیا ہے اور کیا واقعی اسکے اندر حق پیدا ہو گیا ہے؟

اس پروگرام میں آخری منزل قربانی کی ہے اسی منزل کے چند ہفتوں بلکہ اس کے چند دنوں کے اندر تمہارے ہندوستان کی آزادی اور مسئلہ خلافت کی پوری قسمت

پوشیدہ ہے۔ اگر اس منزل کے لئے تیار ہو۔ تو اللہ کی کامیابی بھی تمہارے استقبال کے لئے تیار ہے۔ مگر ایمان ہمارے اندر پیدا نہیں ہوا ہے۔ اگر اب تک ہمارا دل شک سے خالی نہیں ہے۔ اگر ہمارے دل میں حق کا یہ پہلا سبق بھی پیدا نہیں ہوا ہے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں، اگر سچ ہے تو ضرور کامیابی ہوگی اور دنیا کی ساری طاقتوں کے مقابلہ میں ہم فتحمند رہیں گے۔ اگر اللہ کی چوکھٹ سے بھاگے ہوئے سر اس کے آگے پھر نہ جھکے ہوں، تو پھر کون سی شے ہے جو تمہاری چوکھٹ پر آئے گی اور تمہاری کنڈی کھٹکھٹائے گی۔ اگر اب بھی تم ایمان، تواصی بالحق، عمل صالح اور قربانی کے لئے تیار نہیں ہو تو تم کو حق نہیں کہ خدا کی زمین پر کامیابی کو ڈھونڈو۔

حضرات! جس طرح یہ شرائط جن کو نہ اول کہا جا سکتا ہے۔ نہ آخر، ہر حال میں جس طرح آپ کے لئے ضروری ہیں، اسی طرح آپ کو خبردار ہونا چاہیئے کہ آپنے جو عمل ترک موالات کا شروع کیا تھا، اس کی منزلیں جب تک آپ کامل ایمان، عمل صالح اور کامل قربانی کے ساتھ انجام نہ دیں گے۔ باقی منزلیں آپ کے سامنے نہیں آسکتیں۔ جب کوئی مقصد کسی کے سامنے رکھا جاتا ہے، تو وہ پوچھتا ہے کہ اس کا انعام کب ملے گا؟ وہ اطاعت فرض کے معاملے کو دوکانداری بناتا ہے، وہ پوچھتا ہے، نتیجہ کب نکلے گا؟ لیکن فرض اس امر کا محتاج نہیں کہ نتیجہ کب اور کیا پیدا ہوگا۔ اگر فرض فرض ہے تو تمہیں چاہیئے کہ پورا کرو۔ نتیجہ پر غور کرنا تمہارا کام نہیں، دنیا میں بیج ہے، زمین ہے، انسان ہے، اور اس دنیا پر خدا بھی ہے، کیا تم خدا کا کام، خدا کی زمین پر کر سکتے ہو تم یہ کر سکتے ہو کہ تمہاری جھولی میں جو دانے ہیں زمین کے سپرد کر دو اور پھر خدا وہ ہے جو اپنی رحمت کو بھیجتا ہے اور اپنے بادل کو برساتا ہے، اور جو بیج تم نے زمین کے سپرد کردیا ہے اس کو بار آور کرتا ہے، تمہارا فرض ہے کہ دیکھو، زمین صالح ہے، دانہ سچا ہے اگر تمہارے ایمان کا دانہ سچا ہے اور اپنے دل کی جس سرزمین میں ڈالا ہے۔ وہ سرزمین

شور نہیں ہے تو ضرور ہے کہ وہ دانہ، زمین کے پردے کو چاک کرے گا اور اپنی کامیابی کا سر نکالے گا۔

پس دوستو، یہ نہ دیکھو کہ تحریک خلافت اور ترک موالات کے سلسلہ میں جو کام درپیش ہیں، وہ تحریک کے لئے کہاں تک مفید ہیں۔ تمہارا یہ فرض نہیں ہے کہ تم ان کاموں کو اختیار کرو جو تحریک کے لئے مفید ہیں، بلکہ تمہیں چاہئے کہ وہ کام کرو جو تمہارا فرض ہیں قربانی کی جو پہلی منزل تھی جب تک قدم اس سے نہ بڑھ جائیں۔ قربانی کا دعویٰ مانا نہیں جاتا۔ میں کہتا ہوں کہ میری طرف نہ دیکھو اپنے گریباں کی طرف دیکھو۔ وہ کپڑا جو تمہارے جسم پر ہے، وہ باریک ململیں جو تم نے اپنے جسموں پر پہنی ہیں، ان سے تم بڑی خدمت اپنے دشمنوں کی انجام دے رہے ہیں ـــــ تمہارے ملک سے نوے کروڑ روپیہ ہر سال ان کپڑوں کے ذریعہ ان خزانوں میں جاتا ہے جو سال سے اسلام کو مٹانے میں صرف ہو رہا ہے ترک موالات میں اس سے بڑھ کر اور کون مسئلہ ہو سکتا تھا؟ تمہارے عمل کے لئے یہ علت نہیں ہو سکتی کہ تم دوسروں کو کتنا نقصان پہنچا سکتے ہو تمہارے لئے سچا اصول یہ ہے کہ تم اپنے دل کو کتنا فائدہ پہنچا سکتے ہو، تمہاری کامیابی کے لئے خلافت کے لئے، سوراج کے لئے پہلی چیز یہ تھی کہ ملک میں قربانی کا ولولہ پیدا ہو، مقصد کے لئے، ملک کے لئے، حق کے لئے تکلیف اٹھانے کا ولولہ پیدا ہو، اس لئے ضرورت تھی کہ قربانی کا سبق آئے جو سبق تمہارے سامنے آیا، وہ جان، گردن اور رگوں کا نہ تھا محض ان کپڑوں کا تھا، اگر اسے تم کامیابی کے ساتھ طے نہیں کر سکتے، اگر تمہارے دل میں اتنا عشق نہیں کہ تم ان باریک کپڑوں کو چھوڑ کر موٹے کپڑے پہن سکو تو کیا تمہارے دل میں یہ حوصلہ آسکتا ہے کہ تم خدا کی زمین پر پسینہ کی ہمت کرو؟ جب تک غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ کی منزل طے نہیں کرو گے قربانی کی منزل تمہارے سامنے نہیں آسکتی۔

۳۰ دسمبر کا زمانہ خلافت کمیٹی نے اس کے لئے قرار دیا تھا۔ مگر ہماری کامیابیوں کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی دردانگیز داغ نہیں ہو سکتا کہ ۳۰ دسمبر کی صبح اور ہماری

غفلت پر رو کر چلی گئی، اب تک وہ لباس موجود ہے جس کی وجہ سے ہندوستان غلام بنایا گیا جس کے ذریعے ہندوستان کے بہترین مقاصد پامال کئے گئے۔ کیا ہم کو حق پہنچتا ہے کہ ہم کہیں، اپنی جانوں کو قربان کرنے کے لئے ہم تیار ہیں؟ ہم میں سے ہر مسلمان اور ہندو کا سب سے بڑا، پاک اور اشرف فرض ہے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو اس معاملے کو کامیابی تک پہنچائے جبتک یہ منزل طے نہ ہوگی اور کوئی منزل ہمارے سامنے نہیں آسکتی، خاص کر مسلمانوں کے لئے ایک بڑا کام جوان کے جسم کی قربانی سے تعلق رکھتا ہے یہ ہے کہ وہ ان باریک کپڑوں کو جو منچسٹر اور لنکاشائر سے آتے ہیں اور ان کے ملک کو تباہ کر رہے ہیں اتار دیں اور اپنے لئے جائز نہ رکھیں۔

دوسرا کام ان کے لئے اس قسم کی قربانی کے ساتھ جو میں پیش کرتا ہوں، وہ مال کی قربانی ہے، جس کے لئے آج تیرہ سو برس سے پکارا جا رہا ہے کہ اپنی جانوں کو اور مال کو سچائی کی راہ میں قربان کرو۔ اگر آج مسلمانوں کے دل میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ سمرنا میں اپنے دشمنان اسلام کے مقابلہ میں اپنی لاشیں تڑپائیں اگر آج مسلمانوں کی قسمت میں یہ دولت نہیں لکھی ہے تو کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہ وہاں کے مسلمان بھائیوں کی روپیہ سے بھی مدد نہ کریں۔ ہندوستان کا کوئی مسلمان اپنے آپ کو مسلمان کہلانے کا حق نہیں رکھتا جب تک وہ زیادہ سے زیادہ اپنے مال کو حکومت انگورہ اور مجاہدین انگورہ کی اعانت کیلئے قربان نہ کر دے۔

٥ خلافت تحریک شباب پر تھی
مدرسہ عالیہ (کلکتہ) کے طالبعلموں
نے مل کر مدرسہ اسلامیہ کی
بنیاد ڈالی۔ اس کا افتتاح مہاتما
گاندھی نے کیا۔ اس موقع پر
مولانا آزاد نے مہاتما گاندھی
کو مخاطب کر کے یہ تقریر کی۔

مدرسہ اسلامیہ کا قیام

مہاتما جی! آپ نے ہندوستان کے مختلف مقامات میں ترک موالات کا جوش دیکھا ہے۔ بہت سے کالجوں اور اسکولوں سے طلبہ کا مقاطعہ ملاحظ کیا ہے۔ اور پھر بہت سی افسوسناک عہد شکنیاں بھی دیکھی ہیں۔ میں ان رنج دہ واقعات کا ذکر نہ کر ونگا۔ جو بھاگلپور اور علی گڈھ میں ہو چکے ہیں، تاہم اتنا ضرور کہونگا کہ اس وقت طلبا کی جو جماعت آپ کے سامنے ہے اور جس کی آنکھیں آپ کے چہرے پر گڑی ہوئی ہیں یہ وہ جماعت ہے جس نے جو عہد اول دن کیا تھا، اب تک اس پر پوری طرح قائم ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جس نے دین کو دنیا پر ترجیح دی ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جس نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کی شاندار عمارت اور اس کے عالی شان ہوسٹل کو، جس میں بہتر ین سامان آرائش اور آسائش مہیا تھا، محض احکام الٰہی کی پابندی اور سچے ہندوستانی کی حیثیت سے چھوڑا ہے۔ اور اس طرح وہاں سے نکلی ہے کہ اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ کہاں جا رہی ہے اور کہاں رہے گی! یہ وہ جماعت ہے جس نے ترک موالات کی راہ میں ہر طرح کی تکالیف برداشت کی ہیں بھوک پیاس کی سختی جھیلی ہے۔ اور جاڑے کی یہ طویل راتیں ٹھنڈی زمین پر گزاری ہیں اور اب تک گزار رہی ہے، کیونکہ سونے کے لئے اب تک اس کے پاس چارپائیاں نہیں ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ جس مدرسہ میں آپ اس وقت موجود ہیں، اس کی تاسیس بافضل ترکِ موالات کے سلسلہ میں ہوئی ہے۔ مگر اس کا خیال

عرصہ سے میرے ذہن میں تھا اور میں مدت سے خیال کر رہا تھا کہ عربی تعلیم کو جو صرف صوبہ بنگال ہی میں سرکاری غلامی میں ہے، آزاد کراؤں، چنانچہ اس کے متعلق اس کے متولیوں سے بارہا گفتگو ہوئی، یہاں تک کہ بالآخر یکم ربیع الاول کو اس کی تجدید ہوگئی۔ میں نے تجدید کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ یہ مدرسہ اس وقت سے قائم ہے۔ جب سے جامع مسجد بنی ہے۔ البتہ اپنی اس نئی زندگی میں اسے مکتب کے درجہ سے ہٹا کر اعلیٰ تعلیم گاہ کی حیثیت پیدا کر دیا گیا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر آپ کو اس جماعت کی ایک ممتاز خصوصیت کی طرف توجہ دلواؤں۔

ہندوستان میں سرکاری تعلیم نے جو نقصانات ہمارے قومی خصائص و اعمال کو پہنچائے ہیں، ان میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ تحصیل علم کا مقصد اعلیٰ ہماری نظروں سے محجوب ہو گیا ہے، علم، خدا کی ایک امانت ہے۔ اور اس کو صرف اس لئے ڈھونڈھنا چاہئے کہ وہ علم ہے۔ لیکن سرکاری یونیورسٹیوں نے ہم کو ایک راہ بتلائی ہے وہ علم کا اس لئے شوق دلواتی ہے کہ بلا اس کے سرکاری نوکری نہیں مل سکتی۔ پس اب ہندوستان میں علم کو، علم کے لئے نہیں بلکہ معیشت کے لئے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ بڑی بڑی تعلیمی عمارتیں۔ جو انگریزی تعلیم کی نو آبادیاں ہیں۔ کس مخلوق سے بھری ہوئی ہیں۔ مشتاقان علم اور شیفتگان حقیقت سے؟ نہیں، ایک مٹھی گیہوں اور ایک پیالا چاول کے پرستاروں سے جن کو یقین دلایا گیا ہے بلا حصول تعلیم کے وہ اپنی غذا حاصل نہیں کر سکتے۔

لیکن میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ علم کی اس عدم توہین و تذلیل کی تاریکی میں سچی علم پرستی کی ایک ایک روشنی برابر چمکتی رہی ہے۔ یہ ہندوستان کے طالبین علم کی وہ جماعتیں ہیں جو اسلام کے قدیم مذہبی علوم اور مذہبی زبان کے فنون مختلف عربی

مدرسوں میں حاصل کر رہی ہیں۔ آپ یقین کیجئے کہ بجا طور پر آج صرف یہی ایک جماعت علم
کی سچی پرستار کہی جاسکتی ہے۔ ان لوگوں کو معلوم ہے کہ انگریزی تعلیم وسیلۂ رزق
ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ انگریزی تعلیم کی ڈگریاں لیکر بڑے بڑے عہدوں اور نوکریوں
کے دروازوں میں قدم رکھ سکتے ہیں اور ایک کلرک سے لیکر لارڈ سنہا کی نوکری تک
صرف انگریزی تعلیم ہی مل سکتی ہے۔ ان کو پوری طرح یقین ہے کہ عربی تعلیم کو آج کوئی
نہیں پوچھتا حتیٰ کہ روٹی بھی اس کے ذریعہ نہیں مل سکتی۔ پھر بھی ان کے دلوں میں
ایک مخفی مگر طاقتور جذبہ موجود ہے۔ جو انگریزی کی طرف جانے نہیں دیتا۔ اور اس
کس مپرسی میں عربی تعلیم ہی کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دیتے ہیں۔

یہ جذبہ بجز علم پرستی اور رضائے الٰہی کے اور کوئی دنیاوی غرض نہیں رکھتا
اور اس لئے نہا۔ ہندستان بھر میں علم کو علم کے لئے اگر کوئی پڑھنے والی جماعت ہے تو وہ
عربی مدارس ہی کی جماعت ہو سکتی ہے علی گڈھ کے کسی طالب علم نے کالج نہیں چھوڑا
جب تک دو دو گھنٹہ تک مجھ سے ردوکد کر کے اطمینان نہیں کر لیا کہ سرکاری تعلیم چھوڑنے
کے بعد بھی وہ روپیہ کما سکیں گے حتیٰ کہ بعضوں نے مجھ سے اس کی ذمہ داری بھی طلب کی،
لیکن میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ ان طلبا میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے یہ سوال کیا ہو بلکہ
جس وقت ان کو احکام شرع بتلا دیئے گئے فوراً اطاعت کا سر جھکا دیا گیا اور سب کچھ
چھوڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔

میں نے اس چیز کی طرف آپ کو اس لئے توجہ دلائی ہے کہ جوہر شناس صرف
جوہری ہی ہو سکتا ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ اخلاص اور ایثار کے جوہر شناس
ہیں

○ پراونشل آگرہ خلافت کانفرنس
منعقد ہوئی تو مولانا اس کے
صدر تھے، اس سے قبل ہم انکی
افتتاحی تقریر پیش کر چکے ہیں
اب ذیل میں ان کی اختتامی تقریر
دیجاتی ہے جو مولانا نے
کانفرنس کے آخری دن کی تھی۔

آگرہ خلافت کانفرنس

(اختتامی تقریر)

برادران عزیز! دو دن سے آپ کے صوبے کی مجلس خلافت مختلف جلسوں اور صحبتوں میں اپنے فرائض انجام دے رہی تھی، یہ اس کا آخری جلسہ ہے، میں آپ کے سامنے اس وقت جو چیز آشکارا کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر آپ اس جلسہ کے اختتام کے منتظر تھے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس جلسے کا کام ختم کر چکے ہیں تو میں آپ کے اس گمان کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ جلسے کا کام ختم ہو چکا ہے۔ مگر یہ بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آپ کا کام ابھی تک ختم نہیں ہوا ہے، بلکہ شاید اس وقت تک شروع بھی نہیں ہوا جس قدر کام قول سے تعلق رکھتا ہے، زبانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ تو میں اعلان کرتا ہوں کہ وہ کام پورا ہو چکا ہے

لیکن اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس عالم کے علاوہ ایک دوسرا کام ختم نہیں ہوا۔ بلکہ شاید ابھی شروع بھی نہیں ہوا جہاں تک صداؤں کا تعلق ہے، تم صدائیں سن چکے اور سنا چکے۔ لیکن اب وہ گھڑی آ گئی ہے اور چند لمحوں کے لئے اپنے عمل کا احتساب کرو کہ کتنا تم نے عمل کیا ہے اور کتنے عمل کی منزل سر کرنے کے لئے تم تیار ہو۔

دوستو! مجھے چھوڑ دو کہ وہ دعوت آپ کے سامنے پیش کر دوں، جو آج نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ سچائی کی قدر کرنے والے ہر انسان کے لئے سب سے بڑی دعوت ہے جس دعوت کو میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ کوئی تجویز

نہیں ہے، تجویز ہوتی ہے تو اپنے رسوم کے ساتھ آپ کے سامنے آتی ہے۔ وہ دعوت ہمارا ایک مسلمہ اعتقاد ہے، ایک مسلمہ یقین ہے۔ مذہب کا ایک مسلمہ رکن ہے۔ مذہب کا ایک مسلمہ عمل ہے۔ اور کوئی مسلمان جو ایمان کا دعویٰ رکھتا ہے۔ اس سے مطالبہ کر رہا ہوں کہ یا تو اسے اپنے عمل سے ثابت کر دے اور یا اسلام اور اس کی صداقت کا دعویٰ ہمیشہ کے لئے ختم کر دے وہ اعتقاد، ایمان کے اعتبار سے کوئی نیا اعتقاد نہیں ہے اس وقت کوئی خاص ضرورت نہ تھی کہ میں خصوصیت سے اس کا اعلان کرتا یا اس پر زور دیتا وہ اعتقاد اگرچہ اس وقت سے موجود ہے۔ جب سے دنیا میں انسان موجود ہے اور مسلمانوں کے دلوں اور عمل میں تو وہ اعتقاد تیرہ سو برس سے برابر چلا آرہا ہے۔ ہندوستان میں بھی بارہا اس کا اعلان کیا جا چکا ہے اس لئے کوئی ضرورت نہ تھی کہ خاص طور پر اس کا اعلان کیا جاتا۔

تمہیں معلوم ہے کہ گذشتہ ہفتوں میں گورنمنٹ نے فیصلہ کیا کہ ملک میں جو مختلف نمایاں اشخاص، خلافت اور ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں حصہ لے رہے ہیں ان کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ گورنمنٹ کو اتنا ہی حق حاصل تھا جتنا ہر غرور اور گھمنڈ کا حق حاصل ہو چکا ہے کہ جس شہری کو چاہے زنجیر اور طوق سے تواضع کرے اس کی نہ ہم شکایت کرتے ہیں نہ شکایت کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ یہ گرفتاریاں وہ ہیں جن کا ہم اول وقت سے انتظار کر رہے جن کے متعلق ہمارا یقین ہے کہ جس میدان جنگ میں ہم نے قدم رکھا ہے اس کی آخری منزل طے نہ ہوگی جبتک ان گرفتاریوں کا سلسلہ تمام ہندوستان کے طول وعرض کا احاطہ نہ کرے گا یہی وہ چیز ہے جس کے انتظار میں ہم بے قراری کی صبحیں اور شامیں بسر کر رہے تھے۔

میں اپنی کمزوریوں کو چھپانا نہیں چاہتا۔ یہ میدان خود ہم نے نہیں کھولا ہم اپنے لوگوں کی استطاعت اور صلاحیت کے منتظر تھے، لیکن گورنمنٹ صبر نہ کر سکی

اس نے ایک قدم بڑھایا، اور جس چیز کے ہم بھوکے پیاسے تھے اور جس کی تاخیر ہمارے کاموں کو روکے ہوئے تھی۔ گورنمنٹ نے اس دعوت کا اعلان کر دیا۔

اس دعوت کی اولین راہ یہ تھی کہ گورنمنٹ نے ملک کے ان نمایاں پیشواؤں میں سے چند کو گرفتار کیا۔ جن کے متعلق ملک کا خیال ہے کہ وہ تحریک خلافت کے روح رواں تھے۔ گورنمنٹ نے محمد علی، شوکت علی، مولانا حسین، بعد ڈاکٹر کچلو۔ پیر غلام مجدد، مولانا نثار احمد، جگت گرو سری شنکر آچاریہ جی اور اسی سلسلہ میں مولانا احمد سعید صاحب۔ عبد العزیز صاحب۔ اور دیگر کو یکے بعد دیگرے گرفتار کر لیا۔

گورنمنٹ اگر گرفتار کرنا چاہتی تھی تو گرفتاری کے لئے کسی جرم کی ضرورت نہ تھی۔ دنیا کی ہر قوم و ملک کی تاریخ میں ایک زمانہ آتا ہے جب ملک کا ہر باشندہ ظلم، گھمنڈ اور مادی طاقت کی نظروں میں مجرم بن جاتا ہے اس لئے کہ وہ آزادی چاہتا ہے اور ظلم کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے قوم کی تاریخ میں یہ فیصلہ کن گھڑی ہوتی ہے آج ہندوستان کا کون بدبخت بسنے والا ہے جو گورنمنٹ کی نظروں میں مجرم نہیں ہے؟ اور ہندوستان کا وہ کون مجرم باشندہ ہے جسے اس جرم سے انکار ہوگا

گورنمنٹ کی ہندوستان میں بدبختیوں کی اگر تاریخ لکھی گئی، تو یقیناً اس تاریخ میں سب سے آخری بدقسمتی یہ شمار کی جائے گی کہ گورنمنٹ نے اپنی اس سب سے بڑی سلطنت کو اپنی سب سے بڑی فتح سمجھا، اور غرور سے دیوانی ہو گئی۔

گورنمنٹ نے زندانیان حق کے لئے ایک ایسا جرم انتخاب کیا جو اگر جرم ہے تو صرف محمد علی، شوکت علی، حسین احمد کا نہیں ہے، بلکہ فی الحقیقت سات کروڑ قائلان کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا، بلکہ ہندوستان کے تینتیس کروڑ بسنے والوں کا متفقہ جرم ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ پچھلے دنوں کراچی میں مرکزی خلافت کمیٹی کا ایک جلسہ ہوا تھا اور اس جلسہ میں ایک ایسی تجویز بھی پاس کی گئی تھی جو احکام شرعی کی بنا پر انصاف اور اس کے قدرتی قانون کی بنا پر گزشتہ اٹھارہ مہینے کے اندر بار بار پاس ہو چکی ہے۔ گورنمنٹ نے اسی تجویز کو گرفتاری کی بنیاد قرار دیا ہے۔

اب اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ چیز ہمارے سامنے آتی ہے کہ اگر چند لمحوں کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ اس تجویز میں اسلام کا جو عقیدہ پیش کیا گیا ہے وہ کوئی نیا عقیدہ ہے اور اس کی نئی نمائش ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو کیا گزشتہ اٹھارہ مہینہ کے اندر اس کا بار بار اعلان نہیں ہو چکا ہے؟ اسی قدر نہیں بلکہ کئی سال پہلے بھی اس کا اظہار و اعلان ہو چکا ہے۔

۱۹۱۶ء میں جب گورنمنٹ نے مجھے نظر بند کیا اور گورنمنٹ آف انڈیا نے اعلان کیا کہ یہ شخص، ملک معظم کے دشمنوں سے ساز باز رکھتا ہے۔ تو میں نے ایک چٹھی لکھی تھی اور نہایت تفصیل سے اسلام کے احکام درج کر دیئے تھے جن کی رو سے کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ ایک لمحہ کے لئے بھی برٹش گورنمنٹ کی نوکری کرے۔

میرے الفاظ یہ تھے کہ نہ صرف یہ حرام ہے۔ بلکہ قرآن و حدیث کے قطعی احکام کے بموجب یہ لفظ کافی نہیں کہ حرام ہے بلکہ اسلام اور کفر کا فیصلہ کر دینے والا ہے ہر لمحہ جو ایک بدبخت کے لئے انگریزی جھنڈے کے نیچے گزرے گا۔ وہ اس کے لئے حرام ہے ۱۹۱۶ء میں میں نے چٹھی وائسرائے کے پاس بھیجی تھی۔ اس کی نقل گورنمنٹ آف انڈیا کے پاس موجود ہونا چاہئے۔ کیا کراچی میں اس کی ابتدا ہوئی؟ نہیں۔ اس مسئلہ کا بار بار اعلان ہوتا رہا ہے۔ ۲۸ فروری ۱۹۲۰ء میں جب مسئلہ خلافت کے ابتدائی ایام تھے۔ انہی ایام میں کلکتہ میں خلافت کمیٹی کا جلسہ ہوا

اس کا صدر میں تھا۔ اس مسئلہ میں کراچی کی تجویز سے بھی زیادہ لفظوں میں خصوصیت سے سپاہیوں کو مخاطب کر کے اسلام کے اس عقیدے کا اعلان کیا گیا تھا۔ کہ موجودہ حالات میں چونکہ انگریزی حکومت اسلام کے مقابلہ میں لڑنے والا جتھا ہے، اس لئے کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ برٹش گورنمنٹ کی فوج میں نوکری کرے یا نوکر رکھائے۔

یہ تجویز اور مختلف جلسوں میں بار بار پاس کی گئی۔ بریلی میں جمعیۃ العلماء کا جلسہ ہوا۔ وہاں بھی یہ پاس ہوئی پھر میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ میری انہی انگلیوں سے اٹھارہ مہینوں کے اندر تین جزو سے زیادہ صفحات اس موضوع پر لکھے گئے اور چھپ کر شائع بھی ہو چکے جس کی بارہ ہزار سے زیادہ کاپیاں نکل گئیں۔

اگر یہ جرم ہے تو اسے چھوڑ دو کہ جرم کی تیرہ سو برس کی تاریخ کیسی ہے؟ میں تو تمہارے سامنے اٹھارہ مہینہ کی تاریخ دہرا رہا ہوں۔ جب اس جرم کا یکاریکار کر اعلان کیا گیا۔ دس دس پندرہ پندرہ ہزار آدمیوں نے اپنی ٹولیاں بنا کر اس جرم کا ارتکاب کیا۔ اس وقت گورنمنٹ کے عمال کہاں تھے۔

پس فی الحقیقت اگر گورنمنٹ گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ تو ہم اسے دعوتیں دے رہے تھے کہ کاش وہ گرفتار کرنے کے لئے تیار ہو۔ جس وقت ان گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا، میں سچ کہتا ہوں کہ آرزو پیدا ہوئی کہ یہ گرفتاریاں اچانک شروع ہو کر رک نہ جائیں اور سچ کہتا ہوں کہ اس اٹھارہ مہینے میں مجھ پر کوئی گھڑی ایسی نہ گزری تھی۔ جیسی وہ پاک گھڑی جب گورنمنٹ کی درماندگیاں سامنے آ گئیں۔ اور اب اگر گرفتاریوں کا سلسلہ آگے نہ بڑھے گا تو میرے قلب میں مایوسی کا داغ پڑ جائے گا کہ نمرتدمراد کا یہ ایک دروازہ تھا، جو افسوس کہ کھل کر بند ہو گیا!

گورنمنٹ اگر گرفتار کرنے کے لئے تیار ہے تو اور مجرموں کو چھوڑ دو، ایک

جرم تمہارے سامنے کھڑا ہے، اگر اس عقیدے کی دعوت جرم ہے تو میں نے محض اعلان نہیں کیا، محض دور سے دعوت نہیں دی بلکہ میں نے سپاہیوں سے کہا ہے کہ بارش کی بوندوں کی طرح خدا کی لعنت تم پر برس رہی ہے اگر لعنت سے بچنا چاہتے ہو تو انگریزی راج کی غلامی چھوڑ دو۔

ہاں، ہاں میں نے سپاہیوں سے ہندوستان کی برٹش فوج سے یہ کہا ہے اور جب تک میری حلق میں آواز پھنستی نہیں یہی کہتا رہوں گا۔ آج بھی اعلان کرتا ہوں کہ جب تک میری زندگی باقی ہے، ہر صبح کو، ہر شام کو میرا پہلا فرض یہی ہوگا کہ سپاہیوں کو ورغلاؤں اور ان سے کہوں کہ گورنمنٹ کی نوکری چھوڑ دو کیا عظیم الشان برٹش گورنمنٹ، جس کی حکومت میں کبھی سورج نہیں ڈوبتا، تیار ہے کہ گرفتار کرے؟ اگر یہ جرم ہے تو اس جرم کا ارتکاب تمام ملک کر رہا ہے، میں نے سپاہیوں سے بھی کہا ہے اور لوگوں سے بھی کہا ہے کہ تم سپاہیوں کے پاس چھاؤنیوں میں جاؤ اور سپاہیوں کو یہ پیغام سناؤ۔ پھر برٹش گورنمنٹ اگر اپنی طاقت کا گھمنڈ رکھتی ہے تو کیوں نہیں قدم آگے بڑھاتی؟ کیا گورنمنٹ کی مشینری پر فالج گر گیا ہے۔

عزیزانِ من! اس سلسلہ میں یہ چیز میرے سامنے آتی ہے کہ گو بار بار اس مسئلہ کا اعلان کیا جاتا تھا۔ مگر چونکہ اب گورنمنٹ نے اپنے ذہن میں بڑی دانشمندی سمجھ کر، مگر یہ بھول کر ستون گرنے والا ہے، اور اس کا علم یہ ہوا ہے کہ ہوش و حواس باختہ ہونے لگے ہیں، ہاں چونکہ گورنمنٹ کی سطوت مٹنے والی ہے۔ اور دنیا کی تاریخ نے اور دنیا کی تاریخ کے فلسفوں نے ہمیں بتلا دیا ہے کہ جب کسی قوم کے گھمنڈ اور طاقت کا زوال ہوتا ہے۔ تو جسمانی قوتوں کا زوال بعد میں ہوتا ہے۔ پہلے عقل کا زوال ہوتا ہے یہ عقل کے زوال کا تماشہ ہمارے سامنے ہے۔

میں نہیں جانتا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، تم اسے ایک ہنگامہ یا تماشہ سمجھتے ہو مگر

یہ ہنگامہ نہیں ہے۔ دنیا کے لئے ایک عجیب وغریب منظر تیار ہو رہا ہے۔ ہندوستان کی آنے والی تاریخ کا مورخ بے چین ہے۔ ہندوستان کی تاریخ ایک فیصلہ کن گھڑیوں سے گزر رہی ہے اور میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر ہے جو میں پچھلی تاریخوں میں دیکھتا تھا میں اس وقت روما کو ڈوبتے دیکھ رہا ہوں میں کلدانیوں کا خاتمہ دیکھ رہا ہوں، میرے سامنے تخت جمشید الٹ رہا ہے اور تاریخ عالم ہم کو انقلاب کا ایک آخری تماشہ دکھا رہی ہے۔

درحقیقت یہ زوال عقل اور اختلال دماغ کا نتیجہ ہے کہ گورنمنٹ اپنے قدم کو ہوشیاری کا قدم سمجھ رہی ہے۔ حالانکہ یہ اس کے زوال کا قدم ہے۔ یہ گرفتاریاں انگریزوں کی زوال کا تماشہ پیش کر رہی ہیں گورنمنٹ نے محمد علی، شوکت علی۔ سیف الدین کچلو، حسین احمد، شنکر آچاریہ کو گرفتار نہیں کیا ہے، بلکہ گورنمنٹ نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ اسلام کو اور دنیا کے متفقہ سچائی کو گرفتار کرنا چاہتی ہے لیکن گورنمنٹ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس کا گھمنڈ لاکھ اونچا سہی۔ لیکن اس کے گھمنڈ سے بھی اونچی ایک طاقت موجود ہے۔ گورنمنٹ سمجھتی ہے کہ ہم سے بڑھ کر دنیا میں کون ہے مگر وہ فاطر السماوات والارض بتاتا ہے کہ حقیقی طاقتور اللہ تعالیٰ ہے۔

چونکہ گورنمنٹ نے اپنے عمل سے اسلام کو اسلام کے عقیدے کو، دنیا کی عالمگیر صداقت کو، عالمگیر راستی کو چیلنج دیا ہے۔ اس لئے ہم میں سے ہر شخص کا فرض ہوگا کہ جب سچائی کو پامال کیا جائے۔ سچائی کو جرم قرار دیا جائے تو وہ کتنی ہی چھوٹی چیز ہو اس وقت نوع انسانی کے لئے بڑی سے بڑی عبادت یہ بن جاتی ہے کہ ظلم کا مقابلہ کیا جائے

آخری حج کے موقع پر ایک شخص نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا سب سے بڑا اور سب سے بہتر جہاد کیا ہے؟ حضرت نے کچھ دیر تامل کر کے فرمایا: سب

سے افضل جہاد یہ ہے کہ ظالم حاکم کے روبرو کلمہ حق کا اعلان کر دینا؟

عزیزانِ من! اگرچہ یہ مسئلہ ہمارے لئے کوئی نیا مسئلہ نہ تھا، جس کی پکار ہمارے لئے ضروری ہوتی لیکن عافیت نااندیش اور قریب زوال گورنمنٹ نے اس چیز کو جرم قرار دے کر آج ہر مسلمان کو اور ہر سچائی پسند انسان کو ہندوستان کے ہر مسلمان اور ہر ہندو کو، جو دین کو دھرم کو عزیز رکھتا ہے، مجبور کر دیا ہے کہ وہ ساری باتوں سے بڑھ کر، سب سے بڑی نیکی، سب سے بڑا اجر، اللہ کی محبوبیت کا سب سے وسیلہ اسی چیز کو سمجھے اور پوری آزادی سے اعلان کرے کہ انگریزی گورنمنٹ کی نوکری حرام ہے، کفر ہے، اور ہر سپاہی کو نوکری ترک کر دینا چاہئے

لیکن قبل اس کے کہ میں اس ٹکڑے کو ختم کر دوں آپ کو بتا دینا ہوں کہ میری زبان سے ابھی لفظ "حرام" آپ نے سنا تھا۔ یہ لفظ عربی زبان کا ہے مگر کیا عربی کا لفظ ہونے کی وجہ سے اس کی سچائی اسلام کے لئے مخصوص ہو گئی ہے کون صداقت پسند ہے؟ انگریز ہو، عیسائی ہو، یہودی ہو جو ایک منٹ کے لئے بھی مان سکتا ہے کہ ظالم کی مدد کرنا، بندگانِ خدا کا خون بہانا، ان کے پیروں میں غلامی کی بیڑیاں ڈالنا ثواب کا کام ہے۔ کیا دنیا کا کوئی مذہب بھی اسے ایک گھڑی کیلئے تسلیم کریگا؟

برٹش گورنمنٹ اسلام کے اور ہندوستان کے مقابلہ میں لڑنے والا فریق ہے۔

اس لئے برٹش گورنمنٹ سے کوئی مددگاری کا رشتہ بھی رکھنا جائز نہیں۔ اگر آج یہ صورت ہوتی کہ برٹش گورنمنٹ گناہ اور پاپ کے لئے سپاہیوں کو نوکر نہ رکھتی بلکہ نمازوں کے لئے نوکر رکھتی، تب بھی اس کی نوکری حرام ہوتی جب برٹش گورنمنٹ فریق محارب ہے تو اب یہ سوال نہیں رہا کہ اس کی نوکری میں ہم کو کیا کرنا پڑتا ہے۔ کوئی کام بھی کرنا پڑے، برٹش گورنمنٹ کی نوکری حرام ہے، اگر انگریزی راج کی فوج میں سپاہی کو گناہ نہیں کرنا پڑتا بلکہ انگریزی راج، فوجی چھاؤنیوں میں مسجدیں

اور مندر بنا کر مسلمان اور ہندو سپاہیوں سے کہتا کہ صبح و شام خدا کے آگے ماتھے ٹیکو، تو بھی میں یہی کہتا کہ انگریزی راج کی فوج میں بھرتی ہونا کسی ہندو مسلمان کے لیئے جائز نہیں۔

اس نوکری کا اصلی مقصد وہ ارادہ ہے، وہ نیت ہے جس کی نسبت ابھی چند منٹ میں تم سنو گے کہ مسلمانوں کے لیئے سب سے بڑا گناہ، سب سے بڑی معصیت جو خدا کی لعنت کو پھیلاتی اور خدا کی پھٹکار کو ظاہر کرتی ہے، وہی عمل ہے جس کے لیئے ہندوستان کے بدبخت مسلمانوں کو انگریزی فوج میں بھرتی کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کی یہ فوج کس غرض سے ہے؟ صرف دو غرض سے ایک تو وہ ہے جس کا تعلق ہندوستان کے اندر سے ہے اور ایک وہ ہے جس کا تعلق باہر کی دنیا سے ہے۔

اگر تم پوچھنا چاہتے ہو کہ اس فوج کا ہندوستان میں کیا کام ہے؟ تو اس کا جواب میں نہیں دے سکتا، جلیان والہ باغ کی وہ مٹی دے سکتی ہے، جو ہندو مسلمانوں کے خون سے تر ہو رہی ہے۔ کس نے اپنے بھائیوں پر گولیاں چلائی تھیں؟ ہندوستان کے سپاہیوں نے!

ہندوستان کے اندر انگریزی فوج کا ہندوستانی سپاہی کیا کرتا ہے؟ ہندوستان کو غلام بناتا ہے اور ہندوستانیوں کا خون بہاتا ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ ہندوستان کی حکومت، ہندوستان کی طاقت کس نے پامال کی؟ میں بتلانا چاہتا ہوں کہ دو سو برس پہلے جو انگریزی راج کے آنے کا زمانہ ہے تمہارے ملک کو غلام بنانے کے لیئے نہ دنیا کا کوئی خزانہ آیا تھا اور نہ برطانیہ کے جزیرے کے ڈھلے ہوئے ہتھیار آئے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کوئی انگریزی فوج نہیں آئی ہندوستان کو غلام بنانے کے لیئے اور کوئی برطانوی سونا چاندی نہیں آیا، ہندوستان میں جس نے

کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے آج تک بتاؤ کہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک واقعہ بھی موجود ہے کہ ہندوستان کو انگریزی راج کا غلام بنانے کے لئے کوئی فوج بھی برطانیہ کے جزیرے سے آئی اور کوئی لدا ہوا خزانہ سمندر کے کنارے لگا؟ جس سوراج کے لئے آج تم رو رہے ہو جس کے لئے تمہارے دلوں میں سوراخ پڑ گئے ہیں، بدبخت ہندوستان کے بسنے والو، سن لو! کہ اس سوراج کو خود ہندوستان کی فوج نے پامال کیا ہے وہ ہندوستان ہی کی فوج تھی جس نے مٹھی بھر گیہوں کے لئے اپنے دین کو دھرم کو بیچا جس نے اپنی روح کو، آتما کو انگریزوں کے حوالے کر دیا، تاکہ ہندوستان کو، ان کے وطن کو، دیس کو، انگریز غلام بنا لیں! وہ ہندوستان ہی کا خزانہ تھا، جو اس قوم کے آگے ڈال دیا گیا کہ وہ جی بھر کو چوس لے ہندوستان کے خون کو، وہ تمہاری غفلت، تمہاری نا اتفاقی تھی جس نے "تم" کو غلام بنایا۔

آج صبح یہاں جو تقریریں ہو رہی تھیں، میرے عزیز! انھیں سُن سن کر لعنت کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔ اس سے میرے دل میں جوش پیدا نہ ہوا، لارڈ جارج کا نام لیا جاتا ہے، تو تم چیخ اٹھتے ہو، لعنت! لعنت! لیکن میرے دوستو! لعنت تمہاری غفلت پر لعنت تمہاری ایمان فروشی پر! اور لعنت اس پر کہ تم نے خدا کی چوکھٹ چھوڑ دی، اور بندوں کو معبود بنا لیا!

میرے دوستو! خدا کے اس آسمان کے نیچے اس ملک کے بسنے والوں سے بڑھ کر کوئی بدبخت ہو سکتا ہے کہ انھیں دو وقت کی روٹی بھی ملتی ہے تو اس کام کے لئے کہ اپنے بھائیوں کا خون بہائیں اور اپنے وطن کو غلام بنائیں۔

اب سنو، ہندوستان کی فوج کو ہندوستان کے باہر کیا کام کرنا پڑتا ہے؟ میں وہ داستان، وہ کہانی تمہارے کانوں کو کیا سناؤں، اگر تمہارے دل کے ٹکڑے ہوں تو اسے ان پر نقش کر دوں، آہ، وہ ترک جو چھ سو برس سے اپنے سینوں کو

اسلام کی حفاظت کے لئے ایک دیوارِ آہنی بنائے ہوئے ہیں، انھیں ترکوں کے سینوں پر کس نے گولیاں برسائیں، بدبخت ہندوستانیوں نے، قسطنطنیہ کے ساحل پر کون قدم تھے جو اُترے؟ بدبخت ہندوستانیوں کے قدم مسلمانوں کا خون بہانا ایک ظلم کی زنجیر کو خدا کی آزاد مخلوق کے پاؤں میں ڈالنا۔ اس دنیا کی کون سی سچائی کون سا دین، کون سا دھرم ہے جو ایک گھڑی کے لئے بھی اسے نوعِ انسان کے لئے سب سے بڑی پھٹکار اور لعنت کہے گا؟

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اور اسلام کے قانون نے اس نوکری کو، اس کام کو جس میں انسان کا خون بہانا پڑے، ایک ایسا گناہ قرار دیا ہے جس کے لئے رسول اللہ کی زبان پر کفر کا لفظ جاری ہوا ہے۔ اسلام کے قانون نے مسلمانوں ہی کا قتل نہیں بلکہ کسی انسان کا بھی قتل کرنا اور اس کا خون بہانا، ایک بہت بڑی معصیت، گناہ، پاپ قرار دیا ہے۔ چنانچہ سورہ فرقان میں فرمایا وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ۔ یعنی وہ لوگ جو خدا میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتے اور کسی جان کو قتل نہیں کرتے جسے اللہ نے روک دیا ہے اور جسے اللہ نے حرام کر دیا، لیکن اگر انھیں کرنا پڑتا ہے تو صرف ان جانوں کے لئے وہ قتال جائز رکھتے ہیں جن جانوں کو اللہ کی عدالت کے قائم رکھنے کے لئے سزا دینا ضروری ہے۔

اس قانون کی رو سے اگر قتلِ نفس جائز ہے، تو صرف اُن جماعتوں، فوجوں جتھوں کا، جن کا وجود، دنیا کی ہدایت وحریت کے لئے، قوموں کے ایمان کے لئے، سچائی کی بقا کے لئے ایک فتنہ ہو۔ قرآن کے قانون نے فتنہ وفساد کو قتال سے زیادہ سنگین قرار دیا ہے اسی طرح جس طرح ایک جج عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر پھانسی کو جائز قرار دیتا ہے قاتل اس کے سامنے اس جرم پر لایا گیا ہے کہ اس نے ایک آدمی کا خون کیا ہے۔ جج حکم دیتا ہے کہ قاتل کو پھانسی پر چڑھا دیا جائے، جج بھی قتل

کرنا ہے مگر اس کا قتل کرنا قتل نہیں ہے، زندگی اعلان ہے۔ قصاص میں تو فی الحقیقت زندگی چھپی ہوئی ہے۔ "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ" اگر قاتلوں سے قصاص نہ لیا جائے اگر ظالموں سے خدا کے بندوں کو نہ بچایا جائے تو دنیا ظلم کا ایک جہنم بن جائے۔

شریعت نے قتل نفس کو ایک سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے جو دنیا میں انسان کر سکتا ہے اور اگر قتل نفس کو جائز رکھا ہے تو صرف فتنہ و فساد کے دور کرنے کے لئے اور جب کہ علاج ہو جائے تو پھر اس علاج کو جائز نہیں رکھا۔

ایسی حالت میں کیونکر ممکن تھا کہ اسلام مسلمانوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں قتل جائز رکھتا؟

اسلام نے بلا عذر شرعی مسلمانوں کے قتل کو ایک ایسی معصیت بتایا ہے کہ بمنزلہ کفر کے ہے۔ حضرت رسولؐ نے فرمایا، میرے بعد تم کافر نہ ہو جانا، کافروں کا چلن نہ اختیار کر لینا اور کافروں کا چلن یہ ہوگا کہ مسلمان مسلمانوں کی گردنیں مارنے لگیں۔ اسی طرح بخاری اور مسلم کی حدیث میں فرمایا۔ جس نے مسلمانوں پر ہتھیار اٹھایا وہ مسلمانوں میں باقی نہیں رہا۔ یہ اللہ کے رسولؐ کا قول ہے اور میں اس کی کوئی تاویل نہ کروں گا۔ اسی طرح قرآن کی نصِ قطعی موجود ہے

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ
خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ
وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا أَلِيمًا۔

یعنی جس شخص نے جان بوجھ کر کسی مسلمان کو قتل کیا تو اس کی سزا یہ ہے کہ ہمیشہ جہنم کے عذاب میں رہے اور اللہ کی لعنت میں مبتلا رہے۔

بخاری اور مسلم میں حضرت اسامہ کا واقعہ موجود ہے۔ انھیں حضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے ایک خاص موقع پر دشمنوں سے مقابلہ کے لیۓ بھیجا تھا جن کی قوتیں اسلام کو نقصان پہنچانے پر لگی ہوئی تھیں۔ حضرت اسامہؓ نے ایک شخص پر تلوار اٹھائی۔ اور جوں ہی وار کرنا چاہا۔ وہ کلمۂ توحید پکار اٹھا حضرت اسامہؓ کہتے ہیں کہ سنتے ہی حضورؐ کے قلب مبارک پر اس درجہ حزن و ملال چھا گیا کہ فرمایا اے اسامہ افسوس تو نے اس آدمی کو مار ڈالا، حالانکہ اس نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا تھا! حضرت اسامہؓ کہتے ہیں کہ آپ بار بار اسی جملہ کو دہراتے رہے اور بار بار اس پر افسوس و غم کا اظہار کرتے رہے یہاں تک کہ میرے دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ آج کے دن کے پہلے میں مسلمان ہی نہ ہوا ہوتا اور مجھے حضورؐ کا یہ غم نہ دیکھنا پڑتا!

یہ اظہار غم اس لیۓ تھا کہ ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا گیا تھا جو آخری وقت سہی مگر مسلمان ہو گیا تھا، اسامہ نے عرض کیا، یا حضرت اس شخص نے محض جان کے خوف سے کلمہ پڑھا تھا۔ آپؐ نے فرمایا خدا کو تو کیا جواب دے گا جب کلمۂ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ خونیں چادر لیکر تیرے سامنے آئے گا؟ اس سے اندازہ کرنا چاہیئے کہ ایک شخص نے میدان جنگ میں اس کلمہ کا اقرار کیا، کب؟ اس وقت جب اسامہؓ کی تلوار اس کے سر پہ پہنچ چکی تھی زیادہ سے زیادہ وہ ایک لمحہ مسلمان رہا ہوگا۔ ایک لمحہ کا مسلمان اللہ کے رسولؐ کو اتنا عزیز تھا۔ اب مجھے بتاؤ ان بدبخت مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جنہوں نے ان مومنوں کو بندوقوں کا نشانہ بنایا جو چھ سو برس سے اسلام کی حفاظت کر رہے ہیں؟ کھلی بات ہے کہ آج انگریزی فوج میں بھرتی ہونا، یا اس فوج میں رہنا یا دوسروں کو دکھانا یہ سب کے سب ملعون اور پھٹکار کے کام ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

مولانا آزاد کا ایک
پیغام :-
" دنیا کی تمام
طاقتوں سے باغی
ہو کر خدا کے
وفادار بن جاؤ "

خدا کے وفادار بن جاؤ

لوگ دنیا میں سینکڑوں قوتوں کے محکوم ہیں، ماں باپ کے محکوم ہیں اگرچہ وہ دنیا میں بغیر کسی زنجیر اور بیڑی کے آئے تھے۔ مگر دنیا نے ان کے پاؤں میں بہت کچھ بیڑیاں ڈال دی ہیں۔

لیکن مومن و مسلم ہستی وہ ہے جو صرف ایک ہی کی محکوم ہے اس کے گلے میں محکومی کی ایک ہی بھل زنجیر ضرور ہے مگر مختلف سمتوں میں کھینچنے والی بہت سی ہلکی زنجیریں نہیں ہیں۔ وہ ماں باپ کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتا ہے، کیونکہ اس کے ایک ہی حاکم نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ دوستوں سے محبت رکھتا ہے۔ کیونکہ اسے رفیقوں اور ساتھیوں کے ساتھ سچے برتاؤ کی تلقین کی گئی ہے، وہ اپنے ہر بزرگ اور ہر بڑے کا ادب ملحوظ رکھتا ہے کیونکہ اس کے ادب آموز حقیقی نے ایسا ہی بتلایا ہے۔ وہ بادشاہوں کی اطاعت بھی کرتا ہے جو اس کے آسمانی بادشاہت کی اطاعت کرتے ہیں۔ کیونکہ اسے تعلیم دی گئی ہے کہ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرے۔ لیکن یہ سب کچھ جو وہ کرتا ہے تو اس لئے نہیں کرتا کہ ان سب کے اندر کوئی حکم ماننا اور ان کے جھکنے کی جگہ سمجھتا ہے بلکہ صرف اس لئے کہ اطاعت صرف ایک ہی کے لئے ہے اور حکم صرف ایک ہی کا ہے۔ جب اس ایک ہی حکم دینے والے نے ان سب باتوں کا حکم دیدیا۔ تو ضرور ہے کہ خدا کے لئے ان سب بندوں کو بھی مانا جانا اور اللہ کی اطاعت کی خاطر وہ اس کے بندوں کا بھی مطیع ہو جائے۔

فی الحقیقت اس دنیا میں ہر انسان کے لئے بے شمار حاکم بہت سی جھکانے والی قوتیں ہیں لیکن مومن کے لئے صرف ایک ہی ہے۔ اس کے سوا کوئی رب نہیں۔ وہ صرف اسی کے سامنے جھکتا ہے اور صرف اسی کو مانتا ہے۔ اس کی اطاعت کا حق ایک ہی کو ہے۔ اس کی پیشانی کے جھکنے کی چوکھٹ ایک ہی ہے اور اس لئے دل کی خریداری کے لئے بھی ایک ہی خریدار ہے۔ وہ اگر دنیا کی ہستی کی اطاعت کرتا بھی ہے۔ تو صرف اسی ایک کے لئے اس لئے اس کی بہت سی اطاعتیں بھی اس ایک ہی اطاعت میں شامل ہو جاتی ہیں۔

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست
ہر جا کنیم سجدہ بر آں آستاں رسد

حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانے میں اپنے ساتھیوں سے کیا پوچھا تھا؟

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۲: ۳۹) بہت سے معبود بنا لینا بہتر ہے؟ یا ایک ہی قہار اور مقتدر خدا کو پوجنا۔

یہی وہ خلاصۂ ایمان و اسلام ہے جس کی ہر مومن و مسلم کو قرآن کریم نے تعلیم دی ہے کہ:۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ۔

تمام جہان میں اللہ کے سوا اور کسی کو نہ پوجیں۔ اور نہ کسی کو اپنا معبود بنائیں۔

یہی دین قیم ہے جس کا حکم پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ

"جس بات کے ماننے میں خدا کی نافرمانی ہو۔ اس میں کسی بندے کی فرمانبرداری نہ کرو"

اسلام نے یہ کہہ کر فی الحقیقت ان تمام ماسوائے اللہ اطاعتوں اور

فرمانبرداریوں کی بندشوں سے مومنوں کو آزاد و حُر کامل بنا دیا۔ جن کی بیڑیوں سے تمام انسانوں کے پاؤں بوجھل ہو رہے تھے اور اس ایک ہی جملہ میں انسانی اطاعت اور پیروی کی حقیقت اس وسعت اور اماملہ کے ساتھ سمجھا دی کہ اس کے بعد اور کچھ باقی نہ رہا۔ یہی ہے جو اسلامی زندگی کا دستور العمل ہے اور یہی ہے جو مومن کے تمام اعمال و اعتقادات کی ایک مکمل تصویر ہے۔ اس تعلیم الٰہی نے بتلا دیا ہے کہ جتنی اطاعتیں جتنی فرمانبرداریاں، جتنی دیانت داریاں اور جس قدر بھی تسلیم اعتراف ہے۔ صرف اسی وقت تک کے لئے تھے جبتک کہ بندے کی بات ماننے سے خدا کی بات نہ جاتی ہو، اور دنیا والوں کے وفادار بننے سے خدا کی حکومت کے آگے بغاوت نہ ہوتی ہو۔ لیکن اگر کبھی ایسی صورت پیش آجائے کہ اللہ اور اس کے بندوں کے احکام میں مقابلہ آپڑے تو پھر تمام اطاعتوں کا خاتمہ تمام عہدوں اور شرطوں کی شکست تمام رشتوں اور ناطوں کا انقطاع اور تمام دوستوں اور صحبتوں کا اختتام ہے۔ اس وقت نہ تو حاکم حاکم ہے اور نہ بادشاہ بادشاہ۔ نہ باپ، باپ ہے۔ نہ بھائی، بھائی۔ سب کے آگے غرور۔ سب کے ساتھ انکار، سب کے ساتھ سرکشی، سب کے ساتھ بغاوت، پہلے جس قدر نرمی تھی، اتنی ہی اب سختی چاہیئے۔ پہلے جس قدر اعتراف تھا۔ اتنا ہی اب تمرد چاہیئے۔ پہلے جس قدر فرمانبرداری تھی۔ اتنی ہی اب نافرمانی مطلوب ہے۔ پہلے جس قدر جھکاؤ تھا اتنا ہی اب غرور ہے۔ کیونکہ رشتے کٹ گئے اور عہد توڑ ڈالے گئے۔ رشتہ دراصل ایک ہی تھا اور یہ سب رشتے اسی ایک رشتے کی خاطر تھے۔ حکم ایک ہی کا تھا۔ اور یہ سب اطاعتیں اسی ایک اطاعت کے لئے تھیں۔ جب ان کے ماننے میں اس سے انکار اور ان کی وفاداری میں اس سے بغاوت ہونے لگی تو جس کے حکم سے رشتہ جوڑا تھا اسی کی تلوار نے کاٹ بھی دیا، اور جس کے ہاتھ نے ملایا تھا، اس کے ہاتھ نے الگ بھی کر دیا۔

سرورِ کائنات سید المرسلین (صلعم) سے بڑھ کر مسلمانوں کا کون آقا ہو سکتا ہے؟
لیکن خود اس نے بھی جب عقبہ میں انصار سے بیعت لی۔ تو فرمایا کہ میری اطاعت تم پر اس وقت تک کے لئے واجب ہے جب تک میں تم کو نیکی کا حکم دوں۔ جب اسی شہنشاہِ کونین کی اطاعت مسلمانوں پر نیکی و معروف کے ساتھ مشروط ہے۔ تو پھر دنیا میں کون بادشاہ، کون سی حکومت، کون سا پیشوا، کون سا رہنما اور کونسی قومیں ایسی ہو سکتی ہیں جن کی اطاعت ظلم کے بعد بھی ہمارے لئے باقی رہے۔

آدم کی اولاد دو کی محکوم نہیں ہو سکتی۔ وہ ایک سے ملے گی دوسرے کو چھوڑے گی۔ ایک سے جڑے گی۔ دوسرے سے کٹے گی پھر خدارا مجھے بتاؤ کہ ایک مومن کس کو چھوڑے گا۔ اور کس سے ملے گا۔ ایک کو چھوڑنا پڑے گا۔ پھر مجھے بتاؤ کہ مومن کی اقلیم کس کی بادشاہت قبول کرے گی۔ کیا وہ اس سے ملے گا جس کی حالت یہ ہے۔

وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ (۲ - ۲۵)

"خدا نے جس کو جوڑنے اور ملانے کا حکم دیا ہے وہ اسے توڑتے اور جدا کرتے ہیں۔

اور کیا اس کی بادشاہت سے گردن موڑے گا۔ جو پکارتا ہے کہ

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ (۸۲ ۱ ۶)

"اے غافل انسان کیا ہے جس کے گھمنڈ نے تجھے اپنے مہربان اور پیار کرنے والے آقا سے سرکش بنا دیا ہے، مگر آہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۲ - ۲۸)

تم اس شہنشاہ حقیقی کی حکومت سے کیونکر انکار کرو گے جس نے تمہیں اس

وقت زندہ کیا، جب کہ تم مردہ تھے۔ وہ تم پہ پھر موت طاری کرے گا۔ اس کے بعد دوبارہ زندگی بخشے گا۔ پھر تم سب اسی کے پاس بلائے جاؤ گے۔

دنیا اور اس کی بادشاہیاں کافی ہیں۔ ان کے جبروت و جلال کو ایک دن ملنا ہے۔ خدائے منتقم و قہار کے بھیجے ہوئے فرشتہ ہائے عذاب انقلاب و تغیرات کے حربے لے کر اترنے والے ہیں۔ ان کے قلعے مسمار ہو جائیں گے، اور ان کی تلواریں کند ہو جائیں گی، ان کی فوجیں ہلاک ہو جائیں گی۔ ان کی توپیں ان کو پناہ نہ دیں گی، ان کے خزانے ان کے کام نہ آئیں گے، ان کی طاقتیں نیست و نابود کر دی جائیں گی۔ ان کا تاجِ غرور ان کے سر سے اتر جائے گا۔ ان کا تخت جلال و عظمت واژگوں نظر آئے گا۔

* * *

۲۲ر مارچ ۱۹۴۲ء کو
جمعیتہ العلماء کے اجلاس میں
جو باغ بیرون دہلی دروازہ
لاہور منعقد ہوا، مولانا نے تقریر
کی "انگریزی حکومت کے
خلاف چولہا دہک رہا ہے
میرا فرض ہے کہ میں اس میں
لکڑیاں ڈال دوں۔"

جمعیت العلماء کا اجلاس

آپ نے تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں ہر چیز کا مزاج اور اس کی ایک خاصیت ہوتی ہے۔ قدرت نے ہر چیز کے مزاج میں ایک ایسا قانون بنا دیا ہے جو اٹل اور امٹ ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جماعتوں، قوموں اور ملکوں کی زندگی کا بھی ایک خاص مزاج اور خاصیت ہے اور جب اس مزاج اور خاصیت میں کوئی فتور اور نقص پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ ایک ایسی کیفیت سے ہم آغوش ہو جاتا ہے اور ہم جسے اپنی اصطلاح میں مرنے کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ میں جو چیز بیان کر رہا ہوں وہ ذرا باریک ہے۔ آج ہندوستان جس دور سے گزر رہا ہے وہ وہی ہے جو دنیا کی سینکڑوں قوموں اور ملکوں پر گزر رہا ہے۔ آج سے مراد وہ وقت نہیں جس کو ہم ۲۴ گھنٹے کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب موجودہ دور یعنی عہد حاضر ہے۔ ہم نے تاریخ میں مختلف قوموں کی جو کہانیاں اور قصے پڑھے ہیں آج وہی واقعات ہم پر گزر رہے ہیں۔

اب ہم دریا کے کنارے نہیں، بلکہ دریا کے اندر ہیں۔ ہم دور سے کسی چیز کا نظارہ نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ یہ تمام حالات ہم پر طاری ہو رہے ہیں۔ ایک سیلاب ہم کو بہائے لئے جا رہا ہے اور ہم اس ریلے میں بہے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن جو شخص ایک مورخ کی حیثیت سے دور کھڑا ہو کر ہم کو دیکھنے کی کوشش کرے گا اس کی نگاہیں صحیح اندازہ لگا سکیں گی کہ ہم کس دور سے گزر رہے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو وقت کے مزاج اور خاصیت سے محفوظ نہیں کر سکتے ایک شخص خواہ کتنا ہی ذہانت رکھتا ہو۔ وہ گرد و پیش حالات سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا ہے۔

آج مسٹر چرچل ایک خاص اثر اور دائرے میں محصور ہے۔ وہ غفلت کے

کے دائرے میں محصور ہے۔ اگر یہی شخص کیمبرج یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر ہوتا۔ تو وہ گزشتہ تاریخ کو پیش نظر رکھ کر زمانہ حال کے متعلق اپنی رائے قائم کرتا۔ اور آج جو وہ غلطی کر رہا ہے اس سے بچ جاتا۔ اس کا تجربہ کام کرتا۔ اس کا دماغ اور عقل دونوں کام کرنے سے محروم ہو چکے ہیں۔ لیکن اگر آج کسی کالج میں تاریخ کا پروفیسر بنا دیا جائے تو وہ رفتار زمانہ کے متعلق زیادہ سے زیادہ مرتب باتیں ہمارے سامنے پیش کرے گا۔

بہ قدرت کے قوانین۔ موجودہ عہد میں صرف وہی دماغ صحیح طور پر کچھ سوچ اور فکر کر سکتے ہیں۔ جو اپنے کو پانی کی سطح سے اوپر رکھ کر سانس لے سکیں۔ جو سر کو نیچے کر یگا وہ ڈوب جائے گا۔ آج ہندوستان کی حالت کیا ہے۔ اس پر ڈیڑھ سو برس سے ایک غیر ملکی حکومت مسلط ہے۔ وہ اپنی خود غرضی کے مطابق اس کو چلا رہا ہے۔ اس کا ایک مزاج ہے اور اس کی ایک خاصیت ہے۔ اس لئے ملک کے اندر جو فضا موجود ہے وہ مسموم اور پراگندہ ہو چکی ہے۔ ہر سانس لینے والا اس زہریلی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ تاریخ پرانی داستانیں دہرا رہی ہے آپ الگ ہو کر ایک طرف کمرے میں بیٹھ جائیں اور دیکھیں کہ آپ کا دماغ کس طرح کام کرتا ہے اور اس کے بعد پھر غول میں چلے جائیں تو آپ بے ساختہ ہر چیز کے ساتھ دوڑنا شروع کریں گے۔ اچنبے کی بات یہ ہے کہ ہمارے حواس کام نہیں کرتے۔ بیرونی قبضہ ہمیں جس سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے ہم ڈھلتے جا رہے ہیں، اس سانچے میں جو ہاتھ کام کر رہا ہے وہ ہڈی اور گوشت کا نہیں بلکہ خاص اثرات کا ہے۔

اب میں ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کا نقشہ بتانا چاہتا ہوں میں کل لاہور آیا تو مجھے ۱۹۲۱ء کا زمانہ یاد آگیا۔ میں نے جمعیت العلماء کے جلسہ کی صدارت کی تھی میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس وقت میرے ایمان اور عزم کی جو صورت تھی اس میں اب تک ذرہ بھر تبدیلی نہیں ہوئی۔ وقت کے تقاضوں سے بعض باتوں میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔

لیکن جن چیزوں کی بنیاد ایک ٹھوس عقیدے اور حقیقت پر ہو، وہ نہیں بدلتے ہیں نے ۱۸ برس کی عمر میں سوچ سمجھ کر ایک فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ اب تک اس پر قائم ہوں۔ میں آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ میرے سامنے ایک چراغ جل رہا ہے۔ اگر بیس لاکھ انسان بھی مجھے یقین دلائیں کہ چراغ نہیں جل رہا تو میں ایک مستقل حقیقت سے آنکھوں کو بند کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان ہونے کے مستقبل کے متعلق بھی جملہ فیصلہ کرنا چاہیئے۔ یہاں ٹہنیوں اور پھلوں کی پرستش ہو رہی ہے مگر اصل چیز جڑ ہے۔ میں آنے والے زمانے کو کمزوری اور تذبذب سے نہیں دیکھتا، بلکہ عزم، ہمت اور حوصلے سے دیکھ رہا ہوں جو قوم اپنے آپ کو بچانے پر قادر نہ ہو اس کو تحفظات نہیں بچا سکتے، کاغذوں کے پرزوں پر لکھے ہوئے قانون نہیں محفوظ نہیں کرسکتے۔

سب سے پہلے آپ اپنے اور پاؤں کی نسوں کو مضبوط کرو۔ میں ۳۸ برس سے یہ آواز بلند کر رہا ہوں، لیکن سننے والے کان میں کہاں سے لاؤں۔

مسلمانوں کی تعداد ۹ کروڑ ہے۔ اگر نو کروڑ کے بجائے اگر مسلمان نو لاکھ بھی ہوتے اور ان کے دل میں یہ خیال ہوتا کہ وہ مرنے کے لیے نہیں زندہ رہنے کے لئے ہیں۔ تو کوئی قوم ان کو نہیں مٹا سکتی۔ میری جگہ کمزوری اور تذبذب کی نہیں ہے بلکہ یقین اور ایمان کی ہے۔ ۹ کروڑ ہوتے ہوئے اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم فنا ہو جاؤگے مٹ جاؤگے تو اس کا کیا علاج؟ نو کروڑ لاشوں کو کوئی تحفظ اور کوئی دستور نہیں بچا سکتا۔

اگر تم سمجھتے ہو کہ انگریز بہادر بچا سکتا ہے، تو وہ بھی نہیں بچا سکتا ہے اور اگر نہیں تو جب وہ اپنا بوریا بستر باندھے جیسے کہ اب بندھ چکا ہے۔ تو اس کو کوٹ سے ہاتھ ڈال کر پکڑنا اور روک لینا۔ دنیا میں صرف تعداد ہی نہیں بلکہ دوسری چیزیں بھی کام آتی ہیں۔ میرے سینے میں ایک انگیٹھی دہک رہی ہے، میں وہی حرارت آپ کے

اندر پیدا کرنا چاہتا ہوں ۔ میرا ایمان اور میرا اسلام مجھے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ان حالات میں میرے لئے صرف ایک فرض رہ گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انگریزوں کی حکومت کے خلاف جو چولہا دہک رہا ہے ۔ اس میں لکڑیاں ڈال دوں ۔

میں کوئی ایسا سوال اٹھانا نہیں چاہتا جس سے تیسری طاقت کے ہاتھ مضبوط ہوں ۔ دنیا میں وہی بچتا ہے جس کے پاؤں کی نسیں مضبوط ہوں ۔

گفتہ زعشق گہے حرف آشنا

آں ہم حکایتست کہ آزما شنیدہ

میں آپ کو آئندہ نقشوں کے بھرنے سے نہیں روکتا ۔ آل انڈیا کانگریس کی صدارت کے دو برس میں میں نے جو کوششیں کیں اور مسلمانوں کے لیڈروں نے جس طرح ٹھکرایا ۔ ان کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں لیکن جڑ کی چیز یہ نقشہ نہیں ۔ درخت کو جڑ کی ضرورت ہے ۔ آپ اس ابتدائی مقدمہ اور اصول کو سمجھ لیں اور سینکڑوں سوالات حل ہو جائیں گے ۔ میری تمام عمر کا سرمایہ یہی ہے کہ تم محبت بھرے دل سے میری بات سنتے ہو ، اور عزت بھری آنکھوں سے دیکھتے ہو ۔

٭ ٭ ٭

[۱۴؍ فروری ۱۹۴۳ء کو سٹی کمیٹی لاہور کے زیرِ اہتمام ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ حاضرین کی تعداد دو لاکھ کے قریب تھی جہاں مولانا نے بین الاقوامی حالات پر سیر حاصل تبصرہ فرمایا۔ ———]

بین الاقوامی حالات

بہنو! اور بھائیو! پچھلے برس بھی جاڑے کا موسم تھا کہ میں نے آپ کی صورتوں کو اپنے چاروں طرف پھیلا ہوا پایا اب ۱۳ ماہ سے زیادہ مدت گزر چکی ہے یہ ہماری معمولی زندگی میں کوئی بڑی مدت نہیں

دو کروٹیں لیں عالم غفلت میں خواب کی

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کے غیبی ہاتھوں نے گھڑیوں کی رفتار تیز کر دی ہے ان تیرہ ماہ میں دنیا کا نقشہ پرزے پرزے ہو گیا ہے گھڑیوں کی، منٹوں کی سوئیاں مہینوں کی رفتار سے چل رہی ہیں۔ اور پتہ نہیں کہ قدرت کا مخفی ہاتھ اب دنیا کا نقشہ کس صورت میں تیار کرنا چاہتا ہے، اس وقت تک کئی دیواریں گر چکی ہیں۔ اور جو باقی ہیں وہ گرنے والی ہیں۔ اس لئے کہہ نہیں سکتے کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آنے والا ہے اس عرصہ میں ایک اہم تبدیلی واقع ہوئی اور وہ یہ کہ پہلے جہاں ہم موجودہ خونی جنگ میں ایک تماشائی کی حیثیت رکھتے تھے اب وہی خونریز جنگ ہمارے دروازوں پہ ہے اس لئے ہم اپنے فرض سے غافل نہیں ہو سکتے۔

اڑھائی سال سے یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے اس عرصہ میں ہماری پوزیشن کسی سے مخفی نہیں رہی۔ ہم نے ہر قدم پہ اپنے فرض کا احساس کیا۔ ہم نے صاف طور پہ اعلان کیا کہ ہماری ہمدردی نازی قوتوں کے ساتھ نہیں ہو سکتی اور اتفاقات سے ایسی

طاقتوں کو جنگ کی آغوش میں دھکیل دیا۔ ہم نے چین اور روس کے ساتھ ہمدردی کا اعلان کیا اور ویسے ہی ہمارا رجحان اسی طرف ہو سکتا ہے جو جمہوریت کا حامی ہو اس لئے ہم نے صاف طور پر کہہ دیا کہ ہم ہندوستان کی حفاظت کرنے پر آمادہ ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بتایا جائے کہ ہم کس پوزیشن میں ہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ ہمارے گھر کو خطرہ ہے لیکن پہلے ہمیں یہ تو معلوم ہو سکتا واقعی ہمارا گھر ہے اور ہمیں اس میں آزادانہ طور پر رہنے کا حق ہے گھر پہلے ہی اجڑ چکا ہے اب ہمیں اس سے کیا ؎

دل میں کیا تھا کہ تر اغم اسے ویراں کرتا

وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرتِ تعمیر سو ہے

ہم نے اس سرزمین میں عزت کے ساتھ رہنے کا مطالبہ کیا تھا گورنمنٹ نے اس کے راستے میں روڑے اٹکائے قدم قدم پر رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ لیکن اگر ہم عزت کے ساتھ مرنے کی خواہش کرتے ہیں تو ہمیں کیا جہنم میں جائے۔

اس وقت تک برٹش گورنمنٹ کو ہم نے کئی موقعے دئے لیکن ہمیں ہر وقت ٹال دیا گیا۔ ہماری تمناؤں کو پامال کر دیا گیا۔ آپ نے دیکھا کہ اس وقت باوجودیکہ ندی کا پانی اس قدر جا چکا ہے کہ شاید واپس نہ آسکے برٹش گورنمنٹ کے رویے میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی اور اس وقت تک برٹش گورنمنٹ پر ایسے لوگوں کا تسلط ہے جن کے دل میں ہندوستان کے لئے کوئی ہمدردی نہیں۔ میں یہ سب باتیں سنتے سنتے تنگ آگیا ہوں دنیا بدل چکی ہے مگر یہ برطانی مٹی کی پتلیاں پرانی دنیا کی باتیں کر رہی ہیں۔ آخر اس قدر طویل بکواس کی ضرورت ہی کیا ہے اگست کی پیش کش اور بعد کی تقریریں سب بکواس ہیں۔

صرف دو سطروں میں اتنا اعلان کر دینا کافی ہے کہ برطانیہ ہندوستان کو اپنے معاملات کا تصفیہ خود کرنے کا حق دے اور اسے عزت کے ساتھ زندگی

بسر کرنے کا حق حاصل ہو گا۔ اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں اس لئے اگر کوئی صاحب دل کے کسی گوشے میں یہ خیال کرتے ہیں کہ موجودہ برٹش گورنمنٹ یہ تسلیم کرے گی کہ ہندوستان کو (Self Determination) کا حق ہے تو وہ اس خیال کو بالکل نکال دے۔ میں صاف طور پر یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ برٹش گورنمنٹ نے ہماری ترقی کے تمام دروازے بند کر دیئے ہیں اور اس سے کسی بھلائی کی توقع نہیں۔

اس سے بڑا جھوٹ کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ ہم پر یہ شرمناک الزام لگایا جائے کہ ہم بعض کی حق تلفی کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے بار بار اعلان کیا ہے کہ ہم کوئی ایسا آئین منظور نہیں کر سکتے جسے خود ہندوستانی مرتب نہ کریں۔ ہم ہندوستان کو خود آئین سازی کا حق دلانا چاہتے ہیں۔

میری صدائیں اکثر اخبارات کے اوراق کے ذریعے آپ کے کانوں سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ میری خواہش ہے کہ وہ آپ کے دلوں میں اتر جائے اور آپ محسوس کریں کہ انڈین نیشنل کانگریس کی ضرورت کا احساس کرتی ہے میں نے اس وقت تک جو گزارش کی وہ محض تمہید تھی اس پیغام کی جو میں آپ کے کانوں تک پہنچا کر آپ کے دلوں کو دستک دینے آیا ہوں۔

وہ عزت کا راستہ ہے، خدمت کا راستہ، وہ خدمت جو خدا کے لئے کی جائے۔

کانگریس کا پروگرام خدمت کا ہے میں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا مگر آپ کے دلوں کو جھنجوڑ کر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جنگ کی خون آشام لہریں ہندوستان کے ساحل سے ٹکرا رہی ہیں، جنگ آپ کو پھولوں کے بچھونوں پر لیٹنے کی اجازت نہیں دے سکتی آپ کا فرض ہے کہ اس نازک موقع پر بھائیوں کی امداد کریں اور اس مقصد کے لئے جان بھی دینا پڑے تو مضائقہ نہیں۔

[لکھنؤ کے اجتماع میں ۱۹۴۷ء میں امام الہند کا فاضلانہ خطبہ —
"اسلامی فن تدریس کا پس منظر —

عربی نصاب تعلیم

ترقی و تنزل کا معاملہ عجیب ہے آپ کتنی ہی کھلتی ہوئی نگاہیں رکھتے ہوں مگر ترقی و تنزل کو فوراً محسوس کرنا دشوار ہے ان کی رفتار غیر مرئی ہے، یہ دھیمی چال چلتی ہیں، ان کی رفتار اتنی سست ہے کہ تنگی آنکھوں سے پتہ چلنا دشوار ہے۔ یہ آہستہ آہستہ چلتی رہتی ہیں اور کافی راہ طے کر لیتی ہیں تو آپ کو اچانک پتہ چلتا ہے یہ ہر آن و ہر لمحہ چلنے والی شئے کہاں سے کہاں پہنچ گئی گھڑی کے گھنٹوں کے کانٹے کی چال کی طرح ان کی رفتار غیر محسوس ہوتی ہے جب کافی مسافت طے ہو جاتی ہے تب نگاہیں چونکتی ہیں یہی داستان ترقی تنزل کا افسانہ ہے کاش کوئی مورخ بتا سکتا کہ فلاں سن فلاں تاریخ فلاں وقت ترقی یا تنزل شروع ہوا۔ بعینہ یہی حال اسلامی علوم کی داستانِ تنزل کا ہے۔

میں کمیٹی کی طرف سے آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے کمیٹی کی دعوت منظور کی اور اس موقع کے لئے وقت نکالا اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات جس پر میں آپ کو توجہ دلاؤں گا وہ اس کمیٹی کے کام کی نوعیت ہے، یہ کمیٹی جس کام کے لئے مقرر کی گئی تھی وہ اپنے کام اور اپنے دائرے کے اعتبار سے نہ تو کوئی بڑا اوسیع دائرہ تھا اور نہ کوئی خاص اہمیت رکھتا تھا آپ کو علم ہے کہ یہ کمیٹی اس غرض سے بنی تھی کہ اس صوبہ میں جو عربی اور فارسی کے مدارس ہیں اور جنھیں حکومت امداد دے رہی ہے ان کے نصاب تعلیم پر غور کیا جائے ایسے مدارس کی تعداد اور سرکاری امداد کی رقم محدود ہے جہاں تک مجھے علم ہے سالانہ ساٹھ ستر ہزار سے زیادہ امداد نہیں دی جاتی اس اعتبار سے یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے لیکن اس کے باوجود

ہیں نے اس کے لئے وقت نکالا اور جب آپ کے صوبہ کے وزیر تعلیم نے مجھ سے تحریک کی تو میں نے اس کمیٹی کی صدارت منظور کر لی انہوں نے سنسکرت اسکولوں کی اصلاح اور ان کے نصاب کی ترمیم کے لئے بھی ایک ایسی ہی کمیٹی بنائی تھی جس نے سنسکرت مدرسوں کی تاریخ، موجودہ حالات، ضروریات محاسن و معائب پر ایک مکمل اور جامع رپورٹ اپنی سفارشوں کیساتھ تیار کی علم و حقیقت کے تمام میدان کس طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے چلتے ہیں، جب میں نے اصلاح کی وہ تجاویز دیکھیں جو اس کمیٹی نے پیش کی تھیں تو مجھے محسوس ہوا کہ اگر سنسکرت کی جگہ عربی کا لفظ رکھ دیا جائے تو وہ ساری باتیں عربی پر بھی منطبق ہوتی ہیں۔

بظاہر یہ کمیٹی اپنے دائرے کے اختیار سے محدود ہے۔ اس لئے آپ سوال کر سکتے ہیں کہ یہ بات کیوں میرے ذہن میں آئی کہ میں خود اس کمیٹی میں رہوں، بات یہ ہے کہ اس کمیٹی کا جو مقصود ہے وہ اپنی نوعیت میں اس درجہ اہم ہے کہ ہماری کاوشوں کے نتائج بہت دور رس ہو سکتے ہیں میں جب سوچتا ہوں کہ اسلامی دنیا کئی صدیاں اس خواب کی تعبیر ڈھونڈھنے میں بسر کر چکی ہے تو یہ کام ایک عظیم الشان کام نظر آتے لگتا ہے۔ میں نے سوچا کہ ابتدا مختصر سہی۔ لیکن اگر پہلے صرف ایسے مدارس کے نصاب میں ترمیم و اصلاح کی کوشش کی جائے جنہیں حکومت امداد دیتی ہے تو شاید بآسانی کام انجام پا سکے۔ امداد کی ضرورت ان مدارس کو مجبور کرے گی کہ وہ ہمارے مقرر کردہ نصاب تعلیم کو پڑھائیں، لیکن یہ بھی کوئی خاص بات نہ تھی، وہ نصاب تعلیم سے کیا اثر لیتے یہ اور ہی بات ہے لیکن اگر ایک مرتبہ یہ گتھی سلجھائی جا سکتی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے اثرات دور دور تک پھیلتے۔ اس وجہ سے میں نے خود اس کمیٹی میں رہنا اور اس کی صدارت کرنا منظور کر لیا۔

اس کے بعد آپ کو معلوم ہے کہ ملکی حالات نے ایسی کروٹ بدلی کہ کانگریس کو وزارتوں سے مستعفی ہو جانا پڑا، اور کمیٹی کا کام ملتوی ہو گیا۔ اب پچھلے برس پھر

وزارت قائم ہوئی اور میں لکھنؤ آیا تو وزیر تعلیم نے سب سے پہلی بات جو یاد دلائی وہ یہ تھی کہ جو کمیٹی بنائی گئی تھی وہ ادھوری ہی رہ گئی اس لئے اس کام کو سب سے پہلے شروع کیا جائے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو عربی تعلیم سے بھی کتنی دلچسپی ہے بہرحال خط و کتابت ہوئی اور کمیٹی کے کام شروع ہو گئے اس کمیٹی کا ابتدائی جلسہ ہو چکا ہے کچھ سب کمیٹیاں بھی بنا دی گئی ہیں۔ یہ کمیٹی وقت آنے پر اپنی رپورٹ بھی پیش کرے گی اور اسے حکومت منظور بھی کرے گی اور نصاب تعلیم کا آگے چل کر جو نقشہ بھی بنے گا اسی کے مطابق ہوگا اور ظاہر ہے کہ اس کا اثر دور دور تک پھیلے گا۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس طرح کافی دیر لگے گی۔ اور اثر قبول کرتے کرتے بھی زمانہ گزر جائے گا اس لئے کیوں نہ اس بات کی کوشش کی جائے اور کیوں نہ ایسا قدم اٹھایا جائے کہ ہم فوراً کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں اس لئے اس عام کانفرنس کا خیال پیدا ہوا۔ تاکہ تمام عربی فارسی مدارس کو مدعو کیا جا سکے۔ جن کے پیچھے سینکڑوں نہیں ہزاروں دماغ کام کر رہے ہیں اور بجائے اس کے کہ عربی و فارسی کی تعلیم کے مسئلہ کو ایک محدود دائرے میں جکڑا جائے مسئلہ نصاب تعلیم کو وسیع تر طریقہ پر جانچا اور پرکھا جائے۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر مختلف دماغوں کے افکار کو یکجا کیا جائے۔ میں پھر آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ایک اہم مقصد کے لئے زحمت کی ہے۔

معاملہ بہت وسیع ہے یہ کہ ایک طویل داستان ہے۔ علوم عربیہ کی کہانی ہے، اس کی پچھلی تاریخ درمیانی عہد کا افسانہ ہے اصلاح و اجتہاد کے میدانوں میں اقدامات کے قصے اور آج جس منزل پر کاروان رکا ہے اس کی سرگزشت بہت طویل ہے اس کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ ع

"داماں نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار"

اس کے بہت سے پہلو ہیں جن پر تفصیل سے گفتگو کی ضرورت ہے مگر پھر بھی یہ

داستان ایسی ہے کہ اس کے شروع کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی مقدمہ لانا پڑتا ہے اس لئے مجھے کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑے گا۔

قدرتی طور پر ہر علم تین مختلف منزلوں سے گزرتا ہے پہلا دور علم کی پیدائش یا تدوین کا ہے اس دور میں علم مدون ہوتا ہے۔ جو اینٹیں مختلف دماغوں میں بکھری ہوئی پڑی ہوتی ہیں۔ ان کو ایک پر ایک رکھ کر ایک دیوار قائم کرنے کا دور۔

(۲) دوسرا دور تہذیب و تنقیح علوم کا ہے یہ کانٹ چھانٹ کا دور ہے سنوارنے اور نوک پلک درست کرنے کا زمانہ ہے۔ دیوار تو پہلے قائم ہو چکی اب نقش و نگار بنانے کا زمانہ آگیا۔

(۳) تیسرا دور بلوغ و تکمیل علوم کا ہے اب عمارت نقطۂ کمال تک پہنچ چکی ہے اب علم کی اشاعت اور اس کے پھیلانے کا عہد ہے۔ درس تدریس سے علم کو استوار کرنے کا دور ہے۔

اسلامی علوم پر بھی یہی تین دور گزرے ہیں۔ اگر ان تینوں ادوار کے زمانوں کا تعین کیا جائے تو یہ نتائج مرتب ہوں گے۔

تیسری صدی ہجری تک تدوین علوم کا دور تھا۔ تیسری صدی ہجری سے پانچویں صدی ہجری تک علوم کا زمانہ اور اس کے بعد بلوغ و تکمیل علوم کا زمانہ آتا ہے۔ یہ زمانہ ساتویں صدی تک ختم ہو جاتا ہے۔ ساتویں صدی تک ہمیں ایسے ائمہ فن نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے تاریخ علوم کے صفحات پر محو نہ ہونے والے نقوش چھوڑے ہیں۔ ساتویں صدی ہجری کے بعد اسلامی علوم کی تاریخ کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔ نیا ورق الٹتا ہے۔ چھ صدیاں صرف ہو چکی ہیں۔ وہ ایک نئے دور سے آشنا ہوتی ہے اس دور کو میں دور تنزل سے تعبیر کروں گا اسلامی علوم کے چھتنار درخت کی شاخیں بجائے اس کے کہ بہار کی ہواؤں میں

جھولا جھولتیں کچھ لتائیں کھلتی اور اپنی شادابی سے بہرور قلب و نظر کا وسیلہ بنتیں، خزاں سے دوچار ہیں اور بہت جھڑ شروع ہو گیا ہے نظر و اجتہاد کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور جمود و تقلید کا دروازہ کھل جاتا ہے الا یہ کہ اس اندھیرے میں اچانک کوئی کرن نظر آجاتی ہے اور علامہ ابن تیمیہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر یہ مستثنیات ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ قوتیں ختم ہو چکی ہیں۔ کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے۔ جو دیواریں بن چکی ہیں، انہی کی لیپ پوت پر سارا وقت صرف ہوتا رہا۔ یہ دور شروح و متون کا ہے، تلخیص کا دور ہے۔ قدما کی کتابوں کی تلخیص ہوتی ہے۔ شرحیں لکھی جاتی ہیں۔ شرحوں کے حاشیے اور حاشیوں کے تعلقات، یہ ہے اس دور کی کائنات۔

علوم کے افق کا یہ اندھیرا درس و تدریس پر بھی چھا گیا۔ بجائے اس کے کہ درس و تدریس چھ صدیوں کے ڈھنگ پر چلے ایک نیا ڈھنگ ایک نیا طرز سامنے آتا ہے، یہ نیا ڈھنگ دور تنزل کی مخلوق اور اس لئے ہر نہج سے تنزل کا آئینہ دار۔ اس نئے طرز کا جو نتیجہ نکلا اس کی داستان طویل ہے تفصیلات اور تفصیلات کے علاوہ یہاں کچھ اور نہیں ملتا۔ یہ سچ ہے کہ اس دور میں بھی ایسے ارباب نظر موجود تھے جو اس غیر مستحسن تبدیلی کو محسوس کر سکیں ایسی نظریں کمیاب تھیں جو سطح سے گزر کر حقائق کی تہ تک پہنچ سکیں انہیں میں ابن خلدون بھی تھے جیسا کہ مقدمہ میں اشارہ موجود ہے۔ لیکن یہ خال خال مستثنے نظریں تھیں اس کا اثر عام نہیں تھا۔

اس دور انحطاط و تنزل میں یہیں جو تبدیلیاں معلوم ہوتی ہیں جو بنیادی انقلاب نظر آتا ہے، وہ بے حد افسوسناک نظر آتا ہے۔ قدما کا طریقہ تعلیم بھی آہستہ آہستہ بدلنے لگا اور ساتویں صدی کے بعد جو علوم میں انحطاط تھا وہ علوم کے

درس وتدریس کے طریقوں میں ظاہر ہوا۔ قدما علوم کے درس میں اور فنون الٰہیہ
کے درس میں جو طریقے اختیار کرتے تھے اسے املا کہتے ہیں

عربوں نے علوم کی دو قسمیں کی ہیں۔ آلات (فنون الٰہیہ) اور نفس علوم آلات
وہ علوم جو بجائے خود علم نہیں ہیں بلکہ حصول علم کا ذریعہ اور آلہ ہیں۔ جیسے گرامر وغیرہ
اور نفس علوم جیسے فلسفہ و حدیث وغیرہ قدما دونوں اقسام علوم کی تعلیم املا
کے ذریعے سے دیتے تھے۔ خوش قسمتی سے ہمیں ایسی کتابیں اس دور میں مل گئی ہیں
جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور قدیم میں املا کا طریقہ کس لیے رائج تھا۔ جیسے شریف
مرتضیٰ کی کتاب الامالی اور قالی کی کتاب الامالی۔ اس زمانے میں درس کا طرز
تدریس وہی تھا جو آج کل کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پروفیسر کا ہے یعنی طلبا
کے سامنے تقریر کے ذریعہ مطالب کو سمجھانا کتابوں میں جو کچھ موجود ہوتا اسے مدرس
ذہن میں جمع کر لیتا اور اس دماغ سے مستعد ہو کر تدریس کے لئے آتا تھا، یا وہ
طلبا کے سامنے تقریر کرتا اور تقریر میں مطالب سمجھاتا۔ طلبہ نوٹ کر لیتے اور نوٹوں کو
کوئی ہوشیار طالب العلم جمع کر لیتا جس کتاب الامالی کا میں نے ذکر کیا ہے وہ اس طرح کی
تقریروں کا مجموعہ ہے یہ طریقہ ساتویں صدی تک رائج تھا لیکن ساتویں صدی کے بعد
ایک فرق نمایاں ہوتا ہے جب املا کا طریقہ بالکل مفقود ہو جاتا ہے اور املا کی جگہ کتابیں
لے لیتی ہیں۔ متقدمین کو صرف و نحو اور ادب کی تدریس کے لئے بھی زیادہ تر املا پر
اعتماد تھا۔ پہلے علوم الٰہیہ اور نفس علم دونوں کے لئے املا کا طریقہ استعمال ہوتا
تھا اور اب نفس علم کے لئے صرف کتابیں رہ گئی ہیں۔ ذرا اس تفاوت
راہ پر تو غور فرمائیے۔

بظاہر آپ کہیں گے کہ یہ ایک معصوم تبدیلی ہے پہلے متون و شروح نہ تھے
کتابیں نہ تھیں۔ اس لئے قدما املا سے کام چلاتے تھے۔ لیکن کاش یہ معلوم ہوتا

حقیقت تو کچھ اور ہی ہے ایسا نہیں ہے کہ تبدیلی ہوئی کہ اب کتابیں لکھی جانے لگیں ہیں بلکہ اس لئے کہ اب دماغوں کے چراغوں میں نظر و اجتہاد کا روغن ختم ہو چکا ہے دراصل اس بظاہر معصوم تبدیلی کے پیچھے ایک بہت بڑی ذہنی پسپائی اور دماغی تبدیلی پوشیدہ ہے میں کتابوں کا مخالف نہیں اور کتابوں کی مخالفت کون کر سکتا ہے۔ لیکن تکبر کا حقیر بن جانا تنزل کی واضح دلیل نہیں ہے تو کیا ہے بجائے اس کے کہ پڑھنے والے کا دماغ علم و فن کی وادیوں میں کھلے طور پر پڑ سکے۔ اب کتابیں ہیں، پیروں میں زنجیر پڑ گئی اور خیالات محصور ہو کر رہ گئے۔ کتابوں کا بھی ایک حلقۂ اثر اور دائرۂ عمل ہے۔

ہر حقیقت اس وقت تک حقیقت ہے جب تک وہ ایک خاص درجے میں ہے کتابوں کی کورانہ پابندی اور حد بندی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بارہ بارہ چودہ چودہ برس تک سر کھپانے کے بعد صرف چند کتابوں کا علم حاصل ہو جاتا ہے چند کتابوں کے علم اور نفس علم کے حصول میں بڑا فرق ہے۔ مثال کے طور پر علم تفسیر کے درس میں بیضاوی اور جلالین کی قدم قدم پر اعتبار۔ بیضاوی اور جلالین میں الجھ کر رہ جانے والے بہت ہیں بیضاوی اور جلالین کا علم ہو گیا مگر وہ عنقا جس کا نام علم تفسیر ہے اس کی پرچھائیں بھی ان کے ذہنوں پر نہیں پڑی الغرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ روز بروز تعلیم کا ڈھانچہ تنگ ہوتا گیا اور متون و شروح پر حد اعتدال سے آگے بڑھ کر اعتماد و اعتبار کیا جانے لگا۔

متن و شرح کا قاعدہ بھی عجیب تھا۔ متن لکھنے والا اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ عبارت کو زیادہ سے زیادہ پیچیدہ بنایا جائے۔ اور شارح پھر بال کی کھال نکالتا تھا۔ اور تفصیلات کا ایک طلسم تیار کر دیتا تھا کہ اس میں اصل مقصود گم ہو جاتا ہے مثال کے طور پر ضمیروں کے استعمال کو لیجیے۔

اگر متن نویسوں کو تین باتوں کا ایک ساتھ تذکرہ کرنا ہوتا تھا تو وہ تینوں باتوں کا ذکر کر کے ایک ضمیر بعد میں استعمال کرتا کہ اس سے یہ ہوتا ہے۔ اب شارحین اس کے اصل مرجع کا سراغ لگاتے اس پر باقاعدہ بحثیں ہوتیں اور ضمیر و مرجع کے بحث میں نفس مضمون کھو جاتا۔

کہا جاتا ہے کہ ایسے متون سے حل عبارت کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے لیکن حل عبارت کے لئے تو آپ اور بھی بہت سے طریقے استعمال کر سکتے ہیں آپ قاری اور طالب کو اس طرح کیوں الجھائیں کہ اصل علم کا بڑا حصہ بیکار بحثوں میں صرف ہو جائے مثلاً منطق کی کتابوں پر نظر ڈالئے منطق کی تعلیم کا تو یہی مقصد ہے کہ منطق میں اس شخص کے دماغ میں جو اس علم کی تحصیل کا شائق ہے ایک براہ راست رشتہ قائم ہو لیکن کتابیں اس طرح پر لکھی گئی ہیں کہ دماغ کی قوتیں اس بات پر صرف ہو جاتی ہیں کہ سطر کا اصل مطلب کیا ہے۔ کچھ دیر کے لئے اس وادی کی اور سیر کیجئے شرح ملا سبھی نے پڑھی ہوگی لوگ جانتے ہیں کہ کتاب علم و نحو کی ہے۔ لیکن آپ ہی انصاف سے بتائیے کہ کیا منطق کے علم و نحو کی ہے۔ لیکن آپ ہی انصاف سے بتائیے کہ کیا منطق کے علم کے بغیر اس کتاب کا سمجھنا ممکن ہے؟ جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس سے چیزیں اچٹتی ہوئی نگاہوں کے سامنے سے گزر جاتی ہیں۔ اور طرز تدریس لوگوں کو کوڑ مغز بننے پر مجبور کرتا ہے۔ برسوں سے بلکہ تیس برس سے میرا خیال انہی مباحث پر مرکوز رہا ہے اور مثالوں پر مثالیں انبار کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً کون انکار کر سکتا ہے کہ علامہ تفتازانی ایک غیر معمولی شخصیت کے عالم تھے۔ ان کے متون و شروح ان کی زندگی ہی میں بیحد مقبول ہوئے اور ان کی کتابیں آج تک داخل درس ہیں اور اس کے لئے ہم سب ان کے شکر گزار ہیں کون ایسا ہے کہ جس نے ان کی

کتاب مطول نہ پڑھی ہو۔ مگر ہمیں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ان کی کتابوں نے ایک حد تک نقصان پہنچایا ہے۔ ایک خاص طرز عبارت، معیار بلاغت بن گیا حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ عربی بلاغت کی تعلیم کا مطول سے قطعی طور پر نقصان پہنچا اسرار البلاغت وغیرہ یا سکاکی ،، کی ،، مفتاح ،، وغیرہ سب ایک ہی حقیقت کے جلوے ہیں۔ بہر حال نویں صدی کے بعد درس و تدریس اور علم و تعلیم میں جو پیدا ہوا وہ انحطاط و تنزل کا بے لذا ہوا افسانہ ہے۔

ترقی و تنزل کا معاملہ عجیب ہے آپ کتنی ہی کھلتی ہوئی نگاہیں رکھتے ہوں۔ مگر ترقی و تنزل کو فوراً محسوس کرنا دشوار ہے ان کی رفتار غیر مرئی ہے یہ بہت دھیمی چال چلتی ہیں ان کی رفتار اتنی سست ہے کہ ننگی آنکھوں سے پتہ چلنا دشوار ہے۔ یہ آہستہ آہستہ چلتی رہتی ہیں اور کافی راہ طے کر لیتی ہیں۔ تو آپ کو اچانک پتہ چلتا ہے کہ یہ ہر آن و ہر لمحہ چلنے والی شے کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ گھڑی کے گھنٹوں کے کانٹے کی چال کی طرح ان کی رفتار غیر محسوس ہوتی ہے جب کافی مسافت طے ہو جاتی ہے تب نگاہیں چونکتی ہیں یہی دماغی ترقی و تنزل کا افسانہ ہے۔ کوئی مورخ بتا سکتا ہے کہ فلاں سن فلاں تاریخ، فلاں وقت ترقی یا تنزل شروع ہوا بعینہٖ یہی حال اسلامی علوم کی داستان تنزل کا ہے۔

ساتویں صدی کے بعد تنزل ہر جگہ کھڑا نظر نہیں آئے گا، وہ آتا ہے اور لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ اس کے بعد بھی مدارس آباد ہیں۔ ائمہ علم و فضل درس دے رہے ہیں اور طالب علم طلب علم کی وادیوں میں مصروف جستجو ہیں

یہ سب صحیح و درست تاہم تنزل اپنی جڑ پکڑ چکا تھا۔ پس ذرا سا وقت مطلوب تھا۔ بیج پودا بنے۔ اور پودا درخت، پھر درخت اتنا بڑھے کہ ہر آنکھ دیکھے، جب درخت کی شاخیں کافی پھیل چکیں۔ تب ہم نے اس کے درخت کو دیکھا۔ اور قیاس کیا کہ اب سے بہت دن پہلے اس درخت کا بیج ڈالا گیا ہو گا۔

بہرحال اسلامی علوم کے تنزل کا بیج ساتویں صدی میں جڑ پکڑ چکا تھا چھٹی صدی عجب بے چینیوں کی صدی ہے، خلافت عباسیہ کا خاتمہ، بغداد کا قتل عام، تاتاریوں کی یلغار، نقشہ بدل چکا تھا۔ تنزل کی نیو پڑ رہی تھی اب یہاں پہ اس حقیقت کو یاد رکھئے کہ بدقسمتی سے ہندوستان میں عربی کی درس و تدریس کی بنیاد ہی دور ترقی کا نتیجہ نہ تھی۔ دور تنزل کے خمیر سے تھی۔ اس لئے وہی تنزل وہی انحطاط اس کی رگ رگ میں سمویا ہوا ہے۔ خیر اس داستان درد کے بہت سے پہلو ہیں، اسے کہاں تک دہراؤں۔

ہمیں یہ تسلیم کرنا ہی ہو گا کہ جس ڈھنگ پہ اسلامی و عربی علوم کی تدریس کا سلسلہ جاری ہے اس کی اصلاح ہونی چاہیئے اصلاح کا خیال بھی کچھ نیا نہیں ہے سب سے پہلے بیرم ملونسی نے انیسویں صدی کے نصف ابتدائی دور میں اس ضرورت کو محسوس کیا۔ اس نے تمام اسلامی ممالک کا تفصیلی سفر کیا اور گیارہ جلدوں میں سفرنامہ مرتب کیا ہے جو مصر میں چھپا بھی ہے۔

موجودہ دور میں سب سے پہلے اسی اسلامی عالم نے اصلاح کا علم بلند کیا، اس کے بعد مرحوم شیخ محمد عبدہٗ نے پیرس سے جمال الدین افغانیؒ کے ساتھ "عروۃ الوثقیٰ" اخبار نکالا۔ اس اخبار کے چودہ ہی نمبر نکل سکے۔ لیکن یہ ایک نئی صدا تھی۔ پھر بیروت میں شیخ عبدہٗ نے ایک لائحۂ اصلاح مرتب کیا اور اسے

شیخ الاسلام کے پاس بھیجدیا۔ اس لائحہ میں یہ تجویز کی گئی تھی کہ استنبول میں ایک نیا معیاری مدرسہ قائم کیا جائے شیخ مرحوم کو یہ امید تھی کہ شیخ الاسلام کی حمایت سے یہ کام آگے بڑھایا جاسکے گا۔ لیکن شیخ الاسلام نے جواب بھی نہیں دیا۔ شیخ محمد عبدہٗ مرحوم نے جو مجموعہ مضامین شائع کیا ہے اس میں یہ لائحہ عمل بھی موجود ہے۔

آج جبکہ میں لکھنؤ میں آپ حضرات کے سامنے تقریر کر رہا ہوں، تو میرے ذہن میں فطری طور پر یہ خیال آیا ہے کہ اصلاحی اقدامات سے اس مبارک شہر کو خاص وابستگی ہے، آج یہ یاد دلانا بہت آسان ہے کہ پھر اس اصلاح نصاب کو لکھنؤ ہی میں ندوۃ العلماء نے اٹھایا، یہ مدرسہ آج بھی بہت سی خصوصیتیں رکھتا ہے۔ ندوۃ العلماء کے مقاصد میں اصلاح نصاب بھی تھا۔ مختلف وجوہ کی بنا پر یہ گتھی سلجھ نہ سکی پھر بھی اصلاح کے سلسلہ میں ندوۃ نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ ہمیں اس مسئلہ کے حل میں مدد دیں گی۔

حضرات آپ خود محسوس کرتے ہوں گے کہ اصلاح کا مسئلہ کتنا اہم ہے میں کہوں گا کہ جو حضرات عربی تعلیم و تدریس کے ذمہ دار ہیں وہ اپنی ذمہ داریوں کے لئے نہ صرف اہل ہندوستان بلکہ تمام عالم اسلامی کے سامنے جواب دہ ہیں اور مجھے اس کے اظہار میں باک نہیں ہے کہ ایسے حضرات موجود ہیں۔ جو اس ذمہ داری کو محسوس کرتے ہیں۔

معاف کیجئے گا۔ یہ داستان بہت طویل سے طویل تر ہوتی جارہی ہے اکثر درد دل سنانے میں طول و اختصار سے بیگانہ ہو جانا پڑتا ہے لیکن میں آپ کا وقت عزیز زیادہ نہیں لینا چاہتا۔ اور آپ کو ان مہمات

کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں، جن پر آپ حضرات کو اور اس کمیٹی کو غور کرنا ہے
سب سے پہلے فنون الہٰیہ کی تعلیم کے مسئلہ کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ ہمارے
موجودہ طریق تعلیم میں فنون الہٰیہ کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ اس شعبۂ تعلیم کی اہمیت
سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ فنون الہٰیہ
وسیلہ ہیں مقصد نہیں اس سے بڑی غلطی نہیں ہو سکتی کہ وسیلہ کو مقصد
بنا لیا جائے، صرف ونحو ضروری ہیں۔ ان کے بغیر عربی زبان کو نہیں پا سکتے
ان کے بغیر آپ اسلامی علوم کو نہیں پا سکتے، یہی علم وادب کا ہے کہ جب
تک صحت ذوق وسلامتی طبع کے ساتھ آپ اس کے حصول میں
کوشاں نہ ہوں گے۔ اسلامی علوم کے خزانے آپ کے لئے بند
ہی رہیں گے۔

یہی داستان کم وبیش منطق وفلسفہ کی ہے لیکن افسوس کے ساتھ
کہنا پڑتا ہے کہ آج ان علوم کی تعلیم صحیح طور پر نہیں ہو رہی ہے۔ طالب علم کے
دوسرے مقامات کے برعکس ہندوستان میں تین تین بوجھ لاد دیئے گئے ہیں
ان میں ایک بوجھ تو عربی زبان کے حصول کا بوجھ ہے دوسرا اصل عبارت کا بوجھ اور
تیسرا بوجھ اس کے سیکھنے کے لئے زبان فارسی کا بوجھ۔

آپ حضرات واقف ہیں کہ یہاں صرف کی تعلیم کا ذریعہ فارسی ہے میزان
منشعب، پنج گنج، اس کی مثالیں ہیں، یہاں کی دفتری زبان بھی فارسی تھی
اور مسلمان علی العموم فارسی زبان سے واقف تھے، اس وقت تو فارسی زبان
کو ذریعہ تعلیم بنانے کا ایک سبب بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن آج اس کی
کیا حاجت ہے۔

فن تعلیم کے اعتبار سے جو کھلا ہوا طریقہ ہونا چاہیئے وہ آج نہیں

ہے اگر طالب علم کی قوتوں کو مختلف باروں سے دبا دینے کے بجائے اس کی قوت صرف ایک ہی نہج پہ صرف ہوتی تو عربی نحو اس کے دماغ میں بآسانی آشیانہ بنا لیتی لیکن موجودہ طریق تعلیم کی بدولت اس کا دماغ بھٹکتا پھرتا ہے اور خیالات منتشر ہو جاتے ہیں

اس لئے سب سے پہلی بات جو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں عربی علوم کی تعلیم جو شروع کی جائے تو اس کی پہلی رونمائی مادری زبان میں ہو، عروس علم کا گھونگھٹ جو کھلے اور ہٹے تو مادری زبان میں تاکہ جب چہرے سے نقاب الٹی جائے اور علم کا روئے زیبا سامنے آئے تو طالب علم کا دل بول اٹھے کہ یہ تو جانی پہچانی صورت ہے۔ اگر آپ فارسی بھی پڑھانا چاہتے ہوں تو ضرور پڑھائیے لیکن فارسی کی تعلیم ایک علیحدہ چیز ہے غلط مبحث کیوں کیجئے۔

اس طرح متون و شروح کا معاملہ حد اعتدال سے گزر گیا ہے اس کے بارے میں، میں پہلے بھی کافی کہہ چکا ہوں، اور ہمیں اس طرف اصلاحی قدم اٹھانا چاہیے۔

یہی حال عربی علم و ادب کی تعلیم کا ہے۔ مختلف اسباب و وجوہ کی بنا پر اور ہماری بدقسمتی سے ہندوستان میں عربی علم و ادب کی تعلیم ہمیشہ کمزور رہی اگر ہندوستان کے صحیح عربی علم و ادب کے جاننے والوں کا شمار کیا جائے تو ان کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں پہ گنی جا سکتی ہے اور مجھے تو شک ہے کہ اس وقت بھی مجھے ایک ہاتھ کی سب انگلیاں گننا پڑیں گی۔

عربی ادب کی دو فنی شاخیں ہیں، فن بدیع اور فن کتابت، فن بدیع ایک طرح کی صنعت گری ہے۔ لفظی طلسمات کا ایک جنگل ہے۔ ترقی کے زمانے میں نظر معانی پر رہتی ہے، اور دورِ تنزل میں نقش آرائیوں کا دور دورہ ہوتا ہے، لفظوں کا ایک گورکھ دھندا بنایا جاتا ہے۔ جیسا کہ شاعری کا حال ہے۔ لیکن فن کتابت صحیح ادبی ڈھنگ اور طرز انشا پر کسی چیز کے لکھنے کو کہتے ہیں۔

ہمارے یہاں فن بدیع کو فن کتابت سمجھ لیا گیا ہے اور بدائع کو وہی اہمیت دی گئی ہے کہ جو درحقیقت فن کتابت کا حق ہے۔ نثر میں فن بدیع پر زیادہ زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم لفظوں کے جال میں پھنس کے رہ گئے ہماری علم و ادب کی تعلیم مقامات کے طریقوں کی گرویدہ ہے۔ مقامات حریری اور مقامات بدیع الزماں کو ہم نے نفس ادب سمجھ لیا ہے۔ آپ مجھے بتائیے کہ آپ نے فن کتابت کی کون سی کتابیں اپنے درس میں رکھی ہیں۔ ہم عربی تعلیم کے اصول پر ۱۴-۱۵ برس صرف کر دیتے ہیں۔ اور ہم دس سطریں بھی ٹھکانے سے نہیں لکھ سکتے۔ فن کتابت پر بہترین کتابیں موجود ہیں، علم و ادب کی محفل میں سینکڑوں شمعیں جگمگا رہی ہیں۔ مگر ہم اپنی آنکھیں بند کئے ہیں۔ ہماری ناقدری ہے کہ ہم نے ان کتابوں کو طاق نسیاں پہ رکھ دیا ہے۔ مقامات وغیرہ ہمیں ہرگز درس میں نہیں رکھنا چاہئے اور ان کی جگہ صحیح ادب و انشا کی تعلیم دینا چاہتے ہیں۔

فنونِ الیہ کی بحث سے گزر کر ہم معقولات کی طرف جائیں۔ تو وہاں بھی کچھ یہی رنگ ہے۔ معقولات کو عربی ادب میں کافی اہمیت دی جاتی ہے اور درس نظامیہ جس کی تعلیم آج کل دی جا رہی ہے اس کی

بنیاد اسی پر ہے کہ اس پر زیادہ سے زیادہ معقولات ہو، چنانچہ اس وقت درس نظامیہ میں معقولات کا عنصر اتنا چھا گیا ہے کہ اس کے نیچے علوم اسلامیہ بھی دب کے رہ گئے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ درس نظامیہ ہماری ضروریات کی ہرگز کفایت نہیں کرتا۔

اس بارے میں میرا دل انتہائی زخمی ہے۔ میں نے بھی عربی تعلیم انہیں مدارس میں پائی ہے۔ جن کے آپ نمائندے ہیں۔ میں نے انہیں مدرسوں کے پھٹے ٹاٹوں پر بیٹھ کر عربی علوم کے درس لئے ہیں۔ اسی لئے میں اعتراض کی غرض سے نہیں بلکہ درد دل کے اظہار کے لئے اپنا زخم دل دکھانا چاہتا ہوں۔

ہم معقولات کی تعلیم میں ساری دنیا سے ڈیڑھ سو برس پیچھے ہیں۔ مثلاً فلسفہ کی تعلیم کو لے لیجئے، موجودہ دور میں فلسفہ نے جو ترقی کی ہے اور نئے فلسفیانہ مباحث جو اس وقت مفکرین کے پیش نظر ہیں۔ ان سے ہمارے معقولات نا آشنا ہیں۔ ہمارا فلسفہ یونانی فلسفہ کی آخری سرحد تک جا کے رک جاتا ہے۔ اور اس کے بعد خود ایک نیا راستہ اختیار کرتا ہے۔ جسے فلسفہ کی تاریخ میں ایک نئے عہد سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس عہد کا فلسفہ یونانی فلسفہ کو موجودہ فلسفہ کے قریب کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عربوں نے اپنی فلسفیانہ جدوجہد میں جو یادگاریں چھوڑی ہیں وہ بے حد عظیم ہیں۔ اگر یہ کڑی نہ ہوتی تو شاید نئے دور میں جو اٹھان ہوئی وہ اس شکل میں نہ ہو سکتی۔ اسے یورپ کے مستند عالم بھی تسلیم کرتے ہیں۔

ہمارا فرض ہے کہ اس ورثہ کو محفوظ رکھیں اور اس کی عظمت کو قائم

رکھیں لیکن عہد حاضر کا فلسفہ جو نئے مسائل ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور تاریخ فلسفہ کی تعلیم از حد ضروری ہے۔ ہمیں زمانے کی رفتار کو پیش نظر رکھنا ہی پڑے گا۔

زمانے سے قدامت پرستی ہمیشہ لڑتی رہی ہے۔ قدامت پرستی نے جب ہتھیار اٹھایا تو کشمکش ضرور ہوئی۔ مگر قدامت پرستی ہاری اور وقت جیتا۔ ہم وقت سے لڑ نہیں سکتے۔

پرانے زمانے میں بھی لوگ علم و عمل کے تمام میدانوں میں مصروف تگ و دو رہتے تھے۔ اور انھوں نے مختلف حیثیت سے امتیاز حاصل کئے ہیں۔ زمین کے بندوبست کو لیجئے۔ یہ ٹوڈرمل سے منسوب ہے۔ لیکن ٹوڈرمل کی کوشش پہلی نہ تھی۔ پہلی بنیاد شیر شاہ کے زمانہ میں پڑی ہے اس کا اصلی نقشہ فتح اللہ شیرازی نے بنایا اور ٹوڈرمل نے ہاتھ بٹایا۔

حکیم فتح اللہ شیرازی ایک شیرازی پروفیسر تھا۔ اکبر کے زمانہ میں ہندوستان آیا اور مملکت میں کافی دخیل ہو گیا۔ اس نے پورا رسالہ اسی موضوع پر لکھا ہے۔ اسی طرح پرانے زمانے میں لوگ بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہوتے تھے۔ اور یہی عربی فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بلند مقامات پر پہنچتے تھے۔ یہ چیز آپ بھول گئے کہ تعلیم اور زمانہ کی چال میں باہمی رشتہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ تعلیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ آپ کہیں گے کہ پہلے بھی تو لوگ یہی تعلیمیں حاصل کرتے تھے۔ یہ سچ ہے لیکن اس وقت زمانہ ۱۹۴۷ء کا نہیں تھا۔ اس وقت تعلیم و زمانہ میں رشتہ تھا۔ اس کے بعد زمانہ پوری تیز رفتاری سے چلتا رہا اور آپ بیٹھے رہے اب وقت آگیا ہے کہ آپ نصاب تعلیم کی از سر نو تشکیل کریں اور زمانہ کے رخ کو پہچان کر آگے بڑھیں ٭ ٭ ٭

دوسرا حصّہ

اس حصّہ میں
وہ تقریریں
شامل ہیں۔
جو قیام پاکستان کے
بعد مولانا نے
مختلف موقعوں
پر کیں ۔

قیام پاکستان کے بعد حضرت
مولانا نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں
ہندوستانی مسلمانوں کے ایک
عظیم الشان اجتماع کو جامع
مسجد دہلی میں خطاب
فرمایا۔ یہ تقریر خطابت کا بے نظیر
شاہکار ہے :-

ایک تاریخی تقریر

عزیزانِ گرامی!

آپ جانتے ہیں کہ وہ کونسی زنجیر ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لئے شاہ جہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع نیا نہیں ہے۔ میں نے اس زمانے میں بھی کہ اس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں تمہیں یہیں خطاب کیا تھا، جب تمہارے چہروں پر اضمحلال کے بجائے اطمینان اور تمہارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد تھا۔ آج تمہارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند سالوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔

تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں یہیں سے پکارا، اور تم نے میری زبان کاٹ لی، میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر لئے، میں نے چلنا چاہا

تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے۔ میں نے کروٹ لینی چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی، حتیٰ کہ پچھلے سات سال کی "تلخ نوا سیاست" جو آج تمہیں داغ جدائی دے گئی ہے۔ اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرے کی ہر شاہراہ پر جھنجوڑا، لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا، بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج ان ہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے جن کا اندیشہ تمہیں صراط مستقیم سے دور لے گیا تھا۔

سچ پوچھو تو اب میں جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا، جس نے وطن میں رہ کر غریب الوطنی کی زندگی گذاری ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو مقام میں نے اپنے لئے چن لیا تھا وہاں میرے بال و پر کاٹ لئے گئے ہیں یا میرے آشیانے کے لئے جگہ نہیں رہی۔ بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی ہے، اور میرے دل کو صدمہ ہے سوچو تو سہی تم نے کونسی راہ اختیار کی۔ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں؟ اور کیا تمہارے حواس میں اختلال نہیں آ گیا۔ یہ خوف تم نے خود فراہم کیا ہے۔ یہ تمہارے اپنے ہی اعمال کے پھل ہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ ڈر قوموں کی حیات معنوی کے لئے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہوا ہے۔ نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ لیکن تم نے سنی اور ان سنی برابر کر دی۔ اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی رفتار تمہارے لئے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں۔

تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہارا بھروسہ تھا وہ

تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے ہیں۔ وہ تقدیر جو تمہارے دماغی لغت میں مشیت کی منشا سے مختلف مفہوم رکھتی ہے۔ یعنی تمہارے نزدیک فقدانِ ہمت کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی، اور راہ نمائی کے وہ بت جو تم نے وضع کئے تھے وہ بھی دغا دے گئے، حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لئے بچھائی گئی ہے اور ان ہی بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے۔

میں تمہارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا۔ اور تمہارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں لیکن اگر کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ تو تمہارے لئے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں۔

ایک وقت تھا میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمہیں پکارا تھا اور کہا تھا۔

"جو ہونے والا ہے، اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں بھی سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے۔ اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلو تہی کی، اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا تو مستقبل کا مورخ لکھے گا کہ :-

تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا جو

صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوا ہوا کرتا ہے:

اور آج ہندوستان آزاد ہے، اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، کہ وہ سامنے لال قلعہ کی دیوار پر آزاد ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔

یہ وہی جھنڈا ہے، جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے آزاد قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق کروٹ لی۔ بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی ہے اور یہی وہ انقلاب ہے جس کی ایک کروٹ نے تمہیں بہت حد تک خوفزدہ کر دیا ہے، تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھین گئی۔ اور اس کی جگہ بری شے آ گئی ہے۔

ہاں تمہاری بے قراری اس لئے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شے کے لئے تیار نہیں کیا تھا۔ اور بری شے ہی کو ملجا و ماوی سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے۔ جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے، ایک دن تھا جب تم کسی جنگ کے آغاز کی فکر میں تھے اور آج اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمہاری اس عجلت پر کیا کہوں کہ ادھر ابھی سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور ادھر گمراہی کا خطرہ بھی پیش آ گیا ہے

میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سیاسیات کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور کبھی اس پر خار وادی میں قدم نہیں رکھا یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لئے ہوتی ہیں۔ لیکن

آج مجھے جو کہنا ہے میں اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں۔
مذہبی اختلافات کو جس ڈھب سے ہوا دی گئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے جو ہم نے اپنی آنکھوں دیکھے اور بدقسمتی سے بعض مقامات پر ابھی تک موجود ہیں۔

پچھلے سات برس کی روداد دہرانے سے کوئی خاص فائدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ البتہ ہندوستان کے مسلمانوں پر مصیبتوں کا جو ریلا آیا ہے۔ وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں کا ہی نتیجہ ہے۔ یہ سب کچھ مسلم لیگ کے لئے تو موجب حیرت ہو سکتا ہے۔ لیکن میرے لئے اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ میں پہلے دن ہی سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا۔

اب ہندوستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے۔
اب یہ ہمارے اپنے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے انداز فکر میں سوچ سکتے ہیں یا نہیں؟ اسی خیال سے میں نے نومبر کے دوسرے ہفتے میں ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں کو دہلی بلانے کا قصد کیا ہے۔ دعوت نامے بھیج دئے گئے ہیں۔ ہراس کا یہ موسم عارضی ہے۔ میں تم کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کر سکتا۔

میں نے تمہیں ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شک سے ہاتھ اٹھا لو، اور بدعملی کو ترک کر دو، یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے۔ جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمہارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہیں۔
یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر

پر بھی غور کرو ۔ تمہیں محسوس ہوگا کہ یہ غلط ہے ۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو ۔ اور پھر دیکھو کہ تمہارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں ۔ آخر کہاں جا رہے ہو؟ اور کیوں جا رہے ہو؟

یہ دیکھو! مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے ۔ حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے ۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرلو ۔ جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش و خروش بے جا تھا اسی طرح آج تمہارا یہ خوف و ہراس بھی بے جا ہے ۔ مسلمان اور بزدلی، یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے ۔ سچے مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے، چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں انھوں نے تمہیں جانے ہی کے لئے اکٹھا کیا تھا ۔ آج انھوں نے تمہارے ہاتھ میں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے تو یہ عیب کی بات نہیں یہ دیکھو کہ تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے ۔ اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں تو ان کو اپنے اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امی کی معرفت فرمایا تھا ۔ ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا و لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون ط

جو خدا پر ایمان لائے اور جس پر جم گئے تو پھر ان کے لیے نہ تو کسی کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم ۔ ہوائیں آتی اور گذر جاتی ہیں ۔ یہ صرصر سہی لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں

ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا یہ موسم گذرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں۔ لیکن مجھے تمہاری تغافل کیشی کے پیش نظر بار بار کہنا پڑتا ہے کہ تیسری طاقت اپنے گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی، اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے اگر اب بھی تمہارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی، پھر حالت دوسری ہے۔ لیکن واقعی تمہارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی ہے تو پھر اس طرح بدلو جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔

آج بھی کہ ہم ایک دور انقلاب کو پورا کر چکے ہیں ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں۔ اور ہم انہیں صفحوں میں زیب عنوان بن سکتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لئے تیار بھی ہیں۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لئے تیار نہ تھے۔ بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے۔ لیکن سورج تو چمک رہا ہے اس سے کرنیں مانگ لو۔ اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو۔ جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو۔ اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو۔ جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں جو اجلے نقش و نگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آرہے ہیں وہ تمہارا ہی قافلہ لایا تھا۔ انھیں بھلاؤ نہیں۔ انہیں چھوڑو نہیں۔ ان کے وارث بن

کر رہو، اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لئے تیار نہیں تو پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔

آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے۔ ہم اس کے لئے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے رہیں گے۔

آج تم زلزلوں سے ڈرتے ہو کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو۔ کیا یاد نہیں رہا کہ تمہارا وجود ایک اجالا تھا۔ یہ بادلوں کی سیل کیا ہے کہ تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائنچے چڑھا لئے ہیں۔ وہ تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اتر گئے پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا۔ بجلیاں آئیں تو ان پر مسکرا دیتے، بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اٹھی تو رخ پھیر دیا۔ آندھیاں آئیں تو ان سے کہا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبان کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے ہیں کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہ تھا،

عزیزو! میرے پاس تمہارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے چودہ سو برس پہلے کا پرانا نسخہ ہے۔ وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا اور وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان لا تہنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ آج کی صحبت ختم ہو گئی۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں اختصار کے ساتھ کہہ چکا۔ پھر کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں اپنے حواس پر قابو رکھو۔ اپنے گرد و پیش اپنی زندگی خود فراہم کرو، یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمہیں خرید کر لا دوں۔ یہ تو دل کی دکان ہی سے اعمال صالحہ کی نقدی پر دستیاب ہو سکتی ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

زباں ز نطق فرو ماند و سخن باقی است　　بضاعت سخن آخر شد و سخن باقی است

٭ ٭ ٭

عورت کی فرشتگی

"حقیقت یہ ہے کہ اگر پاکبازی و عصمت کے لحاظ سے دونوں جنسوں میں تفریق ہی کرنی ہو تو ہر طرح کی نفس پرستیوں اور مکاریوں کی حیوانیت مرد کے حصہ میں آئے گی۔ اور ہر طرح کی پاکیوں اور عفتوں کی فرشتگی عورت کے لئے ثابت ہوگی۔

یہ مرد ہی ہے جسکی حیوانیت پر عورت کی فرشتگی شاق گذرتی ہے وہ چاہتا ہے کہ اسے بھی اپنی ہی طرح کا حیوان بنادے، اس لئے اپنے کید عظیم کے سارے فتنے کام میں لاتا اور برائیوں کی ایک ایک راہ اسے آشنا کر کے چھوڑتا ہے پھر جب وہ اس کے پیچھے قدم اٹھادیتی ہے تو اس سے گردن موڑ لیتا ہے اور کہنے لگتا ہے اس کا کید تو سب سے بڑا کید اور اس کی برائی سب سے بڑی برائی ہے! فی الحقیقت سب سے بڑا کید تو مرد ہی کا ہے جو پہلے اسے اپنی برائی کا آلہ بناتا ہے اور جب بن جاتی ہے تو خود پاک بنتا ہے اور ساری ناپاکیوں کا بوجھ اس معصوم کے سر ڈال دیتا ہے۔ دنیا میں کوئی عورت بری نہ ہوتی اگر مرد اسے برا بننے پر مجبور نہ کرتا۔ عورت کی برائی کتنی ہی سخت اور مکروہ صورت میں نمایاں ہوتی ہو لیکن اگر جستجو کروگے تو تہہ میں ہمیشہ مرد ہی کا ہاتھ دکھائی دے گا۔ اور اگر اس کا ہاتھ نظر آئے تو ان برائیوں کا ہاتھ ضرور نظر آئے گا جو کسی نہ کسی شکل میں اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں"۔ ⁂

۱۹۴۷ء میں ایک پریس کانفرنس میں
مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا۔

تعلیم کے زاویئے

یہ امر مسلمہ ہے کہ قومی تعلیم کا نظام ایک ایسی اساسی اہمیت کا حامل ہے کہ دنیا کی کسی حکومت کو بھی اس سے مفر نہیں معاشرہ کی صورت حال کا جائزہ اس کے افراد کی ہیئت کذائی سے لیا جاتا ہے اور اگر نظر غور دیکھا جائے تو افراد کی حقیقت طرز تعلیم سے آشکارا ہوتی ہے۔ حقیقت حریت اور انسانیت کی بنیاد پر جس نظام تعلیم کا داغ بیل پڑتی ہے۔ اس سے افراد کی روش فکر اور انداز خیال بدل جاتا ہے اور وہ شاہراہ ترقی پر گامزن ہو جاتے ہیں اس کے برعکس وہ نظام تعلیم جو کسی ضابطے یا غور وفکر کے بغیر وجود میں آیا ہے ان تمام امیدوں پر پانی پھیر دیتا ہے جو برسوں سے قومی آزادی کے علمبرداروں کے سینوں میں کروٹیں لیتی رہی ہیں، ہماری موجودہ قومی تعلیم کا انداز اور اس کے اصول و ضوابط لارڈ میکالے کے ذہن کی اختراع ہیں۔ میکالے نے غیر مبہم الفاظ میں یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ میں اس طرز تعلیم سے ہندوستان (غیر منقسم) میں ایسے لوگوں کی کھیپ تیار کرنا چاہتا ہوں۔ جن کی ہمدردیاں اور وفاداریاں نہ صرف نظریاتی اعتبار سے بلکہ عملی حیثیت میں بھی برطانیہ عظمیٰ کے مفاد سے وابستہ ہوں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس طرز تعلیم سے جو فوائد حاصل ہوئے ہیں بے شمار ہیں، مثلاً یہی تعلیم ہے جس نے ہمیں دنیائے سائنس اور جدید علوم وفنون سے آشنا کیا۔ اسی تعلیم نے ہمارے اندر ترقی کی روح پھونکی اور اسی کی بدولت ہم اس قابل ہوئے کہ دوسری ترقی یافتہ اقوام کے ہم دوش وہم قدم رہ سکیں۔ ہمارے اندر قومی

روح کی بیداری یا ترقی یافتہ انداز فکر کی تخلیق کا باعث یہی تعلیم ہے۔ محدود دائرے میں عبقریت و نبوغ کی راہیں اگر کھلی ہیں تو اسی تعلیم سے۔ ہندوستان کی قدیم روایاتی (دیومالائی) زندگی کا جوا جن تعلیم یافتہ افراد نے اپنے کاندھوں سے اتار پھینکا ہے وہ بھی اس مغربی طرز تعلیم سے اثر پذیر ہوئے ہیں۔

میکالے کے انداز تعلیم سے جو نقصانات ہوئے ہیں ان کی فہرست اچھی خاصی طویل ہے۔ مثلاً اس فرد میں یہ رجحان پیدا کر دیا ہے کہ وہ اپنے اسلاف کی ذہنی میراث سے نہ صرف بے تعلقی بلکہ نفرت و حقارت کا اظہار کرتے ہیں۔ ذہنی میلانات کے دھاروں کا رخ اس تعلیم نے کہیں سے کہیں پھیر دیا ہے۔ مشرقی تعلیم سے میکالے کو جو شدید نفرت تھی۔ اس نے اس کے بیج بونے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ تاریخ اس طرزِ تعلیم کے لئے کوئی وجہ جواز پیش کرنے سے قاصر ہے۔ جس کی طرح میکالے نے ڈالی تھی۔ میکالے کی یہ دلیل کہ سنسکرت اور فارسی کو ذریعہ تعلیم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ غلط نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حجت لغو ہے کہ ذریعہ تعلیم صرف انگریزی زبان ہو سکتی ہے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان کی مختلف صوبائی زبانیں اپنے اندر اتنی وسعت اور جامعیت نہیں رکھتی تھیں کہ انہیں اعلیٰ پیمانے پہ ذریعۂ تعلیم قرار دیا جا سکے لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اگر کوئی قومی حکومت انہیں ترقی دینا چاہتی تو اس کے امکانات تھے ضرور۔

ماضی میں ماہرین تعلیمات کی اکثریت لادینی تعلیم کا رواج پایا جاتا تھا۔ جن ماہرین تعلیمات کا زاویۂ تعلیم کچھ مختلف ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ ایسا نظام تعلیم جس میں مذہب کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے، لایعنی اور بے بنیاد ہے۔ چنانچہ آج برطانیہ عظمیٰ میں حکومت کے زیر سرپرستی جو نظام عمل میں آیا ہے اس کی حیثیت لادینی نہیں ہے۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے۔ روس نے

بھی ماضی قریب میں مذہبی تعلیم افادیت تسلیم کرلی ہے اور اس سلسلے میں اس نے تحریک بھی شروع کردی ہے۔

ایک اور پہلو جس پر میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں وہ مسیحی انجمنوں کی تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق ہے۔ انگلستان سے بعض احباب نے مجھے ان اخبارات کے تراشے بھیجے ہیں جن میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسیحی انجمنوں نے جدید تعلیم کی اشاعت اور جدید زاویۂ نگاہ کی پیش رفت میں کافی سے زیادہ حصہ لیا ہے ان کی سرگرمیوں کا دائرہ صرف ہندوستان تک محدود نہیں بلکہ ان کی لپیٹ میں مشرق کے دیگر ممالک بھی آجاتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے ممالک سے متعلق میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ ۱۹۰۷ء سے قبل ترکی میں وہ واحد ادارہ جو جدید اعلیٰ تعلیم کے لئے مخصوص تھا۔ رابرٹ کالج کے نام سے مشہور تھا اور اس کے اہتمام کی باگ ڈور امریکی مشن کے ہاتھوں میں تھی۔ ترکی کے نشاۃ ثانیہ اور اس کی بیداری میں اس مشن نے جو خدمات پیش کی ہیں۔ ان سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

شام میں جدید تعلیم کی ترویج واشاعت کا سہرا ان مسیحی مبلغین کے سر ہے جنھوں نے بیروت میں تین کالجوں کی بنیاد ڈالی۔ امریکی مشنری کالج بھی انہی میں سے ایک تھا جسے الکلیۃ السوریا، کے نام سے یاد کیا جاتا تھا عراق کی اعلیٰ تعلیم کلیہ قدیس یوسف، یعنی سینٹ جوزف کالج کی شرمندہ احسان ہے۔

مصر میں بھی کچھ اسی قسم کی داستان دہرائی گئی یہ درست ہے کہ محمد علی نے ۱۹ویں صدی کے ربع اول میں ''ارسالیات'' نام کے یورپ کے لئے ماوراالنہری وظائف مقرر کئے تھے لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ مصری نشاۃ ثانیہ کی

اکثر وبیشتر شخصیتیں بیروت کے مشنری کالج کی فارغ التحصیل تھیں۔ جدید عربی کا مشہور مسیحی مصنف جرجی زیدان جس کی تصنیف "تاریخ تمدن اسلام" کا نکلسن نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ بیروت کے مشنری کالج کا طالب علم تھا۔ معروف برادران جو المقطم اور المقتطف کے مشہور مدیر ہیں انھوں نے بھی بیروت کے اسی مشنری کالج کے سرچشمۂ علم سے سیرابی حاصل کی تھی ان مسیحی انجمنوں نے صرف جدید تعلیم کو فروغ دیا۔ بلکہ مزید برآں مختلف زبانوں کے احیاو ارتقا میں بھی حصّہ لیا۔ مشرقی زبانوں میں تحقیق کا جذبہ بھی انہی کی کوششوں سے بیدار ہوا ہے۔ ورڈ انک امریکی مشنری کی حیثیت سے بیروت میں آیا تو اس کی عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی۔ اس نے شام میں جدید تعلیم کے احیا کے لئے اپنی کوششیں وقف کر دی تھیں۔ بیا ئنسی سلسلۂ کتب جو اس نے النقش فی الحجر کے نام سے شائع کیا تھا عربی زبان میں اہم ترین سائنسی کارنامہ ہے۔ غالبًا عربی میں علم ہیئت پر بہترین جدید تصنیف وہ کتاب ہے۔ جو الہیئت کے نام سے منظر عام پر آئی ہے۔ میں یہاں مسیحی مبلغین کی ان خدمات کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا جو انھوں نے چین، جاپان اور دیگر جنوب مشرق کے ایشیائی ممالک میں سرانجام دی ہیں۔

ﺛ ﺛ ﺛ

دسمبر ۱۹۴۷ء میں پٹنہ یونیورسٹی میں تقسیم اسناد کے موقعہ پر مولانا آزاد نے فرمایا۔

مغربی تعلیم کے اثرات

ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور اقتدار میں پہلے پہل یہ سوال اُٹھا کہ ہندوستان میں مغربی نظام تعلیم رائج کیا جائے۔ شروع شروع میں برطانوی حکام میں اختلاف رائے تھا۔ ایک فریق کا خیال تھا کہ دیسی زبان میں تعلیم زیادہ مناسب رہے گی۔ جب کہ ایک دوسرے فریق کی رائے یہ تھی کہ مغربی تعلیم کو ہندوستان کے طول وعرض میں عام کیا جائے، انجام کار صورت یہ پیش آئی کہ فریق ثانی کی رائے وزنی قرار دی گئی۔ لارڈ میکالے کی مشہور ومعروف یادداشت سے اس تضاد رائے کا تاریخی ثبوت ملتا ہے۔ جہاں تک اس یادداشت کا مغربی تعلیم کے رواج سے تعلق ہے ہمیں اس کی واقعیت میں کوئی کلام نہیں ہے۔ لیکن ہم یہ بات نہایت صفائی سے کہہ سکتے ہیں کہ جو طرز تعلیم ایجاد کیا گیا تھا وہ ہمارے ارباب وطن کی زندگی اور اس کے مقتضیات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ جدید تعلیم غیر ملکی زبان میں دی جانے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ دیسی ذہن بدیسی سانچوں میں جو قطعاً غیر فطری اور مصنوعی تھے ڈھلنے لگے۔ ذریعہ تعلیم بھی بدیسی زبان قرار پائی۔ نہ صرف غور وفکر کے انداز میں تبدیلی آئی بلکہ علم وفن کے مختلف شعبوں تک ان کی رسائی

کی راہیں بھی صرف ایک غیر ملکی زبان کے دروازے تک محدود ہو کر رہ گئیں ہندوستان میں انگریزی زبان کی تعلیم نے نوجوان طلبہ کا زاویہ نگاہ تبدیل کر دیا اور ان کے فکر کی قدرتی صلاحیتیں اتنی مفلوج ہوگئیں کہ وہ ان سے قریب قریب ہاتھ دھو بیٹھے یہ طلبہ جن کی استعدادیں حصول علم پر صرف ہونی چاہیئے تھیں ایک غیر ملکی زبان کے دامن سے منتھی ہو کر رہ گئے۔ اس صورت حال سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہماری اپنی زبان کی ترقی کی راہیں مسدود ہوگئیں۔ اگر ہماری اپنی زبانوں میں سے کسی ایک کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا ہوتا تو ڈیڑھ سو سال کی مدت میں دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں اسے جگہ مل گئی ہوتی۔

اگر یہ تعلیمی انقلاب ہماری سعی عمل کا نتیجہ ہوتا تو ہم یقیناً وہی کچھ کرتے جو انیسویں صدی میں ایشیا اور مشرق کے دیگر ممالک نے کیا تھا مصر وشام، ترکی ایران، چین اور جاپان نے مغربی تعلیم کی ضرورت کا احساس کیا۔ وہ جدید تعلیم کے حصول کے لئے سکولوں اور کالجوں کا قیام عمل میں لائے لیکن ان ممالک میں سے کسی کو بھی اپنی زبان سے دست بردار ہونا نہیں پڑا۔ ذریعہ تعلیم ان کی اپنی زبانیں رہیں۔

نظریہ اور عمل کی دنیا میں انسان انتہا پسند واقع ہوا ہے۔ شاذ و نادر ہی میانہ روی کی سعادت اسے نصیب ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اس منزل میں ہر گام پر لغزش قدم کا شکار ہوتا ہے اس کی مثال ایک گھڑی کی سی ہے جس کا ریگولیٹر خراب ہوگیا ہے اس کی رفتار یا تو بہت تیز ہے یا بہت سست اس کا وقت کبھی درست نہیں رہتا۔ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان گزشتہ چند سال سے زبان پوشاک اور عادات وخصائل میں یورپ کی ریس کر رہے ہیں اور نقالی کا یہ بھوت اس بری طرح ان کے سروں پر سوار ہے کہ انہیں اس بات کی سدھ بھی نہیں رہی کہ ان کے ہاتھوں سے اسلاف

کی ذہنی میراث کا کتنا بڑا سرمایہ جاتا رہا۔ ہمارے بعض نوجوان تو انگریزی زبان کے نشے میں اتنے چور ہیں کہ انہیں اپنی مادری زبان میں بات چیت سے عار آتی ہے گفتگو کے دوران جب کبھی موقع آتا ہے تو وہ بڑی بے ساختگی کے ساتھ شیکسپیر، ملٹن، گوئٹے اور ورڈسورتھ کے اقوال نقل کرتے ہیں لیکن کبھی یہ سننے میں نہیں آیا کہ انھوں نے والمیک، کالیداس، خسرو یا انیس کے ارشادات کا حوالہ دیا ہو۔

اقوام کی ترقی کے راستے میں تنگ نظری ایک سنگ گراں کا حکم رکھتی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے دامن پر اس کے داغ نہ آنے دیں۔ قومی زندگی کی صحت اگر مخدوش ہوتی ہے تو صرف اسی مرض سے فکر و عمل کے ہر گوشے میں یہ خرابی راہ پا جاتی ہے یہ دبا ایک بھروپیے کی طرح نت نئے بھیس بدلتی رہتی ہے۔ مذہب پر اس کا دار اندھی عقیدت کے روپ میں ہوتا ہے۔ یا راسخ العقیدگی کی شکل میں اس کے گھناؤنے سائے رینگتے ہیں سیاسیات میں یہ روگ قومیت کا چولہ پہن کر آتا ہے۔ علم و فضل اور تہذیب و ثقافت کی اقلیم میں یہ خرابی قومیت اور وطنیت کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے ہمارا شعار یہ ہونا چاہیئے کہ ہم کسی قیمت پر بھی ان جھانسوں میں نہ آئیں۔ یہ چیز ہمیشہ ہمارے ملحوظ خاطر رہنی چاہیئے کہ ان تمام خرابیوں کی جڑ تنگ نظری ہے یہ بھی واضح رہے کہ ۱۹ ویں صدی کے یورپ میں جس قومیت کے چرچے تھے اس کے تار پود بکھر چکے ہیں اور آج دنیا میں قومیت کی قبا کسی کے جسم پر بھی چست درست نہیں آتی وقت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ قیود جلد از جلد اٹھا دی جائیں آج دنیا قومیت کی نہیں بلکہ فوق القومیت کی طالب ہے بظاہر عصر حاضر میں تنگ نظری کے لئے مطلق گنجائش نہیں ہے۔ اقوام عالم کی صف میں اگر ہم کوئی ممتاز مقام چاہتے ہیں تو اس کا امکان صرف اسی صورت میں ہے جب کہ ہم نظریاتی اعتبار سے بین الاقوامی نقطۂ نظر کے حامل ہو جائیں۔"

۱۹۴۶ء میں مشاورتی تعلیمی بورڈ کے اجلاس میں مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا

تعلیم اور مذہب

مذہبی تعلیم سے متعلق ۱۹ ویں صدی میں حریتِ فکر کا جو انداز تھا اس میں فرق آچکا ہے پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہی نئے اندازِ فکر کا آغاز ہو چکا تھا، لیکن دوسری عالم گیر جنگ کے بعد جو ذہنی، انقلاب رونما ہوا اس نے نقشہ ہی بدل دیا پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ بچے کی ذہنی ارتقاء میں مذہب خلل انداز ہوتا ہے لیکن اب یہ خیال ہو چلا ہے کہ مذہبی تعلیم کسی صورت میں بھی مضر نہیں۔ اگر قومی تعلیم میں اس عنصر کا فقدان ہوگا تو نہ اخلاقی اقدار کی کوئی قدر و قیمت باقی رہے گی اور نہ انسانیت کی بنیاد پر تعمیرِ سیرت کی مہم سر ہو سکے گی۔ معلوم ہونا چاہیے کہ گذشتہ عالم گیر جنگ کے دوران روس کا مطمحِ نظر قطعاً بدل چکا ہے ۱۹۴۴ء میں برطانوی حکومت کو بھی اپنے تعلیمی نظام میں ترمیم کرنی پڑی یعنی اس نے مذہب کو لازمِ تعلیم قرار دیا۔

سائنسی اور ٹکنیکی اصطلاحات کے وضع کرنے میں مشرقی ممالک نے جو تجربات کئے، قدیم کلاسیکی ادب سے جس انداز میں انھوں نے کچھ الفاظ مستعار لئے ہیں ان کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ ۱۹ ویں صدی کے مصر میں جب جدید یورپی تعلیم کا دائرہ وسیع ہوا تو سائنسی اصطلاحات وضع کرنے کے سوال پر بڑی اہمیت سے غور کیا گیا، جیسا کہ آپ خوب جانتے ہیں۔ مصر میں ایک جامع و مانع کلاسیکی زبان رہی ہے اور اسے یہ سہولت بھی ہے کہ سائنسی اصطلاحات کو اس

زبان کے الفاظ کا چولا پہنا سکتی ہے، کون نہیں جانتا کہ ہیئت، کیمیا، طبیعات اور دیگر علوم کی جو اصطلاحات عربی کا سرمایہ ہیں ان سے یورپی زبانوں نے بھی استفادہ کیا ہے۔

مصر کے لئے یہ بڑی سہولت تھی کہ قدیم انداز کے عربی الفاظ کو معمولی سے ردوبدل کے بعد نئے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ مصریوں کے گروہ نے تو یہ فیصلہ ہی کر لیا کہ ہمیں ہر قیمت پر عربی الفاظ ہی لانے چاہئیں تاکہ ان کی مدد سے تعلیم میں سہولت ہو۔ غرض بہت سے الفاظ تو عربی کے کلاسیکی ادب سے مستعار لئے گئے اور لاتعداد نئے الفاظ وضع کرنے کا بیڑا اٹھایا گیا۔ لیکن جلد ہی تجربہ نے ثابت کر دیا کہ تعلیمی مسئلہ کا یہ خوشگوار حل نہیں ہے۔ اہل مصر پر یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ جدید یورپ میں جو سائنسی اصطلاحات رواج پا گئی ہیں اور جن کی حیثیت بین الاقوامی ہے۔ یعنی جو کسی قوم یا ملک سے تعلق نہیں رکھتیں۔ انہیں کسی تامل کے بغیر اپنا لیا جائے۔

ترکی اور عراق کے ماہرین تعلیمات بھی بالآخر اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ کہ علوم وفنون کے سلسلے میں قومیت کے تصور سے بات نہیں بنے گی۔ زاویہ نگاہ بین الاقوامی ہونا چاہیئے۔ چین اور جاپان کے تجربات بھی کچھ اسی قسم کے ہیں۔

یورپ میں فلسفہ یونان کو عربوں کے طفیل فروغ نصیب ہوا۔ ازمنہ وسطیٰ میں یہی عرب فلسفہ یونان کے شارح اور نافذ تھے۔ جب یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا تو اہل مغرب نے بھی یونانی اور لاطینی زبانوں سے براہ راست تراجم کئے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ یورپ میں فلسفہ کی عمومی تاریخ کا آغاز یونان سے ہوتا ہے اور اس کا سلسلہ جدید یورپی فلسفہ تک جا کر ختم ہو جاتا ہے

یہ حقیقت واضح رہے کہ معاشرتی تعلیم سے مراد محض عمرانیات کا مطالعہ نہیں ہے۔ عمرانیات معاشرتی مظاہر کا علم ہے اور اس کے وسیع دامن میں اقتصادیات، سیاسیات، انسانیت اور فقہیات وغیرہ علوم بھی سمٹے ہوئے ہیں۔ عمرانیات نظریاتی علوم کی ایک شاخ ہے جو ایک انداز کے حقائق کو ضابطے کی شکل دیتی ہے اس کے زیر اثر معاشرتی رابطے قانون کے دائرے میں آجاتے ہیں۔ معاشرتی تعلیم سے ایسی تعلیم مراد ہے جو زندگی سے براہ راست واسطہ و رشتہ اور علاقہ رکھتی ہے۔

معاشرتی تعلیم کو معاشرتی بہبود کے مترادف نہیں قرار دینا چاہیئے۔ معاشرتی بہبود ایک تحریک ہے جو کسی معاشرے کی مشکلات اور اس کے مصائب کا قلع قمع کرنے کے لئے بعض معاشرتی حالات کے تقاضے سے عمل میں آتی ہے مزدور طبقہ کی دشواریوں کا رفع کرنا بھی اس تحریک کے نصب العین میں شامل ہے۔ حفظانِ صحت کے اصول بھی اس تحریک کی بدولت عملی جامہ پہنتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

محکمہ آثار قدیمہ کے مرکزی مشاورتی بورڈ کے اجلاس ششم
میں جو ۲ فروری ۱۹۴۹ء کو نئی دہلی میں منعقد ہوا تھا مولانا
ابوالکلام آزاد نے "تاریخ اور آثار قدیمہ" کے موضوع پر
ایک بصیرت افروز تقریر کی تھی۔

اس تقریر کا نصف اول علم الآثار کی تاریخ اور اثری
تحقیقات کے تدریجی ارتقاء پر بصیرت افروز تبصرہ ہے۔
اس تقریر کا نصف آخر ہندوستان کے محکمہ آثار قدیمہ
سے متعلق ہے۔ اس میں موصوف نے محکمہ کی اپنی سرگرمیوں
سے بحث کی ہے جو صرف ہندوستان سے تعلق رکھتی ہیں۔

آثار قدیمہ

محکمہ آثار قدیمہ کے مشاورتی کمیٹی کے سالانہ اجلاس میں آپ حضرات کی شمولیت کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ آثار قدیمہ کے سلسلے میں ملک نے تحقیق و مطالعہ کی جو وادیاں قطع کی ہیں۔ ان سے متعلق اور ان کے ارتقائی مدارج کے بارے میں کچھ خیالات پائے جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس موضوع پر آپ سے تبادلہ خیالات ہو جائے۔ اس اجلاس میں ہمیں خصوصیت کے ساتھ ان امور پر غور و خوض کرنا ہے جو مستقبل میں ہمارے توسیعی لائحہ عمل کی پیش رفت کا باعث ہوں۔ لیکن پیشتر اس سے کہ ہم یہ ساز چھیڑیں۔ زیادہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کی ان علمی تحقیقات پر سرمایہ فکر و نظر صرف کریں جو ہندوستان یا اور کہیں پایہ تکمیل کو پہنچیں۔

صدہا سال سے یہ ایک مسلمہ حقیقت رہی ہے کہ چین کے علاوہ دنیا کے تین قدیم مراکز تہذیب ہندوستان، میسوپوٹامیا اور مصر ہیں دنیا کے قریب قریب تمام ارباب علم و فضل نے ان مقامات کی تاریخ سے دلچسپی لی ہے گزشتہ دو صدی سے یہ بات بھی پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ ازمنہ قدیمہ کی تاریخ کی گرہیں جس ناخن نے کھولی ہیں وہ آثار قدیمہ اور صرف آثار قدیمہ کا علم ہے۔ قدیم ایام میں کاغذ ناپید تھا اور جب کچھ عرصے کے بعد اسی کی ایجاد عمل میں آئی تو جو دستاویزی تحریریں اس پر ثبت کی گئیں۔ وہ ان تاریخی یادداشتوں کی بہ نسبت جو سنگ و آہن کے کتبوں میں محفوظ کی گئی تھیں، زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوئیں۔

اس حقیقت کے پیش نظر آثار قدیمہ کی دریافت کے سلسلہ میں وسیع پیمانے پر کام شروع ہوا۔ اور مصر اور میسو پوٹامیا میں کھدائی کی مہم جاری ہوئی انہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہمارے پاس ان مقامات کی قدیم تاریخ کا اطمینان بخش سرمایہ موجود ہے جہاں تک مصر کا تعلق ہے نہ صرف اس کے قدیم مرموزات کی نقاب کشائی کی گئی ہے بلکہ اس کی وہ تاریخ بھی جو پانچ ہزار سال قبل مسیح تک منتہی ہوتی ہے اور جس کے دامن میں تیس شاہی خاندانوں کے زریں کارنامے پوشیدہ ہیں۔ منظر عام پر آگئی ہے۔ نینوا اور بابل میں جو کھنڈر پائے جاتے ہیں ان سے کوئی پانچ ہزار سال قبل کی اس قدیم تہذیب کی تاریخ کا سراغ ملتا ہے۔ جس کی داغ بیل سمیریوں کے ہاتھوں پڑی تھی۔ مٹی کی تختیوں پر لکھی ہوئی الفاردوں کتابیں اور سمیری زبان کی لغت دستیاب ہوئی۔ ان ٹھیکروں سے ہم ان قدیم ایام کے اندر معاشرت کی جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں حیرت کی بات ہے کہ جس ملک میں ہم بس رہے ہیں۔ اس نے آثار قدیمہ کے وسائل اپنی قدیم تاریخ کے سلسلے میں مطلق استعمال نہیں کئے۔ اور نہ ان سے استفادہ کی کوشش کی اگر ہم سیدھے لفظوں میں یہ کہیں تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ کہ ہمارے ملک کی تاریخ مٹی کی تہوں کے نیچے دبی پڑی ہے اور اس وقت کی منتظر ہے جب کوئی ماہر آثار قدیمہ آئے اور کے دفینے برآمد کرے در اصل یہی وہ دفینے ہیں جن کے بنیاد پر ہمارے ملک کی قدیم تاریخ کا قصر ہو سکتا ہے۔

ہندوستان کے آثار قدیمہ کی سراغ رسانی کے سلسلے میں جو بے اعتنائی برتی گئی ہے، اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اور میسو پوٹامیا کی بہ نسبت ہندوستان یورپی تہذیب کے اثرات سے تہی داماں رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یورپ نے اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ صدہا سال تک جب روم کا خطہ یورپی ثقا

کا گہوارہ بنا رہا ہے۔ اور یورپ کی جدید تہذیب کا مرکز نگاہ بھی یہی ہے یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ عہد نامہ قدیم میں جا بجا مصر اور میسوپوٹامیا کے حوالے ملتے ہیں۔ اگر یورپ نے ان ممالک کی جانب اپنی عنان التفات موڑی تو اسمیں حیرت کی کون سی بات ہے۔ ان کی قدیم تاریخ سے یورپ کا مفاد وابستہ ہے۔ اس لئے ان مقامات سے اسے دلچسپی ہونی چاہیے۔ یورپ کی دلچسپی کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عربوں نے فن تاریخ کو اتنا فروغ دیا تھا کہ اسے قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ جدید یورپ کے تہذیبی عروج سے کہیں بیشتر عرب مورخین نے مصر اور میسوپوٹامیا کی تہذیب پر مطالعہ و تحقیق کا گراں قدر سرمایہ صرف کیا تھا لہذا یہ قدرتی بات تھی کہ یورپ کے ارباب فضل و کمال اس کے مطالعہ پر اپنی توجہات مرکوز کرتے اور وسیع پیمانے پر آثار قدیمہ کی بازیابی کی مہم زور پکڑتی۔ دراصل فضلائے یورپ کی انہی مساعی کا نتیجہ ہے کہ ازمنۂ قدیم کی تاریخ روشنی میں آئی ہے۔

متذکرہ بالا حقائق کے باوصف یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ ہندستان میں آثار قدیمہ کی دریافت کا سلسلہ بہت بعد میں شروع ہوا۔ اس ملک میں قریب قریب دو صدی یوروپی اقتدار رہا۔ اس عرصے میں اس بیرونی طاقت نے یہاں کی صنعت تعمیر اور ان تاریخی یادگاروں کا جائزہ لیا۔ جو اس ملک کی باعث صد افتخار قدیم تہذیب کی آئینہ دار تھیں۔ اس سے یہ اندازہ ہو گیا کہ اس ملک کی تہذیب اتنی قدیم ہے کہ دنیا کے دائرہ علم و تحقیق میں صرف جزوی معلومات آسکتی ہیں۔ یورپ کے ماہر آثار قدیمہ نے اس مدت میں مسمار شہروں اور ان کے کھنڈروں میں کچھ ایسے مٹے ہوئے نشانات بھی ضرور دیکھے ہونگے جو باعتبار علم و تحقیق جنت نظارہ کا حکم رکھتے ہیں۔ تاریخی یادداشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز

میں مشہور مورخین الفنسٹن اور بارنس نے جب افغانستان کے لئے رخصت سفر باندھا تو اثنائے راہ میں راولپنڈی کے پشتوں نے ان کے دیدۂ عبرت نگاہ کو دعوت نظارہ دی۔ اس سفر میں انھوں نے یونانی سکے بھی دیکھے اس سے وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ جو پشتے ان کی نگاہوں سے گذرے ہیں ہو سکتا ہے ان میں قدیم شہر ٹیکسلا کے کچھ مٹے ہوئے آثار بھی دستیاب ہو سکیں۔ باوجودیکہ عتیقی آثار کی سراغ رسانی کے سلسلے میں ترغیبات کچھ کم نہ تھیں۔ لیکن پھر بھی ہندوستان کے کسی حصے میں تحقیقاتی سرگرمیاں شروع نہیں ہوئیں۔ انیسویں صدی کے وسط تک سناٹے کا عالم طاری رہا۔

بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کے سر آثار قدیمہ کی دریافت کا سہرا بندھا تحقیق و تدقیق کے دوسرے میدان بھی اسی سوسائٹی کی توجہ کا مرکز بنے تھے۔ ۱۷۹۶ء میں اس سوسائٹی نے ایک عجائب گھر کے قیام کا فیصلہ کیا اور ساتھ ہی یہ طے کیا کہ ایسٹ کمپنی کے افسروں نے نوادر جمع کئے ہیں۔ انھیں اس عجائب گھر کی زینت بنایا جائے۔ ہندوستان کے آثار قدیمہ کی تحقیق کے ذوق شوق میں اضافہ برہمی اور خروشی مخطوطات کی دستیابی سے ہوا۔ اس سلسلہ میں جس پرنسپ کی کوششیں انیسویں صدی کے ربع ثانی میں پھل پھول لائیں۔

۱۸۴۸ء میں جنرل الیگزنڈر کننگھم نے حکومت ہند پر آثار قدیمہ کے تحفظ کی اہمیت واضح کی اور اس سلسلہ میں ایک مناسب و موزوں افسر کے تقرر کا مشورہ دیا۔ جنرل موصوف کی تجویز پر صاد کیا گیا۔ چنانچہ ۱۸۶۱ء میں لارڈ کیننگ نے محکمۂ آثار قدیمہ کی نیو ڈالی اور جنرل کننگھم کو منقش آثار قدیمہ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کیا گیا۔ آثار قدیمہ کے تحفظ کے سلسلہ میں ہندوستان پر پرنسپ اور کننگھم کے جو احسانات ہیں۔ انھیں بھلایا نہیں جا سکتا۔

میں محکمہ آثار قدیمہ کی بوقلموں تاریخ کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا ۱۸۶۶ء
میں اس محکمہ کو ختم کر دینے کی اسکیم تیار ہوئی۔ اور اس پر عمل درآمد بھی ہو گیا۔ لیکن ۱۸۷۰ء
میں رائے عامہ کے اصرار پر پھر اس کے تن مردہ میں جان ڈالی گئی۔ ۱۸۷۱ء میں
جنوبی ہندوستان تک اس محکمہ کی نسیں پھوٹ نکلیں۔ لارڈ لٹن کے دور حکومت
میں اس محکمہ نے اور ترقی کی۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء میں انڈین ٹریژر ٹروو ایکٹ ششم
پاس ہو گیا۔ ۱۸۸۹ء کے بعد اس محکمہ کے تار پود بکھر گئے۔ اور کئی سال تک کام
کھٹائی میں پڑا رہا۔ ۱۸۹۵ء کے بعد اس محکمہ کا از سر نو قیام عمل میں آیا۔ پھر لارڈ
کرزن کے دور میں تو اس محکمہ کی زندگی کے محضر پر مہر دوام ثبت کر دی گئی۔
لارڈ کرزن آثار قدیمہ کی دریافت کو تحقیقی جد و جہد سے تعبیر کرتا تھا اور یہ سمجھتا تھا
کہ اس میدان میں جو قدم اٹھے گا۔ اس سے ایک طرف تو فن کی خدمت ہوگی اور
دوسری طرف آثار قدیمہ کا تحفظ۔ برطانیہ کا ہندوستان پر ایک احسان عظیم ہوگا۔ چنانچہ
اس لارڈ نے ۱۹۰۲ء میں محکمہ کو چار چاند لگائے اور اس کے انتظام و انصرام کی باگ
ڈور سر جان مارشل کے ہاتھوں میں سونپی اور محکمہ کے مہتمم اعلیٰ کے فرائض تفویض کیے۔
لارڈ کرزن کے ایما پر حکومت ہند کی مجلس مقننہ نے تحفظ آثار قدیمہ اور کتبات کے علم
کو موضوع نصاب قرار دیا۔ اس وقت سے کر آج تک یہ سلسلہ جاری ہے اگرچہ
۱۹۳۱ء میں تحقیقی مہم کے دوران اس محکمہ کی سرگرمیوں میں بہت کچھ کمی واقع ہوئی،
لیکن اس کے باوجود کام رکا نہیں۔

حال ہی میں چند سال کے اندر اندر محکمہ نے جہاں جہاں کھنڈرات کی کھدائی کے
سلسلے میں کارہائے نمایاں سر انجام دیئے ہیں۔ ان کا اجمالی نقشہ یہ ہے۔

۱۔ کھوکھرا کوٹ ضلع روہتک (مشرقی پنجاب) کا انکشاف ۱۹۳۲ء میں

۲۔ سردھاری (صوبہ سرحد) کی کھدائی ۱۹۳۶ء میں۔

۳- اہی چھتر (بریلی)، کا احتفار (کھدائی) ۱۹۴۰ تا ۱۹۴۴ء کے دوران -

۴- راج گھاٹ (بنارس) میں حفر و خرج ۱۹۴۰ء میں

۵- ٹیکسلا میں کھدائی ۱۹۴۴ء میں

۶- پانڈیچری کے قریب اریکے میڈو میں کھدائی ۱۹۴۵ء میں -

۷- برہمگری اور چندراولی (میسور) میں ۱۹۴۷ء میں

۸- ۱۹۴۷ء میں ہڑپا میں

۹- ۱۹۴۸ء میں سیسوپال گڑھ میں -

مدراس کے حجری مقامات کی تحقیق و تفتیش کا آغاز ۱۹۴۶ء میں ہوا جبکہ ڈرگ ضلع کا سروے پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے - کوچین میں بھی اس نوعیت کا تحقیقی کام ہوا ہے - کئی نئے مقامات اور بھی ہیں جن کی سراغ رسانی سیسوپال گڑھ میں کام کی تکمیل کے بعد محکمہ کے زیر غور ہے - ان مقامات میں امراوتی (دکنتور) میں اور راجگیر (بہار) بھی شامل ہیں - تاحال ریاست ہائے ہند میں حفر و خرج کا کام زیادہ وسیع پیمانہ پر نہیں ہوا ہے - تقسیم کے بعد خصوصیت کیساتھ بیکانیر اور جیسلمیر میں آثار قدیمہ کی دریافت کی مہم زوروں پر رہی ہے دریائے سندھ کی وادی کے قرب و جوار میں جو تہذیبی آثار پائے جاتے ہیں - ان کی کھوج بھی لگائی جا چکی ہے - جن مقامات سے یہ آثار تعلق رکھتے ہیں - اب وہ پاکستان کی حدود میں داخل ہیں - ماضی میں بیکانیر اور جیسلمیر اس تہذیب کے اہم مراکز تھے - لہذا یہ امید کی جاتی ہے کہ ان رقبوں میں اگر مواقع و محلات کی چھان بین اور جانچ پڑتال کی جائے تو وادی سندھ سے متعلق تہذیب کی تاریخ پر روشنی پڑ سکتی ہے -

محکمہ نے اپنی کارگذاری کے لئے صوبائی مراکز کا تعین نہیں کیا ہے - البتہ صوبوں میں آثار قدیمہ کی دریافت کا کام جاری رکھنے کے لئے مندرجہ ذیل سات

حلقے مقرر کیے گئے ہیں۔

۱۔ حلقہ شمالی —— آگرہ ۲۔ مرکزی حلقہ —— پٹنہ

۳ مشرقی حلقہ —— کلکتہ ۴۔ جنوب مشرقی ۔ وزیگاپٹم

۵۔ جنوبی حلقہ —— مدراس ۶۔ مغربی حلقہ ۔ پونا

۷۔ دہلی حلقہ —— نئی دہلی

محکمہ آثار قدیمہ نے سرکاری اور نجی انجمنوں کو تفتیش و تحقیق کے کام میں مدد دی ہے۔ قدیم کی حسبی کے مشہور مقام کی سراغ رسانی اور اس کے اکتشاف میں محکمہ الہ آباد یونیورسٹی کے ساتھ بھی تعاون کر رہا ہے۔ اس نے مختلف مقامی انجمنوں اور تحقیقاتی اداروں کو بھی مدد و مشورہ دیا ہے۔ محکمہ کا کام چار شاخوں پر منقسم ہے (الف) کتبانی شاخ (ب) کیمیاوی شاخ (ج) اکتشافی شاخ (د) میوزیم عجائب گھر کی شاخ۔

محکمہ کا دوسرا اہم کام اکتشاف اور دیگر تحقیقی کام کے نتائج کی اشاعت ہے۔ محکمہ آثار قدیمہ کے سروے سے متعلق جو سلسلہ نشر و اشاعت ہے اس نے وقتاً فوقتاً امتیازی شان حاصل کی ہے اور اسے ہر حلقہ میں قبول عام کا شرف حاصل ہوا ہے مستقبل کا مورخ اس سے بحیثیت مجموعی کافی معلومات بہم پہونچا سکتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ معلومات اس کے لئے بہت کچھ افادی حیثیت رکھتی ہے

جنگ کے دوران ARCH AEOLOGIAL MEMORIES "اثری یادداشتوں" کی اشاعت معرض التواء میں پڑ گئی تھی۔ اب یہ تجویز زیر غور ہے کہ اس کی اشاعت کا از سر نو اہتمام کیا جائے۔ دو مجلدات کا مواد پہلے ہی سے تیار ہے علاوہ بریں محکمہ کی تجویز یہ بھی ہے کہ وہ اثری یادگاروں اور کتبوں کی تشریح

و توضیح کے لئے ہدایات پر مشتمل مختصر رسائل کا ایک سلسلہ بھی منظر عام پر لائے، اس چیز پر بھی غور کر رہا ہے۔ کہ جرائد و صحائف کا اجراء بھی اس مقصد کے لئے کیا جائے۔

محکمہ کی اشاعتی پالیسی پر نظر ثانی اور اس کی توسیع کی ضرورت ہے۔ ماضی قریب میں ہماری تمام مطبوعات ہندوستان کی اہم زبانوں میں منتقل ہوں۔ تاکہ اثری تحقیقات کے نتائج کا علم ہر شخص کو ہو سکے، میں اس سلسلے میں جلد از جلد پہل کرنا چاہتا ہوں،

مرقعوں اور تصویری پوسٹ کارڈوں کی اشاعت و اجراء کو میں بڑی اہمیت دیتا ہوں اور وہ اس لئے کہ محکمہ کی کارگزاریوں کو عوام کی بارگاہ میں سند قبول ہے۔ اشاعت و اجراء کا کام بڑے وسیع پیمانے پر شروع ہونا چاہیے۔

اثری اور تعمیری یادگاروں کے عمومی تعارف کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ ہم فلم کا سہارا بھی لیں۔ فلمیں اگر حسن اہتمام کے ساتھ تیار کی جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اثری عمارات کے شکوہ و جلال کا سکہ ناظرین کے دل و دماغ پر نہ بیٹھے۔ دیگر ممالک نے بھی اس مقصد کے لئے فلمی وسائل سے استفادہ کیا اور اپنے یہاں کی قدیم تاریخ و تمدن کے کسی ایک پہلو کی فلم منظر عام پر لائے۔

میں نے شروع میں کہا ہے کہ ہماری تاریخ مٹی کے تہوں کے نیچے دبی پڑی ہے اندریں حالات یہ ضروری ہے کہ اثری و حفری ذرائع سے وسیع پیمانے پر تحقیق و تفتیش کی مہم کا آغاز کیا جائے۔ اس مقصد میں کامیابی کے لئے یہ امر ناگزیر ہے۔ کہ ہم محکمہ کی تنظیم نئی بنیادوں پر کریں۔ اور اس کی مختلف شاخوں میں عملہ کام کر رہا ہے۔ اس کے دست و بازو کو مزید تقویت دیں۔ محکمہ سے غیر متعلق اداروں میں طلبہ کی تعلیم و تربیت اس نہج پر ہونی چاہیے کہ ان میں اثری تحقیقات کا ذوق بیدار ہو۔

آخر میں ہم پھر وہی بات دہرا رہے ہیں۔ جو ہم نے شروع میں کہی تھی، یعنی یہ کہ:۔ ہندوستان کے آثار قدیمہ کی سراغ رسانی کا سلسلہ جو بے اعتنائی برتی گئی ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصر اور میسوپوٹامیا کی بہ نسبت ہندوستان یوروپی تہذیب کے اثرات سے تہی داماں رہا ہے اور یہی وجہ ہے۔ کہ یوروپ نے اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ صدہا سال تک بحر روم کا خطہ یوروپی ثقافت کا گہوارہ بنا رہا ہے۔ اور یوروپ کی جدید تہذیب کا مرکز نگاہ بھی یہی علاقہ تھا۔ یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ عہد نامہ قدیم میں جا بجا مصر اور میسوپوٹامیا کے حوالے ملتے ہیں۔ اگر یوروپ نے ان ممالک کی جانب اپنی عنانِ التفات موڑ دی تو اس میں حیرت کی کون سی بات ہے۔ ان کی قدیم تاریخ سے یوروپ کا مفاد وابستہ ہے۔ اس لئے اسے ضرور ان مقامات سے دلچسپی ہونی چاہئے۔ یوروپ کی دلچسپی کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عربوں نے فن تاریخ کو اتنا فروغ دیا تھا۔ کہ اسے قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا گیا تاریخ شاہد ہے۔ کہ جدید یوروپ کے تہذیبی عروج سے کہیں پیشتر عرب مورخین نے مصر اور میسوپوٹامیا کی تہذیب پر مطالعہ و تحقیق کا گراں قدر سرمایہ صرف کیا تھا۔

⁘ ⁘ ⁘

(۱۸ فروری ۱۹۴۹ء کو ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے حسب ذیل خیال کا اظہار فرمایا)

تعلیمی امور

ہمارے قومی بجٹ میں تعلیم کو اعلیٰ ترین ترجیح حاصل ہونی چاہیئے اور اس کا درجہ خوراک اور پوشاک کے فوراً بعد آنا چاہیئے۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے سچ تو یہ ہے ایک مناسب تعلیمی نظام کا ہونا ضروری ہے۔"

مجھے امید ہے کہ اگر ہم کامل عزم و ارادہ کے ساتھ مل کر کوشش کریں تو ہم اپنی خامیاں دور کر سکیں گے۔ اور ہندوستان میں تعلیم کو دنیا کے مہذب ملکوں کی صف میں لا کھڑا کریں گے۔"

جن بڑے بڑے اداروں پر عنقریب غور کیا جائے گا۔

ایک قومی عجائب خانہ کا قیام، بنیادی تحقیقاتی کام کا بہتر بندوبست تعلیم کی نئی اسکیم کے اساتذہ کے لیے ایک "ہدایت نامہ" کی تیاری۔ ایک عام نصاب

کی تیاری۔ تعلیم کے سلسلے میں تجربے کرنے والی درسگاہوں کو زرامداد۔ آثار قدیمہ کی کے مطالعہ کی حوصلہ افزائی عوام کی تعلیم کے نئے ذرائع مثلاً براڈکاسٹ اور فلموں سے پورا پورا فائدہ اٹھانا۔

مولانا آزاد نے اساتذہ کی حیثیت اور حالات کو بہتر بنانے کی ضرورت پر زور دیا اور اسکولوں میں مذہبی تعلیم کی حیثیت کا ذکر کیا۔

آپ نے کہا کہ ”موخرالذکر کے متعلق حکومت کا فیصلہ بہت جلد ظاہر کر دیا جائے گا۔ تعلیم جدید کی اشاعت اور دیسی زبانوں کی ترقی میں مسیحی تبلیغی جماعتوں نے جو امداد دی ہے اس کا اعتراف کرتے ہوئے“ مولانا آزاد نے ”تبدیلی“ مذہب اور خصوصاً گروہ در گروہ تبدیلی مذہب کے پریشان کن مسئلہ کا ذکر کیا۔ آپ نے کہا اس مسئلہ کے بارے میں دنیا کی رائے میں بے شمار تبدیلیاں ہو چکی ہیں اور خود ذمہ دار مسیحی مبلغوں کو اعتراف ہے کہ گروہ در گروہ ”تبدیلی“ مذہب فی الحقیقت ”تبدیلی“ مذہب نہیں۔“

دیوناگری اور اردو کے علاوہ لاطینی کو ذیل رسم الخط کے طور پر استعمال کرنے کے فائدوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا کہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جس پر ملک کے ماہرین تعلیم کو غور کرنا چاہئے۔

مولانا آزاد نے بعض پہلوؤں سے موجودہ نظام تعلیم کی اچھائی کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے نقائص کے متعلق کہا کہ اس کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے۔ کہ اس سے قومیت کا جذبہ پیدا ہونے میں کوئی مدد نہیں ملی۔ میکالے کا مقصد صرف برطانوی خیرخواہ تیار کرنا تھا۔ لہٰذا ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ موجودہ نظام تعلیم ہماری قومی ضروریات کس حد تک پوری کرتا ہے۔

مولانا نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس میں کوئی شک نہیں کہ میکالے

کا یہ اعتراف صحیح ہے کہ فارسی اور سنسکرت زبانیں اس بات سے ناموزوں ہیں کہ انہیں ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے لیکن انگریزی کا بھی تو یہی حال ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس وقت ہندوستان کے مختلف صوبوں کی زبانیں اتنی ترقی یافتہ نہیں تھیں کہ وہ ذریعہ تعلیم کا کام دیتیں۔ البتہ اگر ہندوستان میں قومی حکومت ہوتی تو وہ ان زبانوں کو بتدریج ترقی دے کر اس مقصد کے لئے تیار کر لیتی۔ مادری زبانوں میں میٹرکولیشن کے درجہ تک تعلیم دینے کا تجربہ کامیابی کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ملک میں ہر قسم کی تعلیم دیسی زبانوں ہی میں دئے جانے کا تجربہ کیا جائے۔

تہذیب و تمدن کی بنیاد ابتدائی تعلیم پر ہے۔ عام طور پر تعلیم کا کام ایسے لوگوں کے سپرد رہا ہے جو اس کے نہایت ہی کم اہل تھے۔

پرانے زمانے میں استادوں کا احترام بہت زیادہ تھا لیکن آج کل ایک غریب مدرس کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ آئندہ جو نظام تعلیم مرتب کیا جائے اس میں استادوں کی حیثیت اور ان کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کا خیال رکھا جائے۔ نئی قومی حکومت کا یہ اولین فرض ہوگا۔

سارجنٹ اسکیم کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے کہا کہ اس اسکیم میں بنیادی تعلیم کی جدید تنظیم کے علاوہ مادری زبانوں میں تعلیم دینے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ صوبے اس اسکیم پر عمل درآمد کرنے کے انتظامات کر رہے ہیں اور انہوں نے مرکز کی مدد بھی مانگی ہے میرا ارادہ ہے کہ صوبائی وزیروں اور یونیورسٹیوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس بلاؤں جو کام کا ایک جامع پروگرام تیار کرے۔

سارجنٹ رپورٹ میں مذہبی تعلیم کے متعلق کسی قطعی فیصلہ کا اظہار نہیں کیا گیا ماضی میں ماہرین تعلیم خالص دینی تعلیم پر زور دیتے رہے ہیں۔ برطانیہ میں ایسا ہی ہوا۔ لیکن روس میں "انقلاب عظیم" کے بعد تعلیم میں مذہب کو

داخل کرنے کی مخالفت ہونے لگی۔

مذہبی تعلیم کے حامی یہ کہتے ہیں کہ جب تعلیم کو مذہب سے الگ کردیا جائے اس کے بیکار ہونے میں شک نہیں ہے۔ برطانیہ میں اب سرکاری نگرانی میں ایک نصاب تعلیم مرتب کیا گیا ہے۔ روس نے بھی حال میں دینی تعلیم کی اہمیت محسوس کی ہے۔

حکومت کو دونوں طرف کے خیالات کو جانچ تول کر اپنا فیصلہ کرنا ہے۔ واضح رہے کہ ہندوستان میں دوسرے ملکوں کی بہ نسبت مذہبی تعلیم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

اگر حکومت مذہبی تعلیم کو مروجہ تعلیم میں شامل کرنے کا فیصلہ کرے گی تو اسے دیکھنا ہوگا۔ کہ یہ تعلیم اعلیٰ درجے کی ہو۔ مذہبی تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ لوگوں میں رواداری اور وسعت نظر پیدا کرے۔ اور میرے خیال میں یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ زمام کار حکومت کے ہاتھوں میں ہو۔ اس ضمن میں حکومت کے فیصلہ کا اعلان عنقریب کردیا جائے گا۔

مسیحی تبلیغی جماعتوں کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا۔ اس میں شک نہیں کہ مسیحی تبلیغی جماعتوں نے جدید تعلیم کو پھیلانے اور جدید نقطۂ نظر کو ترقی دینے میں اہم حصہ لیا ہے۔ یہ کہنا صرف ہندوستان ہی کے بارے میں درست نہیں۔ بلکہ دوسرے مشرقی ممالک کے بارے میں بھی صحیح ہے ۱۹۰۷ء سے پہلے ترکی میں رابرٹ کالج جدید تعلیم کی درسگاہ تھا۔ جسے امریکی مشن چلاتا ہے اس کالج نے ترکی کی بیداری میں جو حصہ لیا ہے۔ اسے بھلایا نہیں جاسکتا۔ شام میں جدید تعلیم کا چرچا انہیں مسیحی طاقتوں کے طفیل ہوا۔ ان لوگوں نے بیروت میں تین کالج قائم کئے۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور "الکلیتہ السوریا" ہے عراق

میں بھی اعلیٰ تعلیم ۔ کلید قیدلیس یوسف ۔ یعنی سینٹ جوزف کالج کے ذریعے ، مصر میں یہی ہے ۔ عرب کے نامور مصنف اور اخبار نویس بیروت کے کالجوں کے سابق طلبہ ہوئے ہیں ۔

ان مسیحی تبلیغی جماعتوں نے جدید تعلیم کی اشاعت میں ہی مدد نہیں دی بلکہ انہوں نے دیسی زبانوں کی ترقی میں بھی اہم حصہ لیا ہے ۔

اکثر حالتوں میں مشرقی زبان کی تحقیق اور ان میں فضیلت حاصل کرنے میں اولیت کا سہرا اس جماعت کے سر ہے ۔ سائنس کے متعلق عربی زبان میں انیسویں صدی کی بہترین کتاب " النقش کالحجر " ایک امریکی مسیحی مبلغ وائن ڈائمک کی تصنیف ہے ۔ جو ۱۸ سال کی عمر میں بیروت آیا اور ساری عمر شام میں جدید تعلیم پھیلانے میں مصروف رہا ۔ نجوم پر عربی میں بہترین جدید تصنیف اس کی کتاب " الہیت " ہے ۔ چین ۔ جاپان ۔ اور دیگر مشرقی ممالک میں ان مسیحیوں نے جو کچھ کیا میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا ۔

ہندوستان میں تعلیم کا کام ان تبلیغی جماعتوں نے ہی شروع کیا ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی شروع میں مشرقی تعلیم کے حق میں تھی ۔ مغربی تعلیم کی بنیاد سیرام پورمشن نے رکھی ۔ اسی وقت سے اب تک ان جماعتوں کی تعلیمی سرگرمیاں جاری ہیں اگر یہ جماعتیں اس کام میں ہاتھ نہ ڈالتیں تو آج کروڑوں ہندوستانی جہالت کے اندھیرے میں بھٹک رہے ہوتے ۔

دیسی زبانوں کی ترقی میں بھی ان جماعتوں نے بڑا مفید کام کیا ۔ اُردو نثر میں پہلی معیاری کتاب انجیل مقدس کا وہ ترجمہ ہے جو ان جماعتوں نے انیسویں صدی میں مکمل کیا گزشتہ ۵۰ سال میں اُردو نے عظیم الشان ترقی کی ہے ۔ اس کے باوجود انجیل مقدس کا یہ ترجمہ ابھی تک اُردو نثر میں معیاری سمجھا جاتا ہے ۔

مسیحی مبلغوں نے پچھلے زمانے میں کام کی قیمتی مثالیں قائم کی ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ بنی نوع انسان کی ہمدردی سے متعلق ان کے کام کو آئندہ بھی قدر کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے۔ مشکل صرف ایک مسئلہ پر پیش آتی ہے اور وہ پریشان کن مسئلہ تبدیلی مذہب اور بالخصوص گروہ در گروہ تبدیلی مذہب کا ہے۔

تبدیلی مذہب کے بارے میں جو دنیا کی رائے ہیں بے شمار تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں اور خود ذمہ داری مسیحی مبلغوں کو اعتراف ہے کہ گروہ در گروہ تبدیلی فی الحقیقت تبدیلی مذہب ہے ہی نہیں۔ حضرت مسیحؑ نے خود پانی کے ذریعہ بپتسمہ کی بجائے روح کے بپتسمہ پر زور دیا ہے اور اگر مسیحی مبلغ لوگوں کو عیسائی بنانے کے بجائے انہیں مسیحؑ کا لایا ہوا پیغام انسانیت پہنچائیں تو حضرت مسیحؑ کی صحیح خدمت انجام دینے والے ہوں گے۔ اگر مسیحی مبلغوں کی سوسائٹیاں اس چیز کو اپنا شعار بنا لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان ان کی پیش کردہ خدمات کو قبول کرنے میں تامل کرے

میں چند باتیں ایک اور مسئلہ کے متعلق بھی کہنا چاہتا ہوں۔ ڈپٹی ایجوکیشنل ایڈوائزر (پنجاب) نے مجھے اطلاع دی ہے کہ جنگ کے دنوں میں فوج نے لاطینی رسم الخط کے ذریعہ تقریباً ۲۰ لاکھ سپاہیوں کو پڑھنا لکھنا سکھایا۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ وہ تین سے لے کر چھ ماہ کے عرصہ میں اتنی ہندوستانی سیکھ سکتے ہیں کہ اس سے اپنا کام چلا سکیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اگر دیوناگری یا اردو رسم الخط اختیار کیا جاتا تو اسی قدر کامیابی حاصل نہ ہوتی۔ مختلف صوبوں کے لوگوں کے لئے مشترکہ رسم الخط تلاش کرنے کے مسئلہ کو رومن نے حل کر دیا ہے اگر ان لوگوں کو جنہیں فوجی ملازمت کے دوران میں لکھنا پڑھنا سکھایا گیا ہے دوبارہ ان پڑھ بننے سے روکنا ہے تو ہمارے لئے ضروری قدم ہوگا کہ رومن ہندوستانی میں انہیں موزوں لٹریچر دیا کریں۔ اس لٹریچر کی بھاری مانگ ہے۔ اور محکمہ اس مانگ کو پورا کرنے

کے سوال پر سوچ رہا ہے۔

یہ پسندیدہ امر ہے کہ ہر ہندوستانی دیوناگری اور اردو دونوں رسم الخط سیکھے۔ لیکن اس کے لئے وقت درکار ہوگا۔ اور اس وقت تک یہ رسم الخط سیکھے جائیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ مرکزی تعلیمی مطبوعات میں دیوناگری اور اردو کے علاوہ لاطینی کو ذیلی رسم الخط کی حیثیت میں آیا۔ عارضی طور پر اختیار کیا جائے۔ یا مستقل طور پر لاکھوں بنگالی، مدراسی۔ آریہ، آسامی اور دوسری زبانیں بولنے والے لوگ ایسے ہیں جو ہندوستانی سمجھتے ہیں اور اسے بڑی جلدی سیکھ لیتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں اگر وہ کوئی دقت محسوس کرتے ہیں تو وہ بھی رسم الخط کی دقت ہے۔ بہرحال یہ مسئلہ ایسا ہے جس پر سارے ملک کے ماہرین تعلیم کو غور کرنا چاہیے۔

اب میں ان بڑے امور کو لیتا ہوں جن پر مستقبل قریب میں عمل کیا جائے گا

۱۔ یہ وقت ہے کہ ایک قومی عجائب گھر قائم کیا جائے۔ جس میں ہندوستانی فلسفہ۔ لٹریچر اور آرٹ کے بہترین نمونے رکھے جائیں اس سلسلے میں پہلا قدم یہ ہوگا کہ جیسا کہ تعلیم کے مرکزی مشاورتی بورڈ نے حال میں یہ تجویز کیا تھا۔ ایک قومی تعلیمی ٹرسٹ قائم کیا جائے۔

(۲) بنیادی نوعیت کے تحقیقاتی کام کا بندوبست کیا جائے اور اس غرض کے لئے ہر سال معین رقمیں مخصوص کی جائیں۔ ظاہر ہے کہ بنیادی نوعیت کے تحقیقاتی کام کے بغیر نہ صنعت میں کوئی ترقی کی جاسکتی ہے۔ اور نہ فنیات میں، تاہم اس تحقیقات کے دائرہ کو وسیع کرنا چاہیے۔ اور یہ نہ صرف سیاسی مسائل پر بلکہ عام ادب پر بھی جاری ہونا چاہیے۔ جس میں فلسفہ، سماجی علوم، علم انسان وغیرہ بھی شامل ہیں۔ کابینہ کی احتیاطی کمیٹی نے اگلے پانچ سال میں

بنیادی نوعیت کے تحقیقاتی امر کے لئے اصولی طور پر ۷۵،۰۰،۰۰۰ روپیہ (پچہتر لاکھ) کی گرانٹ منظور کی ہے۔

(۳) الف۔ تعلیم کی نئی اسکیم کے لئے ہیں اساتذہ کے لئے ایک گائڈ رہنمائی کے لئے (کتاب) تیار کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کرنے کی تجویز بھی زیر غور ہے۔ اگرچہ مرکزی حکومت کا یہ منشا نہیں ہے کہ ہر جگہ یکسانیت پیدا کرے۔ بلکہ وہ چاہتی ہے کہ صوبے اس بارے میں زیادہ سے زیادہ آزاد رہیں۔ تاہم جن عام اصول پر یہ تعلیم دی جانی مقصود ہے۔ انہیں طے کر دینا ضروری ہے۔

(ب) عام نوعیت کے کوئی نصاب تیار کرنے کے مسئلے پر بھی غور و خوض کیا جا سکتا ہے۔ مقررہ قسم کا نصاب شدید رنگ کی یکسانیت پیدا کر دیتا ہے اس لئے نصاب کی تیاری میں ہر ممکن اختیار برتنے کی ضرورت ہے۔

(۴) حکومت ہند اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے کہ تعلیم سے متعلق تجربہ کرنے والے اداروں کو یہ انتظار کئے بغیر کہ ایسے تجربوں کے نتائج کب پرکھے جائیں گے۔ مالی امداد دی جائے۔ اس قسم کے اداروں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ ان میں بیشتر ادارے اپنی پوری صلاحیتوں کو اس وجہ سے بروئے کار نہیں لا سکے کہ مالی مشکلات ابتدا ہی سے ان کے راستے میں حائل ہو گئیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حکومت ہند نقد امداد دے۔ ایسا نہ ہو کہ روپیہ کی کمی کی وجہ سے ایسے ادارے اپنے تجربات مکمل کرنے سے قاصر رہیں۔ جنی اداروں کو حال میں حکومت نے مدد دی ہے۔ وہ جامعہ ملیہ دہلی اور شانتی نکیتن بنگال ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے تمام اداروں کا ذکر کرنا ناممکن ہے۔

۵۔ ہندوستان میں علم آثار قدیمہ کی ترقی وہ دوسرا امر ہے جس کی طرف فوری دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ اس وقت تک ہمارے پاس ہندوستان کی کوئی

مکمل تاریخ نہیں۔ اور ہمیں اسے ان یادگاروں اور دوسرے آثار قدیمہ سے تیار کرنا ہوگا۔ جو ملک بھر میں پائے جاتے رہیں۔

۶۔ ڈزرائیلی نے کیا صحیح کہا تھا کہ جو جمہوریت اپنے علمبرداروں کو تعلیم نہیں دیتی اس کا مستقبل شاندار نہیں۔ ہندوستان میں یہ مسئلہ اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ درپیش ہے۔ یہاں عوام کی تعلیم کا مسئلہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے جس کو حل کرنے کے لئے وقت درکار ہے۔ تاہم اسے معرض التوا میں نہیں رکھا جا سکتا اور جدید سائنس نے براڈکاسٹنگ اور فلم کی شکل میں موثر ہتھیار ہمارے ہاتھ دیئے ہیں۔ بعض اسکیمیں ہیں کہ زیر غور ہیں جن کے ذریعہ ان ہتھیاروں کو عوام میں وسعت نظر پیدا کرنے اور ان پر علم کی ایک نئی دنیا کا دروازہ کھولنے کے لئے پوری حد تک استعمال کیا جا سکتا ہے۔

آخر میں یہ کہ ہمارا جو بھی نظام تعلیم ہو اس میں اصلاح کرنے اور اس میں توسیع کرنے کی بھاری ضرورت پر زور دینا چاہتا ہوں کہ تعلیم کو ہمارے قومی بجٹ میں پہلی ترجیح ملنی چاہیئے۔ اور خوراک اور کپڑے کے بعد اس کا نمبر ہونا چاہیئے۔

حقیقت یہ ہے کہ خود ان مسائل کو تسلی بخش طور پر حل کرنے کے لئے بھی تعلیم کے ایک مناسب نظام کی ضرورت ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ اگر استقلال کے ساتھ متفقہ طور پر کوشش کی جائے تو ہم اپنی کمی کو پورا کرلیں گے۔ اور ہندوستان میں تعلیم کے نظام کو دنیا کے دوسرے متمدن ملکوں کے نظام کے ہم پلہ بنا دیں گے۔

مولانا ابو الکلام آزاد نے تقسیم اسناد کے سلسلے میں یہ خطبہ ۲۰ - فروری ۱۹۴۹ء میں دیا تھا - اس خطبہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں گزشتہ نصف صدی کے سیاسی علمی اور ثقافتی تاریخ کے بعض وہ گوشے اجاگر ہوگئے ہیں - جن سے بے خبری تاریخ کے ایک طالب علم کے لئے بہت بڑا جرم ہے -

سرسیّد کی تعلیمی خدمات

اغلب خیال یہ ہے کہ عوام کے ذہنی رجحانات پر جتنے ہمہ گیر اثرات "تہذیب الاخلاق" نے چھوڑے ہیں - ہندوستان (برصغیر ہند و پاک) کے کسی اور رسالے نے نہیں چھوڑے - سرسید مرحوم نے دورۂ انگلستان سے واپسی پر اس رسالہ کی داغ بیل ڈالی تھی - وہ خود اور ان کے رفقاء اس کے مضامین لکھتے تھے اس رسالہ کے اجراء سے موجودہ اردو ادب کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے - اردو نے اس رسالہ کی بدولت اتنا فروغ پایا کہ دقیق سے دقیق مطالب کا اظہار اس زبان میں ہونے لگا - اس دور کا کوئی مسلمان ادیب الیانہ ہوا تھا جو تہذیب الاخلاق کے حلقۂ ادب سے متاثر نہ ہوا ہو - دورِ جدید کے بلند معیار مصنفین نے اسی خوان نعمت سے لقمے چنے اسی حلقہ کے اثر و نفوذ سے نقد و لظر کی نئی قدریں اور فکر و نظر کے نئے زاویے متعین ہوئے - اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید اردو شاعری نے لاہور میں جنم لیا - لیکن اسے اپنی نشو و نما کے لئے علی گڑھ کی فضا راس آئی ، نئے انداز اور جدید اسلوب کی نظمیں اسی شہر کے ادبی ماحول کی پیداوار ہیں - پہلی بار محمڈن

ایجوکیشن کانفرنس نے اس انداز کلام سے دنیا کو روشناس کرایا۔ اردو خطابت کی تربیت گاہ بھی دراصل یہی کانفرنس ہے اس کی آغوش میں وقت کے بلند پایہ ارباب ادب کی خطیبانہ صلاحیتیں بیدار ہوئیں اس کانفرنس کے پلیٹ فارم نے انہیں عوام سے متعارف کرایا اور یہی حقیقت ہیں ان کی شخصیتوں کے دبے ہوئے نقوش ابھرے انیسویں صدی نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے مشرق کے لئے ایک عبوری دور کی حیثیت رکھتی تھی۔ حیات و فکر کے قدیم آثار مٹ رہے تھے۔ اور ان کی جگہ وقت کے جدید تقاضوں کا قصر تعمیر ہو رہا تھا۔ ہندوستان کی پرانی دھرتی ایک نئے سانچے میں ڈھل رہی تھی۔ جہاں تک مسلمانان ہند کا تعلق ہے ان کی صلاحی تحریکات پہلے پہل علی گڑھ ہی میں پایۂ تکمیل کو پہونچیں۔ یہی وہ خطہ تھا جس کے سر پر قدرت نے ہند جدید کی تخلیق کا تاج قیادت رکھا انیسویں صدی کو ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کا دور کہا جاسکتا ہے اور علی گڑھ اس نشاۃ ثانیہ کا اہم ترین مرکز تھا۔

یہ سچ ہے کہ سید احمد خاں کے انتقال نے علی گڑھ کو متعدد امتیازی خصوصیات سے محروم کردیا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کالج نے ترقی کی منازل طے کیں۔ اور یونیورسٹی کا مقام حاصل کرلیا۔ لیکن باایں ہمہ بہ ارادہ شان و شکوہ کی قدیم روایات برقرار نہیں رکھ سکا۔ بہرحال یہ ذہن نشین رہے۔ کہ یہ ادارہ آپ حضرات کی جہتم بالشان میراث ہے۔ اور اسی لئے آپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ آپ اس کی گذشتہ روایات کے احیاء کی فکر کریں۔ وہ کتبے جو آپ حضرات نے اسٹریچی ہال کے در و دیوار پر کندہ کئے ہیں۔ گردش لیل و نہار کی ایک رگڑ ان کے نقوش محو کرسکتی ہے۔ لیکن وہ کتبے جو علی گڑھ نے تاریخ ہند کے موجودہ دور کی پیشانی پر مرتسم کئے ہیں ان کے نقوش کی درخشندگی و تابندگی میں فرق

نہیں آسکتا۔ مستقبل میں مورخین ان اہم اسباب و ذرائع کی فہرست میں علی گڑھ کو بھی شامل کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جن پر ہند جدید کی پیش رفت کا دار و مدار ہے۔

وہ تعلیمی ادارے جس کی پشت پر ماضی کی شاندار روایات ہیں، اس کا مستقبل بھی شان و شکوہ کا مظہر ہونا چاہیے۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ آج کل حضرات کے ذہنی رجحانات کیا ہیں؟ اور نہ مجھے یہ خبر ہے کہ آپ مستقبل کے بارے میں، کن نظریات کے حامل ہیں؟ یہ کہ مستقبل آپ کو در بندی کا پیغام دیتا ہے۔ یا فاتح باب کا۔ تاکہ تجربات کی نئی راہیں کھلیں۔ ابھی میرے دائرہ علم اطلاع سے باہر ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کے تصورات کیا ہیں؟ جن روشن حقیقتوں کے دریچے میری نگاہوں کے سامنے کھلے ہیں۔ ان سے آپ بھی تاک جھانک کر سکتے ہیں۔ غالباً آپ حضرات کے محسوسات یہ ہیں کہ جو دروازے کھلے ہوئے تھے بند ہو چکے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ جن دروازوں پر تالے پڑے ہوئے تھے وہ اب پہلے کی طرح بند نہیں رہے ایک ایرانی شاعر کے الفاظ ہیں:

تفاوتیست میانِ شنیدنِ من و تو
تو لبستن در و من فتح باب می شنوم

میری اور آپ حضرات کی سماعت کے انداز جدا جدا ہیں۔ آپ حضرات در بندی کی صدا سنتے ہیں اور میں فتح باب کی آواز۔

"تکلفات بالائے طاق رکھتے ہوئے۔ آپ حضرات سے کھل کر کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے۔ کہ آپ مجھ سے اسی بات کی توقع رکھتے ہیں۔

اگر میں یہ سمجھتا آپ ہنوز اس سیاسی ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جو ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء سے قبل آپ حضرات کے دل و دماغ پر مستولی تھا۔ تو میں

بلا تامل یہ کہہ سکتا تھا کہ ابھی آپ حضرات کا مستقبل تاریکی میں ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ آپ میں بہت بڑی تبدیلی آچکی ہے۔ اور ایک نئے دور کی خوش آئند توقعات آپ کی تبدیلی کا خیر مقدم کر رہی ہیں۔ اچھا ہوا کہ آپ نے آج کے بدلے ہوئے حالات میں اس ادارہ کا ذہنی ماحول بھی بدل گیا ہے آپ نے وقت کی نبض پہچان کر ایسے حالات کے قالب میں اپنے آپ کو ڈھال لیا ہے جن سے مفر کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ مجھے اس حقیقت کے اظہار میں مطلق کوئی تامل نہیں ہے۔ کہ وقت کے تقاضوں کے پیش نظر آپ نے جو راہ عمل اپنے لئے تجویز کی ہے اسے نہ صرف اس ارادہ کے حق میں بلکہ جملہ مسلمانان ہند کے لیے ایک خدمت جلیلہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ۔ اس سلسلے میں آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

مرکزی حکومت نے قومی تعلیم اور تعلیمی اداروں سے متعلق جو پروگرام پیش کیا ہے۔ اس کی رو سے علی گڑھ یونیورسٹی کے دروازوں کا ملک کے ہر باشندے کے لئے وا ہونا ناگزیر ہے۔ میرا خیال ہے۔ آپ حضرات بھی ملک کی موجودہ ہیئت و حیثیت کے پیش نظر مجھ سے اس بارے میں ضرور متفق ہوں گے کہ تعلیم کی نوعیت میں عمومیت ہونی چاہیئے۔ اس تعلیمی ادارے کا نصب العین عوام کی ترقی اور خوشحالی ہونا چاہیئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں قومی تعلیم کچھ اس انداز کی ہونی چاہیئے۔ کہ زمانے کے مزاج پر شاق نہ گزرے۔ اگر یہ رخ اختیار کیا گیا تو اپنی اہم خصوصیات کے باوجود یہ تعلیمی ادارہ عمومی فرائض کے ساتھ ساتھ خصوصی کردار بھی ادا کر سکے گا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے بڑے دل گردے اور کافی حوصلے کی ضرورت ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ افلاطون نے اپنی درسگاہ کے دروازے پر یہ الفاظ کندہ کرا دیئے تھے کہ :۔

"جن حضرات کو اقلیدس نہیں آتی انہیں داخلہ کی اجازت نہیں۔"
آپ حضرات کے ادارہ کو اس قسم کا کوئی امتناعی حکم صادر نہیں کرنا چاہیے بلکہ آپ کا مقولہ یہ ہونا چاہیے کہ۔

"ہم اقلیدسی اور غیر اقلیدسی دونوں کا خیر مقدم کرتے ہیں"
مجھے معلوم ہے کہ آپ کے ادارہ کا اصول شروع سے فراخ دلانہ اور فیاضانہ رہا ہے۔ جب آپ کے کالج کی بنیاد پڑی تھی تو اس کے طلبہ میں ہندو بھی تھے۔ اور مسلمان بھی۔ اساتذہ میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی تھے۔ بعض ہندو پروفیسروں کے نام اس تعلیمی ادارے کی تاریخ کا ایک اہم جز بن چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے۔ کہ ان روایات کے دائرہ میں مزید توسیع کا اہتمام کیا جائے گا۔ اور رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی عظمتِ رفتہ کے نقوش اجالنے کی کوشش بھی ہوگی۔

علوم اسلامیہ اور تاریخ اسلام کے مطالعہ و تحقیق کے سلسلہ میں اس تعلیمی ادارہ کے شاندار روایات وابستہ رہی ہیں۔ لیکن واقعات بتلاتے ہیں۔ کہ سر سید کے انتقال کے بعد اس تعلیمی ادارہ کا چاند گہن میں آگیا تھا۔ یونیورسٹی کے قیام کے بعد بھی اس کے دبے ہوئے نقوش نہیں ابھر سکے آج آپ حضرات کا یہ فرض منصبی ہے کہ قدیم روایات کا احیاء عمل میں آئے اور علوم و فنون کے تمام شعبوں میں تحقیق و تدقیق کے ایک خوشگوار ماحول کی تخلیق کی جائے۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ علی گڈھ ہی وہ مقام ہے۔ جہاں موجودہ اردو ادب نے ارتقائی منازل طے کی تھیں۔ یہ ایک ایسی امتیازی فضیلت اور ایک ایسا شرف ہے۔ جس پر آپ کی یونیورسٹی بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔ اب یہ آپ کا فرض ہے۔ کہ آپ اس میراث کے حفظ و بقا کا اہتمام اور اس کے بام و در پر گل کاریاں

کریں یہ بھی واضح رہے کہ موجودہ دور کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی ادبی کوششوں کا دائرہ ماضی کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہونا چاہیے۔ آپ کو ہندی ادب سے بھی دلچسپی لینی چاہیے۔ مسلمانوں کا یہ طرۂ امتیاز رہا ہے کہ انہوں نے ہر زبان اور ہر ادب سے دلچسپی لی ہے۔ ہندی ادب پر مسلمانوں کے بھی اتنے ہی حقوق ہیں جتنے کہ ہندوؤں کے، ماضی میں دونوں نے ہندی اور اُردو کی ادبی پیش رفت کے لئے نمایاں خدمت سر انجام دی ہیں۔

عہد مغلیہ میں برج بھاشا کے نئے ادب کی تخلیق کا آغاز دراصل اکبر اور جہانگیر ایسے مثل حکمرانوں کی ادب نواز سرپرستی کا نتیجہ ہے۔ محمد جائسی، خانخاناں اور عبد الجلیل بلگرامی نے برج بھاشا کے ادب کو اپنے کلام سے چار چاند لگائے ہیں۔ تاریخ بتلاتی ہے۔ کہ اٹھارویں صدی کے آخر تک جن مسلمان شعراء نے برج بھاشا میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ اب وقت کا تقاضا ہے کہ آپ حضرات بھی پرانی روایات کا احیاء کریں۔ میری خواہش ہے کہ اس تعلیمی ادارے کے ماحول میں ایسے ادباء کی ایک بہت بڑی کھیپ پیدا ہو جو ہندی اور اُردو ادب میں برابر کی دست گاہ رکھتی ہو۔

آج رسم الخط کا مسئلہ مابہ النزاع بنا ہوا ہے آپ حضرات سے غالباً گاندھی جی کی وہ رائے مخفی نہ ہو گی۔ جس کا انہوں نے وقتاً فوقتاً اظہار کیا ہے ان کی دیانتدارانہ رائے یہ تھی کہ ہر ہندوستانی کو ہندی اور اُردو دونوں رسم الخط سیکھنے چاہئیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ہندوستانی پرچار سبھا کی داغ بیل ڈالی تھی اور اس کے کارکنوں پر یہ لازم کر دیا تھا کہ وہ ان دونوں رسم الخط میں مہارت بہم پہونچائیں۔ سالہا سال سے میری رائے اور میرا خیال بھی یہی رہا ہے۔ میرے خیال میں موجودہ حالات کے پیش نظر مسئلہ کا یہی مناسب

حل ہے۔ مجھے امید ہے کہ محبانِ اردو۔ ہندی ادب کے حامیوں کے ردعمل کا انتظار کئے بغیر وہ راہ عمل اختیار کریں گے جو ملک کے مفاد کے لئے ازبس ضروری ہے زندگی کے ہر دوسرے گوشے میں دوسرے کے ردعمل اور انداز کار پر غور اور تامل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر حصول علم کے سلسلے میں بھی ہمارا طرز عمل اس نوعیت کا ہوگا تو اس سے ہمارے وقار میں فرق آئے گا۔ اور ہم اس مقام سے گر جائیں گے۔ جو تاریخ نے ہمارے لئے متعین کیا ہے۔ اگر دوسرے صرف ایک رسم الخط پر قانع ہیں اور وہ دوسری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا چاہتے، تو یہ بات ہمارے لئے وجہ ملال نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ غور طلب چیز یہ ہے کہ ہم وہ رسم الخط جان لیں گے۔ جب کہ انہیں صرف ایک ہی پر اکتفا کرنا ہوگا۔ میری دیانتدارانہ خواہش یہ ہے کہ ہندوستان میں ہر مسلمان کو دونوں رسم الخط آنے چاہئیں۔ تاکہ مسلمان ملک کے سامنے ایک مثال پیش کر سکیں۔

مجھے خوشی ہے کہ اس مسئلہ کی اہمیت کا احساس عام ہو چلا ہے۔ اردو میں ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں جن کی مدد سے دیوناگری رسم الخط اور ہندی ادب پر عبور حاصل ہو سکے۔ اس مقصد اور اس غرض سے ملک کے مختلف حصوں میں کچھ ادارے بھی قائم ہو چکے ہیں اور ان میں کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات نے بھی اس مسئلہ کی اہمیت اور کام کی نوعیت کا احساس کر لیا ہے اگر یہ بات ہے تو پھر آپ کا یہ بھی تعلیمی ادارہ زبان کی تعلیم و تدریس کا ایک اہم ترین مرکز قرار پائے گا۔

آخر میں مجھے ان فارغ التحصیل گریجویٹوں سے بھی کچھ کہنا ہے۔ ان گریجویٹوں پر زندگی نے ذمہ داریوں کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ انہوں نے اپنی تعلیم کی ابتدا غلامی کے دور میں کی تھی لیکن اب اسناد فراغت انہیں اس دور

میں ملی ہیں۔ جب کہ ملک نے غلامی کا جوا اپنے کاندھوں سے اتار پھینکا ہے۔ مجھے امید ہے یہ گریجویٹ اس اہم تبدیلی اور اس عظیم الشان انقلاب کی حقیقت اپنے پیش نظر رکھیں گے۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ ملک کی آزادی کے بعد آپ پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کی نوعیت پہلے سے کہیں مختلف ہے۔ آپ اس ملک کے شہری ہیں۔ اور اس لئے آپ پر نہ صرف سیاسی خدمات کے بلکہ تجارت صنعت وحرفت اور دوسرے اہم شعبہ ہائے زندگی کے دروازے بھی کھلے ہیں۔

"ماضی میں تو یہ تھا کہ تعلیم سے فراغت کے بعد سرکاری ملازمتوں کے لئے مختلف محکموں کے دروازوں پر دستک دی جاتی تھی۔ لیکن آج آزادی کے دور میں آپ کو اپنی صلاحیتیں ملک کی صلاح و فلاح کے لئے بھی استعمال کرنی ہوں گی۔"

آپ کو چاہیئے کہ اپنے کردار کی بنیادیں استوار کریں اور اس انداز سے حصول علم کریں کہ اس کی بدولت مستقبل میں ملک ترقی کی منازل طے کر سکے۔

نوجوان اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں سے ملک کو جو فائدہ پہنچائیں گے اس کا تعلق خود ان سے بھی ہے کہ وہ اس ملک کے شہری ہیں۔

(دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے ۸ رجنوری
سنہ ۱۹۵۱ء کو طلباء سے خطاب کیا :)

علم مقصد اور وسیلہ

"عزیزو! کیا تم نے کبھی اس پر غور کیا ہے۔ کہ تم جو تعلیم حاصل کر رہے ہو۔ اس کا مقصد کیا ہے۔ یہ علم مقصود ہے یا وسیلہ، دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو وسیلہ ہیں اصل مطلوب نہیں البتہ جو مطلوب ہیں وہ ان کے بغیر نہیں مل سکتیں۔ اس لئے وسیلہ بھی مطلوب ہو جاتے گا۔ مثلاً سکہ چاندی کا سونے کا چلتا ہے۔ دولت کمانے کا یہی ذریعہ ہے مگر ہماری زندگی کی ضرورتوں میں یہ سونا چاندی کس کام آتا ہے۔ اگر پیاس لگی تو کیا چاندی سے بجھ جائے گی؟ بھوک میں کیا سونا بھوک بجھا دے گا؟ مگر جب تک یہ سامان نہ ہو کھانے پینے کی چیزیں نہیں مل سکتیں۔ اس لئے چاندی سونے کا مسئلہ بھی ضروری ہو گیا گورنمنٹ نے کرنسی نوٹ چلائے ہیں۔ کاغذ کا پرچہ ایک چھدام کا بھی نہیں ہے مگر گورنمنٹ نے اس پر چھاپ دیا ہے کہ ایک ہزار روپے۔ اب یہ وسیلہ ہے، اسی کاغذ کے ذریعہ روپیہ اور اشرفیاں مل جاتی ہیں۔ یہ وسیلہ ہو گیا ہے ایک ہزار روپے وصول کرنے کا۔ لوگ ہزار روپے کی اشرفیاں یا چاندی کے سکے رکھتے بلکہ کاغذ کا یہ پرزہ رکھ لیتے ہیں۔ جو چیزیں وسیلے کا حکم رکھتی ہیں۔ ان میں استقرار ضروری نہیں ہے۔ اور جو چیزیں مقاصد میں داخل ہیں ان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

تم اپنے گھروں کو اور عزیز و اقارب کو چھوڑا اور یہاں آئے ملک میں تعلیم کے دوسرے طریقے بھی رائج ہیں۔ لوگ ان کی طرف دوڑتے ہیں مگر تم نے اسکولوں اور کالجوں سے آنکھیں بند کیں تاکہ تم دینی علوم میں مہارت حاصل کرو بڑا مبارک ارادہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس علم کو تم سیکھ رہے ہو وہ علم وسیلہ ہے یا مقصد؟ تمہارے ذہن نے اگر اس کو نہ سمجھا تو میں متنبہ کروں گا کہ تم صحیح کام نہیں کر رہے ہو۔

اور قوموں نے ہمیشہ علم کو وسیلہ سمجھا ہے۔ مگر مسلمانوں کی یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے علم کو وسیلہ نہیں مقصد سمجھا ذریعہ معاش نہیں سمجھا ہندوستان میں ۴۲ یونیورسٹیاں ہیں بہت سے کالج ہیں۔ اور لاکھوں اسکول ہیں جن کا دامن دیہات تک پھیلا ہوا ہے۔ ان میں جو تعلیم ہوتی ہے۔ اس کو وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ مقصد نہیں سمجھا جاتا۔

ان میں صرف اس لئے تعلیم حاصل کی جاتی ہے کہ سرکاری ملازمتیں مل سکیں اور اونچے اونچے عہدے حاصل کئے جا سکیں جو شخص وہاں جاتا ہے وہ سمجھتا ہے۔ کہ جب تک یہاں کی ڈگری موجود نہ ہو وہ معاش حاصل نہیں کر سکتا۔ مگر میں تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جس علم کی خاطر تم زانوئے ادب تہہ کر رہے ہو وہ علم مقصد ہے! وسیلہ نہیں ہے! اس کو کسی وسیلہ کے لئے حاصل نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس لئے حاصل کیا جاتا ہے کہ اس کا حصول فرض ہے۔ مسلمانوں نے ہمیشہ علم کو علم کے لئے سیکھا ہے وسیلہ کے لئے نہیں انہوں نے کبھی علم کو اس لئے حاصل نہیں کیا۔ کہ اس کے ذریعہ معیشت حاصل کریں۔ مسلمانوں نے ذریعہ معیشت کسی اور چیز کو بنایا جنہوں نے علماء کے افکار و واقعات سنے ہیں وہ جانتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ جنہوں نے علم فقہ مدون کیا جس پر کروڑوں مسلمان عمل کرتے ہیں وہ بزاز تھے،

انہوں نے اپنے وسیع علم کو ذریعہ معیشت نہیں بنایا۔ حضرت معروف کرخی موچی تھے آج ہم اس پیشہ کا نام بھی سننے کے لئے تیار نہیں۔ وہ کرخ میں نکل جاتے بازار میں بیٹھتے، راہ چلتے آدمیوں کے جوتے سیتے اور اس کی اجرت سے گذر بسر کرتے۔ شمس الائمہ سرخسیؒ کا نام ہی حلوائی پڑ گیا تھا اور اتنا بڑا عالم اپنا ذریعہ معیشت حلوا فروشی بنائے ہوئے تھا۔ اس طرح اسلام کے مشہور علماء نے علم دین کے چشمے بہائے۔ مگر کبھی علم دین کو ذریعہ معیشت نہیں بنایا۔ وہ علم کو علم کے لئے حاصل کرتے تھے زخارف دنیوی کے لئے نہیں۔ ان کے نزدیک یہ گناہ تھا کہ علم کو دنیا کے لئے حاصل کیا جائے۔

وہ تشنگان علم کو علم کی روشنی سے سیراب کرنا اپنا دینی فریضہ سمجھتے تھے! یہ ہمارے علماء کا خاص شیوہ رہا ہے کہ دین کی خدمت علوم دینیہ کی اشاعت انہوں نے اپنا فریضہ سمجھا۔ انھوں نے اس کے لئے خرید و فروخت کا بازار گرم نہیں کیا۔ اس حقیقت کو اگر تم نے سمجھ لیا تو اپنی پوری زندگی کی تاریخ ڈھال لی۔

عزیزو! اللہ نے تمہیں علم دین کی توفیق دی ہے تو تمہارا فرض ہے کہ اس کی صدا ہر شخص کے کانوں تک پہونچادو! کچھ دنوں کے بعد تم تعلیم کے مرحلوں کو طے کر کے فراغت حاصل کروگے۔ اور ایک عالم دین کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش ہوگے اس وقت تمہارے سامنے بھی یہ فریضہ ہونا چاہیئے کہ اگر تم نے یہ کرلیا تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ جو علم تم حاصل کر رہے ہو اس آسمان کے نیچے اس سے اونچا عزت کا اور کوئی مقام نہیں ہوگا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی توفیق بخشے:

* یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل کی آمد کے اعزاز میں ۲۴ مارچ ۱۹۵۱ء کو نئی دہلی میں جو اجتماع ہوا اس کا افتتاح مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا۔ اس موقعہ پر مولانا نے مہتمم عمومی ڈاکٹر جیمس ٹورلیس بوڈیٹ کا خیر مقدم کرتے ہوئے یونیسکو اور اس کے اغراض و مقاصد پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ اس ضمن میں آپ نے اقوام متحدہ کے فرائض پر بھی روشنی ڈالی :۔

یونیسکو اور بین الاقوامیت

یونیسکو - اقوام متحدہ کا وہ خصوصی ادارہ ہے جو بین الاقوامی امن و سلامتی کے قیام و دوام کے لئے معرض وجود میں آیا ہے - یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر ہم سیاسیات کا سہارا لیں تو عالمی اتحاد کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا، اس جہت سے جتنی کوششیں بھی عمل میں آئی ہیں - ہمیشہ صدا بصحرا ثابت ہوئیں - مجلس اقوام متحدہ جیسے عالمی ادارے جن کی تشکیل کا واحد مقصد یہ تھا کہ مختلف سیاسی عناصر کو اتحاد و اتفاق کے قالب میں ڈھالیں - آج تک کوئی ایسا کارنامہ سر انجام نہیں دے سکے جس سے خیر و فلاح کی توقعات وابستہ ہو سکیں - انجمن اقوام متحدہ کا قیام اس لئے عمل میں آیا تھا کہ اس کی سرپرستی میں جملہ سیاسی مسائل عدل و انصاف کے ساتھ حل ہو سکیں اور یہ انجمن جو قدم بھی اٹھائے غیر جانبداری کے ساتھ اٹھائے بایں معنی کہ کسی قیمت پر بھی اس کا میلان کسی ایک بلاک کی جانب نہ ہونے پائے - بدقسمتی سے ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس انجمن پر بھی سیاسی طاقتوں کی بالادستی اپنا پرتو ڈال رہی ہے - وہ قومی نزاعات جو کبھی سیاست کاری کا طرۂ امتیاز رہے ہیں اس انجمن کے مزاکراتی دریچوں سے تاک جھانک کرتے دکھائی دیتے ہیں تاوقتیکہ اس انجمن کا رشتہ سیاسی گروہ بندیوں سے منقطع نہیں ہوتا - ہم یہ کیسے باور کر سکتے ہیں کہ اس ادارہ کو اپنے مقاصد میں کامیابی کبھی نصیب ہو سکتی ہے - اس انجمن کے فرائض میں تو یہ چیز داخل ہے کہ تمام مسائل کا بین الاقوامی عدل و انصاف کی روشنی میں جائزہ لے - عالمی امن کا قیام اتنا مقدس نصب العین

ہے کہ ہم اس کی خاطر عزم و عمل کی ہر وادی قطع کرنے کے لئے بسر و چشم آمادہ ہیں۔ انجمن اقوام متحدہ کو ہم اس مقصد کی تکمیل کے لئے ایک صحیح اور درست آلۂ کار تسلیم کرتے ہیں۔ ایرانی شاعر عرفی کے اس شعر سے میرے احساسات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

زنقش تشنہ لبی داں بعقل خویش مناز

دلت فریب گر از جلوۂ سراب نخورد

اگرچہ امن و سلامتی کی وہ توقعات جو اقوام متحدہ سے وابستہ ہیں۔ جلوۂ سراب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں لیکن بایں ہمہ یہ جلوۂ سراب بھی ہمیں عزیز ہے اور ہم بسر و چشم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر اس سر گشتہ و سراسیمہ دنیا میں کہیں کوئی امید کی کرن نظر آتی ہے اور کہیں امن و سلامتی کی فضائیں اپنی پوری خوشگواریوں کے ساتھ ہمیں دعوتِ نظارہ دیتی ہیں تو وہ یونیسکو ہے اور صرف یونیسکو، اس ادارہ کی سرگرمیاں ہی کچھ ایسی ہیں کہ ہم انہیں قیام امن کے سلسلہ میں بہت کچھ اُمید افزا سمجھتے ہیں۔ یونیسکو کی یہ تشخیص کس قدر صحیح ہے کہ جملہ نزاعات کا چشمہ انسان کا دماغ ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ امن و سلامتی کے تخم کی طرح دل و دماغ کی گہرائیوں میں ڈالی جائے۔ نسل انسانی کے ثقافتی اتحاد پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ مختلف ممالک اور مختلف اقوام نے اپنے اپنے عملی دائروں میں اس اتحاد کی بنیادیں استوار کی ہیں۔ یونیسکو کے ایوان میں اقوام متحدہ کے سیاسی نزاعات راہ نہیں پاتے۔ اس ایوان میں کچھ ایسی خوشگوار فضا اور ایسا صلح پرور ماحول پایا جاتا ہے۔ کہ وہ حضرات بھی جو اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل میں ایک دوسرے سے شدید نظریاتی اختلافات رکھتے ہیں۔ ہم کاری اور ہم خیالی کا عملی مظاہرہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مثال اور نظیر کے طور پر ان سیاسی اختلافات کی جانب اپنے مقتدر سامعین کی توجہات منعطف کرتا ہوں۔ جن کے نتیجہ میں جنوبی افریقہ

اور ہندوستان کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل ہو گئی ہے۔ ہندوستان نے اقوام متحدہ کے تعاون سے یہ جائز سوال اٹھایا تھا کہ وہ نسلی امتیازات جو جنوبی افریقہ میں فروغ پا رہے ہیں جلد سے جلد ان کا خاتمہ ہونا چاہیئے۔ اس بین مملکتی اختلافات کا اثر یہ ہونا چاہیئے تھا کہ دونوں ملکوں کے تعلقات میں کشیدگی آجاتی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یونیسکو کے اجلاسات میں جب تعلیم سائنس اور ثقافت کے مسائل زیر بحث آتے ہیں اور یہ غور کیا جاتا ہے کہ ان کی ترقی کا دائرہ وسیع ہونا چاہیئے۔ تو جنوبی افریقہ کے مندوبین، ہندوستان کے نمائندوں سے نہ صرف اتفاق کرتے بلکہ اپنی ہم کاری کا ثبوت بھی دیتے ہیں ایسی فضا کی تخلیق میں جہاں انسان دوستی اور برابری کی سطح پر ایک دوسرے سے چولی دامن نظر آئیں تعلیم اور صرف تعلیم کی معجز نمائیوں کو دخل ہے۔ ہمارے لئے یہ فرحت و مسرت کا مقام ہے کہ آج یونیسکو کی سربراہی ایک ایسی شخصیت کی تحویل میں ہے۔ جس نے ان مقاصد کی تکمیل کے لئے کچھ ایسی کوششیں کی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس منصب کی مستحق ہے۔

آپ شاید اس بارے میں مجھ سے اتفاق کریں گے کہ نئی پود کے مرد و زن کی تربیت ایک ایسے علیحدگی پسند ماحول میں ہوئی ہے۔ کہ ان سے عالمی اتحاد اور آفاقی شہریت کی توقعات وابستہ نہیں کی جا سکتیں۔ انہیں ایسے خطوط پر غور و فکر کی تربیت دی گئی ہے جن پر نسلی، طبقاتی، یا قومی امتیازات کا خول چڑھا ہوا ہے۔ اگر ہمارے پیش نظر عالمی اتحاد کا حصول ہے اور اس چیز پر سب متفق ہیں کہ ایسے اتحاد کے بغیر انسان کا مستقبل تاریک رہتا ہے تو ہماری تمام تر کوششیں آفاقی شہریت کی خاطر، نئی پود کی تعلیم و تربیت پر مرکوز ہونی چاہئیں۔ اگر ابتدائی ایام ہی سے آج کے بچوں کی تربیت، اتحاد و اخوت کی بنیادوں پر کی جائے تو بڑی عمروں میں ان کا شعور اتنا بالغ اور فہم اتنا پختہ ہو جائے گا۔ کہ موجودہ نزاعات ان کی نظریں بے

وقوت اور بے حقیقت ٹھہریں گے۔

اس مقصد کے لئے مدارس میں تاریخ وجغرافیہ کی تعلیم کا پورا ڈھانچہ تبدیل کرنا ہوگا۔ تا وقتیکہ اس مقصد کی تکمیل نہ ہو۔ اقوام عالم کے جسم میں اتحاد واتفاق کی روح نہیں پھونکی جاسکتی اور یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ جب تک اس قسم کا اتحاد بروئے کار نہیں آئے گا آفاقی شہریت کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ تاریخ وجغرافیہ کی تعلیم کا جو طریقہ رائج ہے۔ وہ نہ صرف مقصد کی تکمیل میں خلل انداز ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اس کی بنیاد ہی سرے سے حقائق پر نہیں ہے یہ کرۂ ارض جو باعتبار تخلیق ایک ہی تھا ہے۔ ہم نے اسے اپنے ذاتی مفاد اور شخصی منفعت سے مختلف حصص پر منقسم کر دیا ہے۔ اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ہم نے یہ ستم ظریفی کی ہے۔ کہ اس مشترکہ دنیا کے نقشے میں نت نئے رنگ بھر دیئے۔ پھر یہ تقسیمیں کچھ اس انداز سے کی گئی ہیں کہ ان پر اسم ورسم کے خول بھی چڑھا دیئے گئے۔ کسی کا نام ایشیا پڑا تو کسی کا یورپ، کسی نے امریکہ نام پایا تو کسی نے افریقہ جب ہم کسی بچے کو جغرافیہ کی تعلیم دیتے ہیں تو ہم شروع میں یہ حقیقت اس کے ذہن نشین نہیں کرتے کہ وہ پوری دنیا کا شہری اور پورے عالم کا باشندہ ہے۔ اس کے برعکس ہم اس کے ذہن میں یہ بات بٹھاتے ہیں کہ اس کا تعلق دہلی سے ہے اور دہلی ہندوستان میں ہے۔ ہندوستان ایشیا میں ہے اور ایشیا مشرق کرہ ارض میں ہے۔

یہ تمام منازل ومدارج عبور کرنے کے بعد آخر میں ہم اس پر یہ واضح کرتے ہیں کہ وہ دنیا کا باشندہ ہے۔ اس پر عالمی شہریت کے حقوق عائد ہوتے ہیں۔ اگر ایسے ماحول میں پلا ہوا بچہ اپنے آپ کو کسی خاص خطہ سے متعلق سمجھتا ہے۔ خواہ وہ دہلی ہو یا پیرس، پیکنگ ہو یا نیویارک تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؟ زیادہ

سے زیادہ وہ صوبائی اور قومی حدود سے تجاوز کرسکتا ہے کہ میں ایشیائی ہوں یا یوروپی افریقی یا امریکی ؟ رہا نسل انسانی سے اس کی رکنیت کا نظریہ اس کی حیثیت وہمی یا خیالی رہ جاتی ہے ۔

مجھے یقین ہے کہ آپ جغرافیہ کی تعلیم میں تبدیلی کے سلسلے میں مجھ سے ضرور متفق ہوں گے ۔ ابتدائی درجات میں بچوں کے لئے ایسے نئے نقشوں کی ضرورت ہے جن میں دنیا کا ایک رنگ دکھایا گیا ہو ۔ ہمیں بچہ کو یہ تعلیم دینی چاہیئے کہ وہ دنیا کا ایک شہری ہے پھر اس پر یہ حقیقت واضح کرنی چاہیئے کہ جس طرح سہولت کی خاطر کسی قصبہ وارڈوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور اس تقسیم سے قصبہ کی وحدت میں فرق نہیں آتا اسی طرح دنیا مختلف منطقوں پر منقسم ہیں ۔ جیسا کہ ایشیا، امریکہ افریقہ اور یوروپ ۔ لیکن ان تقسیمات سے عالمی وحدت میں فرق نہیں آتا ٹھیک جس طرح وارڈ چھوٹے چھوٹے محلوں اور گلیوں میں تقسیم ہوتے ہیں اسی طرح براعظم چھوٹے چھوٹے واحدوں پر مشتمل ہوتے ہیں ۔ ان وحدوں کو ہم ممالک سے تعبیر کرتے ہیں ۔ لیکن یہ ممالک ایک ہی عالم کے اجزائے غیر منفک کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بچپن میں جغرافیہ کی تعلیم اگر اس انداز سے دی گئی تو بچوں کے ذہن پر یہ نقش بیٹھ جائے گا کہ ان کا تعلق ایک عالم سے ہے جغرافیہ کی گمراہ کن تعلیم کے پہلو بہ پہلو تاریخ کی غلط تعلیم نے بھی نسل انسانی کو مختلف شاخوں میں تقسیم کردیا ہے ۔ مروجہ کتب تاریخ میں یہ بتایا گیا ہے کہ متفرق و مختلف شعوب و قبائل کی تاریخ میں خانہ جنگیوں کے تذکرے اس کثرت سے ملتے ہیں کہ ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ اشخاص جن کا تعلق مختلف شعوب و قبائل سے ہوتا ہے آپس میں ایک دوسرے سے نفرت و حقارت کا برتاؤ رکھتے رہے ہیں ۔ تاریخ کی تعلیم کا یہ انداز انقباض طبع اور تنگ نظری کے جراثیم فضا میں نشر کرتا ہے ۔ بچہ کی افتاد طبع

کچھ ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو دنیا سے الگ تھلگ سمجھنے لگتا ہے بعض اوقات مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ مرد و زن کتنے خوش قسمت تھے جو بائبل کی روایات پر پختہ ایمان رکھتے تھے۔ اور جن کا پکا عقیدہ تھا کہ نسلوں اور قوموں کے مابین خواہ کتنے ہی اختلافات سہی۔ ہم آدم و حوّا کے بیٹے بیٹیاں ہیں مشترکہ ولدیت کا یہ تخیل، اختلافات، و نزاعات کے باوجود نقطۂ وصل اور مرکز اتصال کا حکم رکھتا تھا انیسویں صدی میں جیسے جیسے ہمارے علم میں اضافہ ہوا ہم ان مذہبی روایات میں میخ نکالنے لگے۔ مشترکہ ولدیت کے باوجود ہم نے اپنے آپ کو کبھی کاکیشیائی اور منگولیائی کہا اور کبھی آریائی اور سامی، اور بھی تقسیمیں کی گئیں، یہ تو میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آدم و حوا کی داستان مشہور ہے وہ لفظاً صحیح ہے یا کلدیانی توہمات کا عبرانی چربہ ہے۔ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک اس داستان کی روح یا اس کے نفسی مضمون کا تعلق ہے۔ اس کی صداقت میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ داستان اسی حقیقت کا اعتراف ہے کہ بنی آدم باعتبار تخلیق ایک جوہر سے تعلق رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے اس کائنات کے تمام افراد ایک دوسرے کا گوشت پوست ہیں۔ میرے خیال میں یہ اعتراف حقیقت نظریہ ارتقاء کے عقیدہ سے میل نہیں کھاتا اور نہ اس سے کائنات کے تمام افراد ایک دوسرے کا گوشت پوست ہیں۔ میرے خیال میں یہ اعتراف حقیقت نظریہ ارتقاء کے عقیدہ سے میل نہیں کھاتا اور نہ اس سے کوئی مطابقت رکھتا ہے۔ لیکن اس نظریہ کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اتحاد اصل ونسل کی نفی نہیں ہوتی اختلافات کے سلسلے میں یہ توجیہہ کی جا سکتی ہے کہ ان کا سرچشمہ ماحول اور اس کے اثرات ہیں غرض جس طرح عالمی وحدت کے استحکام کے لئے جغرافیہ کی تعلیم میں تجدید و تغیر کی ضرورت ہے اسی طرح وحدت انسانی کے قیام و بقا کی خاطر تاریخ کی تعلیم کا اندازہ بھی نئے قالب میں ڈھلنا چاہیئے اس موقع پر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس نام نہاد اختلاف کی جانب

بھی اشارہ کروں جو مشرق و مغرب کے درمیان نسلی اور ثقافتی اعتبار سے پایا جاتا ہے۔ جب ہم ان تنزاعات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی بنیاد محض غلط فہمی اور حقائق سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ صدہا سال قبل مسیح یونان پر ایرانیوں کی یورش مغرب پر مشرق کی یلغار کے مترادف تھی اور اس کا ردعمل وہ حملہ ہے جو سکندر نے ایران پر کیا تھا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان نزاعات کا مشرق و مغرب سے کوئی علاقہ ہے یا یہ ایسے فاتحانہ اقدامات ہیں جو صرف چند افراد نے محض اس نیت دارادہ سے کئے تھے کہ پوری دنیا ان کے زیر اقتدار آجائے میرے خیال میں یہ نظریہ کہ مشرق مغرب سے اور مغرب مشرق سے برسرپیکار رہا ہے۔ ایک واہمہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جب تک ہم تاریخ جغرافیہ کی قدریں نہیں بدلیں گے انسان کے ذہنی میلانات میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ میں جانتا ہوں کہ تاریخ و جغرافیہ کی تعلیم میں تغیرات کے بعد بھی بہت سے مواقع پیش آئیں گے غالباً سب سے بڑی رکاوٹ جو پیش آسکتی ہے وہ ہے قومیت کا محدود دائرہ۔ یہ بات بڑی عجیب و غریب ہے کہ وہ قومیت جو استبداد و ملوکیت کے خلاف ایک محاذ کی حیثیت رکھتی تھی آج خود اس پر جارحیت کا خول چڑھ چکا ہے۔ انیسویں صدی میں جو قومیت، حریت اور حریت پسندی کا ایک مضبوط قلعہ تھی۔ آج انسانی ترقی کی راہوں میں روڑے اٹکا رہی ہے اس کے اثرات اتنے قوی ہیں کہ ہم عالمی اتحاد پر کامل یقین و اعتماد کے باوجود جب تک ہم قومیت کی قیود سے آزاد اور اس کی سطح سے بلند و بالا نہیں ہوں گے۔ انسان کا مستقبل تاریک رہے گا۔

مجھے خوشی ہے کہ یونیسکو نے تاریخ و جغرافیہ کی تعلیم میں اصلاحات کا بیڑا اٹھایا ہے یہ بات بھی باعث مسرت ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے ۔ درسگاہوں کا قیام عمل میں آیا ہے ۔ اور یونیسکو کا یہ عزم کہ بنی نوع انسان کی ایک ایسی تاریخ ترتیب دی جائے ۔ جس میں عالمی وحدت پر زور ڈالا گیا ہو لائق صد تحسین ہے ۔

مجھے امید ہے کہ یونیسکو کے عزائم تشنۂ تکمیل نہیں رہیں گے ۔ میں آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ ہم سب آپ کے ساتھ ہر ممکن تعاون کریں گے ۔ ہم آپ کا (ڈاکٹر بودٹ) نہ صرف یونیسکو کے مہتمم عمومی کی حیثیت سے بلکہ ان خدمات کی بنا پر خیر مقدم کرتے ہیں جو آپ نے اس منصب پر فائز ہونے کے بعد سر انجام دی ہیں ۔ قیام امن و سلامتی کے سلسلے میں آپ کی مساعی لائق صد تحسین ہیں ۔ میکسیکو میں آپ نے بسلسلہ تعلیم بالغاں جو کام کیا ہے اس پر آپ کو دنیا کے نکتہ سنج ناقدین نے بھی خراج تحسین ادا کیا ہے ۔ ؛

∴ ∴ ∴

"یونیسکو کے نصب العین" کے موضوع پر جولائی ۱۹۵۱ء میں بمقام پیرس مولانا ابوالکلام آزاد نے یونیسکو کے ایک مہتم بالشان اجلاس میں ایک بصیرت افروز تقریر کی۔

یونیسکو کا نصب العین

اگرچہ پہلا موقعہ ہے کہ میں نے یونیسکو کے اجلاس میں بذات خود شرکت کی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے اس بین الاقوامی ادارہ کے مداوات سے ہمیشہ گہری دلچسپی لی ہے بات یہ ہے کہ میں ان تشویشناک حالات میں جو انسانیت کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ یونیسکو کی صلح پر ور اور امید افزا مساعی کو نیا غنیمت سمجھتا ہوں۔ گزشتہ صدی کے دوران نسل انسانی نے علمی اور مادی نقطہ نظر سے کافی ترقی کی ہے۔ البتہ اخلاقی اور سیاسی حیثیت سے ترقی کی راہ پر ابھی ناسپرد ہے ان مادی ترقیات نے جو اضافہ علم و فن کا نتیجہ ہیں راحت و آسائش کا سامان ضرور بہم پہونچایا ہے اور یہ ضرور ہوا ہے کہ ان کی بدولت ہم امراض و حوائج پر قابو پا سکے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان ترقیات نے نسل انسانی کے ہاتھوں میں ایسے ہتھیار دے دیئے ہیں جو انسانیت کے شجر بار دار کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکتے ہیں یہ تباہ کن قوت اتنا زور پکڑ گئی ہے کہ اگر دنیا نے انسانیت کی بنیادوں پر سر جوڑ کر اس کے اثرات اور اس کے ازالہ کے ذرائع پر غور نہ کیا تو پھر کوئی طاقت تباہی سے نہیں روک سکتی۔ ضرورت اس چیز کی ہے کہ ہم تعلیم کی طرح نو ڈالیں

نیز نفسیاتی وحدت اور مشترکہ شہریت کے خوابیدہ احساسات کو بیدار کرنے کیلئے وہ تمام ذرائع استعمال کریں جو ہمارے دائرہ امکان میں ہیں۔ موجودہ سائنس کی ترقی کے لئے جغرافیائی وحدت جتنی اہم ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اہمیت نفسیاتی وحدت کو دی جاسکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۴۹ء میں ہندوستان نے یونیسکو کے ساتھ تعاون و تفاعل کا عہد کیا تھا تو میں نے یونیسکو کے نصب العین کی اہمیت پر زور دیا تھا۔ میں نے کسی قدر تاسف کے ساتھ یہ گزارش کی تھی کہ انجمن اقوام متحدہ نے جس کے قیام کا واحد مقصد امن و سلامتی کا قیام تھا۔ دنیا کو دو متحارب گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس نے تھوڑا بہت کام بھی کیا ہے۔ لیکن نہ کرنے کے برابر۔ ہمیں تو یہ نظر آتا ہے کہ اقوام متحدہ کی انجمن ایک ایسا میدان جنگ ہے جس میں دو بڑی طاقتیں یا دو طاقت ور بلاک ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔ باقی دوسری اقوام اس میدان میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ راہ فرار ڈھونڈھ رہی ہیں۔ یہ منظر کسی ایسے شخص کے لئے کچھ زیادہ اُمید افزا نہیں ہے جو مختلف اقوام کے مابین صلح و آشتی اور امن و سلامتی کی خوشگوار فضا پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ان حالات میں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں کچھ یونیسکو ہی سے امیدیں ہوسکتی ہیں اور وہ اس لئے کہ اس ادارہ کا مقصد یہ ہے کہ تعلیم، سائنس اور ثقافت کو فروغ اور پھر ان کی وساطت سے ان عناصر کو دعوت اتحاد دے جو ایک دوسرے سے سیاسی اختلافات رکھتے ہیں اگر یونیسکو ثقافتی بنیاد پر اپنے مقاصد کی تکمیل کے ساتھ ساتھ مختلف الخیال اقوام میں مفاہمت کی راہیں ہموار کرنے میں کامیاب ہوگئی تو مجھے امید ہے کہ یہ ثقافتی مفاہمت، اقتصادی اور سیاسی شعبوں پر بھی اپنا پرتوں ڈالے گی۔ اور پھر اس وہ خوش آئند نتائج برآمد

ہوں گے کہ لطف آجائے گا۔

گزشتہ دو سال سے میرے تاثرات یہ ہیں کہ یونیسکو سے مجھے کچھ توقعات ہیں اور اقوام متحدہ سے چند در چند خطرات، ان تاثرات میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور اس دوران میں سیاسی صورت حال بد سے بدتر ہو گئی ہے۔ اور انجمن اقوام متحدہ جسے امن و سلامتی کے قیام کا وسیلہ ثابت ہونا چاہئے تھا۔ ایک ایسا میدان بن گئی ہے جہاں بڑی طاقتیں اپنے نزاعی مقاصد کی تکمیل کے لیے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا رہی ہیں۔ اگر کچھ تھوڑی سی بہت امید وابستہ کی جا سکتی ہے تو صرف یونیسکو سے وابستہ کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسانیت کا تحفظ اور اس کی بقا کا دارومدار صرف ذہنی مفاہمت اور باہمی ہمدردی پر ہے اگر یہ احساسات مردہ رہتے ہیں تو پھر تباہی و بربادی کے غار کا منہ کھلا رہتا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ہمیں اس میں دھکیل نہ دیا جائے۔

یہ سچ ہے کہ یونیسکو کی عمر ابھی صرف چھ سال کی ہے۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ اس مختصر سی مدت میں اس نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ انسانیت کے مستقبل کی تعمیر اور اس کی بقا کے لیے بہت کچھ اہمیت رکھتے ہیں۔ اس دور کی بوقلمونی نے ہمارے سیاسی اور ذہنی رجحانات کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ اگر حالات کی اس تباہ کن رفتار پر گرفت نہ کی گئی تو مستقبل میں یہ رفتار تمام نسل انسانی کو تہس نہس کر کے رکھ دے گی۔ ہمیں چاہئے کہ ہم یونیسکو کی اس کارکردگی کا جائزہ لیں جو اس بحرانی دور میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں اس کی گذشتہ کارفرمائیوں پر بھی ایک گہری نظر ڈالنی ہو گی تاکہ مستقبل قریب میں پورے وثوق اور کامل اعتماد کے ساتھ ہم کسی راہ عمل کا تعین کر سکیں۔

یونیسکو کا نصب العین یہ ہے کہ تعلیم، سائنس اور ثقافت کی بنیادوں پر

اقوام عالم فقر اتحاد کی دیوار ریں اٹھایئں ۔ یونیسکو نے اپنے قیام کی ابتدا سے سالانہ قرار دادیں منظور کی ہیں ۔ اور اس مقصد کے حصول کی خاطر بہت سے بہت پروگرام طے کئے ہیں ۔ یونیسکو کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انسان کے بنیادی حقوق کا ایک نیا اور عالم گیر اعلان ترتیب دیا جسے اقوام متحدہ نے اپنا لیا ہے غیر ترقی یافتہ ممالک کی فنی امداد جنگ سے تباہ شدہ ممالک میں تعلیمی اور ثقافتی سہولتوں کی بحالی، مختلف اقوام کے مابین اشخاص اور افکار کے تبادلہ کا جہاں تک تعلق ہے یونیسکو نے حیرت انگیز ترقی کی ہے ۔ سب سے زیادہ اہمیت اس منصوبہ کو مل رہی ہے جو یونیسکو نے دنیا کے وسیع و عریض رقبوں میں بنیادی تعلیم کی عمومی اشاعت کے لئے تیار کیا ہے ۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ ایسے رقبے ہیں جہاں کے باشندوں کو تعلیم کی کافی سہولتیں میسر نہیں ہیں ہماری تہذیب کے دامن پر یہ ایک بدنما داغ ہے ۔ کہ دنیا کی بالغ آبادی کا قریب قریب ۲/۳ ہنوز تعلیم سے بے بہرہ ہے ۔

ناخواندگی اور جہالت کی بدولت انسانی حقوق سے متعلق ہمارے مزعومات کی نفی ہوتی ہے صرف یہی نہیں بلکہ عالمگیر جمہوریت امن اور ترقی کے تمام منصوبے خاک میں مل جاتے ہیں ۔ میں یونیسکو کی بین الاقوامی بارگاہ میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتا ہوں کہ اس کے مقتدر اراکین پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی ہے کہ عالمی امن کے قیام و دوام کا دار و مدار صرف ان بدنصیب عوام کی تعلیم و تربیت پر ہے ۔ جو دنیا کے غیر ترقی یافتہ رقبات میں رہتے بستے ہیں ۔

صدر محترم اور مہتمم اعلیٰ! یونیسکو کے لائحہ عمل کی معقولیت میں کسی کو بھی کلام نہیں ۔ لیکن مجھے یقین کامل ہے کہ آپ اس بارے میں مجھ سے اتفاق رائے کریں گے کہ جب تک جنگ اور اس کی تباہ کاریاں انسان کی تخلیقی قوتوں کا خون چوستی رہیں گی ۔ یونیسکو اپنے نصب العین میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا ۔

جب تک یہ ہولناکیاں ختم نہ ہوں گی۔ اور جب تک حالات خوشگوار رخ اختیار نہیں کریں گے تعلیم، سائنس اور ثقافت کو فروغ دینے کے سلسلے میں ہماری جتنی کوششیں بھی ہیں بازیچۂ اطفال سے زیادہ وقیع نہیں قرار دی جائیں گی، اگر ہمارا نصب العین یہ ہے کہ ہم دنیا کو تباہ کاریوں اور ہلاکت آفرینیوں کی زد سے بچائیں۔ تو بین الاقوامی معاشرہ کے ذہین و فطین دماغ کو قطعیت کے ساتھ یہ فیصلہ کرنا ہوگا۔ کہ یونیسکو جنگ کے خطرات سے بچنے کے لیے کیا قدم اٹھائے؟ یونیسکو کی جانب سے یہ عذر کافی نہ ہوگا کہ امن و جنگ کے مسائل چونکہ سیاسی ہیں اس لئے اسے ان سے کوئی سروکار نہیں ہے اور اس کا مقصد خالصتًا تعلیم، سائنس، اور ثقافت کی ترقی اور اس کا فروغ ہے۔ اگر انسانیت کا وجود ہی معرض خطر میں پڑ جائے۔ تو پھر تعلیم، سائنس اور ثقافت کا فائدہ؟ یونیسکو نے اپنے دستور میں اس حقیقت کا اعتراف کر کے کہ جنگ و جدل کا خمیر مایۂ اوّل ذہن انسانی میں پیدا ہوتا ہے اس لئے امن و سلامتی اور صلح و آشتی کے قلعے کی بنیادیں دل و دماغ کی گہرائیوں میں رکھی جائیں۔ قیام امن کی پوری پوری ذمہ داریاں قبول کرلی ہیں۔

یونیسکو اگر آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق کچھ غور و فکر کرتی ہے تو ہم اسے حق بجانب سمجھتے اور اس کے خیال کی پُر زور تائید کرتے ہیں۔ لیکن جب تک ہم ان خطرات کے ازالے کا بیڑا نہیں اٹھائیں گے جو ہمیں ہر چہار طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ آئندہ نسلیں کبھی یونیسکو کی سرگرمیوں سے مستفید نہ ہوسکیں گی۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ یونیسکو اپنے عمل سے یہ ثابت کرے کہ اس کے دائرہ اثر و نفوذ میں وہ سیاسی اختلافات راہ نہیں پاسکتے جو مجلس اقوام متحدہ کا طرۂ امتیاز ہیں اور اس کی سرپرستی میں ایسی خوشگوار فضا پیدا ہوگی جہاں ہم

شور اور خیر اندیشی کا دور دورہ ہوگا۔ یونیسکو کے اجلاس میں ہمیں یہ طے کرنا ہوگا۔ کہ وہ سیاسی قیود جو اقوام متحدہ کی عملی سرگرمیوں کی چولیں ڈھیلی کئے ہوئے ہیں کہیں یونیسکو کو تو اپنی لپیٹ میں نہیں لے لیں گی۔ بدقسمتی سے اقوام متحدہ کو سیاسی بنیادوں پر اقوام کے مابین صلح و آشتی کی فضا پیدا کرنے میں کامیابی نہیں ہوسکی ہے لیکن کیا ہمیں اپنی کوششوں سے یہ واضح نہیں کر دینا چاہیئے کہ جو مہم مجلس اقوام متحدہ سر نہیں کر سکی ہے وہ یونیسکو تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی حیثیت و اعتبار سے بسہولت تمام سر کر سکتی ہے۔ سیاسی نقطۂ نظر سے خواہ کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں یونیسکو کو چاہیئے کہ وہ اپنے دروازے کسی ملک پر بند نہ کرے۔ اس ادارے کو چاہیئے کہ ترقی کے میدان میں قدم تیزی کے ساتھ اٹھائے اور جو راہیں اسے مسدود دکھائی دیتی ہیں۔ انہیں ہموار کرے۔ یونیسکو کو اس انتظار میں نہیں رہنا چاہیئے کہ کوئی ملک اس کی رکنیت کے لئے درخواست گزارے اسے یہ چاہیئے کہ خود تمام ممالک کو گرم جوشی اور خوش دلی کے ساتھ اپنے ادارے میں دعوت شمولیت دے۔

یہ عام انسانی تجربہ ہے کہ دوستی کے بطن سے دوستی اور بے اعتمادی کے بطن سے بے اعتمادی جنم لیتی ہے۔ اگر یونیسکو سیاسی اختلافات سے قطع نظر تمام ممالک کے ساتھ فراخ حوصلگی سے تعاون کرتا ہے تو ایک ایسا ماحول پیدا ہوسکتا ہے۔ کہ مختلف اقوام ایک دوسرے کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ سکیں۔ اور اتفاق و اتحاد کے ساتھ باہمی شکوک و شبہات، عدم اعتماد اور انتشار کے جراثیم کا قلع قمع کر سکیں۔

صدر محترم! یونیسکو نے انسان کے بنیادی حقوق کا ایک نیا عالمگیر اعلان مرتب کیا ہے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ تنہا اعلان مرتب کیا ہے۔ لیکن بس یہ

سمجھتا ہوں کہ تنہا اعلان کی کوئی حیثیت نہیں۔ میرا خیال ہی نہیں۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ آپ اس سلسلہ میں مجھ سے کامل اتفاق کریں گے۔ کہ محض اعلان کی رسمی حیثیت سے نتائج اخذ نہیں کئے جاسکتے۔ غیر مبہم الفاظ میں مجھے یہ کہہ دینا چاہئے کہ میرے ملک اور میری قوم کے افراد یونیسکو سے بہی تو قعات اور اس کے بارے میں یہی احساسات رکھتے ہیں جن کا میں نے سطور بالا میں اظہار کیا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ تمام مشرقی ممالک کا یہی خیال اور یہی احساس ہے۔

مساوات انسانی کے نظریاتی اعتراف کے باوجود ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مغرب میں ایک گروہ ایسا بھی آباد ہے جو نسلی اور لونی اختلافات کے چکر میں پھنسا ہوا ہے۔ اور تعصب کا بھوت بری طرح اس کے سر پر سوار ہے۔ مشرق انسانی مساوات کے سلسلے میں جو اصول وضع کئے گئے ہیں ان کا تہہ دل سے خیر مقام کرتا ہے۔ لیکن کم سے کم اسے یہ علم ضرور ہونا چاہئے کہ اس نصب العین پر یونیسکو کے عمل درآمد کی کیا نوعیت ہے۔ اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے اس نے کون سی راہ عمل کا تعین کیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یونیسکو کے مہتم اعلیٰ نے یہ اُمید ظاہر کی ہے کہ بنیادی تعلیم کے طفیل ایک نہ ایک دن وہ تمام امور پایۂ تکمیل کو پہونچ جائیں گے جو فی الحال زیر بحث ہیں۔ مشرق کے باشندے اس طویل المیعاد پروگرام کے مخالف نہیں ہیں لیکن جو سوال ان کے ذہن کی سطح پر بار بار ابھر کر آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مستقبل قریب میں یونیسکو اپنے لائحۂ عمل پر کس طرح عمل پیرا ہونا چاہتا ہے۔

گذشتہ نصف صدی یا اس سے کم وبیش عرصہ میں ایشیا جن تغیرات کے مراحل سے گزرا ہے یونیسکو کو چاہئے کہ وہ دنیا کو اس کے اسباب وعلل سے آگاہ کرے یہ کام اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔ بہت کافی عرصے کی گہری نیند کا طلسم ٹوٹ

چکا ہے۔ ایشیا میں بیداری کے آثار پیدا ہو چکے ہیں اس کی بیداری کے معنی یہ ہیں کہ مشرق نے خواب گراں کا لبادہ اتار پھینکا ہے۔ کم و بیش دو صدی تک فکر و نظر اور ترقی و بیشیا رونت کی قیادت کا سہرا یورپ کے سر رہا ہے اور قدرتی طور پر یورپی اقوام نے اس عرصے میں اپنے آپ کو پوری نسل انسانی کا اجارہ دار سمجھا ہے۔ آج ایشیا کی آنکھیں کھل گئی ہیں اور اس پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ یورپ کے دور عروج سے صالہا سال بیشتر اس نے (ایشیا نے) نسل انسانی کو امن و سلامتی کے بحوصلہ پرور پیغامات دیئے تھے۔ آج ایشیا کی نگاہوں کے سامنے اس کی گزشتہ روایات کا دفتر کھلا ہوا ہے اسے ہرگز گوارا نہیں کہ کرۂ ارض کے کسی گوشے سے یہ آواز اٹھے کہ فلاں فلاں ملک کو سرپرستی یا قیادت کے ترجیحی اختیارات حاصل ہیں یا فلاں ملک ہر اعتبار سے اور ہر لحاظ سے افضل و اعلیٰ ہے جب تک یونیسکو اس ذہنی انقلاب کا حسی جائزہ نہیں لے گا۔ اور اس کایا پلٹ کے اسباب پر غور و خوض کی اعلیٰ اقداختیں صرف نہیں ہوں گی۔ ایشیا اور افریقہ میں اس ادارہ کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکتی جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے بس یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یونیسکو ابھی مشرق کی بیداری کا قرار واقعی اندازہ نہیں کر سکا ہے اس سلسلہ میں دو نظیریں پیش کروں گا۔ انسانی حقوق سے متعلق یونیسکو نے جس تالیف کے اہتمام کا ذکر کیا تھا اس میں اس نے زیادہ اہمیت مغربی ممالک اور اہل مغرب کے کمالات کو دی تھی گیا کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ مشرق نے انسانیت مساوات اور حریت سے متعلق جو نظریات پیش کئے ہیں۔ ان میں کچھ کم جامعیت نہیں ہے۔ نزدیک کی بات ہے کہ یونیسکو کی ہیئت ترکیبی میں ایشیا اور افریقہ کو وہ مقام نہیں دیا گیا ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔ اس کے انتظامیہ میں ان ممالک کے باشندوں کو دس فی صدی عہدے بھی نہیں دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایشیا اور

افریقہ کی آبادی دنیا کی مجموعی آبادی کا ۲/۳ حصہ ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو یہ سوچتے ہیں کہ تعین مناصب یا عہدوں کا تقرر نسلی، لونی اور قومی اعتبارات سے ہونا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ فرض ناشناسی ہوگی اگر میں یہ نہ کہوں کہ یونیسکو کے ادارے میں جو کلیدی مناصب ہیں ان سے ایشیائی اور افریقی بندے محروم رکھے گئے ہیں۔ یونیسکو کے اس امتیازی سلوک سے مشرقی باشندوں کے ذہن میں یہ احساس کروٹیں لے رہا ہے کہ یونیسکو اہلیت و استحقاق کے باوجود ان کے مطالبات کو پس پشت ڈال رہا ہے۔

میں اب کسی قدر اختصار کے ساتھ پیش کردہ پروگرام کے چند اہم پہلوؤں سے متعلق کچھ معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں میں اس چیز پر پہلے ہی روشنی ڈال چکا ہوں کہ ہم فنی امداد کے پروگرام کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن میں اس سلسلہ میں یونیسکو پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ پروگرام ارباب جود و نوال کی خواہشات کے مطابق نہیں بلکہ اصحاب اخذ و قبول کی مرضی و منشا کے موافق مرتب ہونے چاہئیں یہ ملحوظ خاطر رہے کہ کسی ایک ملک کے حالات کسی دوسرے ملک کے حالات سے میل نہیں کھاتے۔ اور جو امداد کسی ایک ملک کے لئے مفید ہے یہ ضروری نہیں کہ کوئی دوسرا ملک بھی اس سے بہرہ یاب ہو سکے نوعیت امداد میں بھی فرق ضروری ہے۔ بعض ممالک نقدی امداد کے طالب ہیں تو بعض کسی دوسری نوعیت کی امداد چاہتے ہیں۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم ایک بار پھر ان اصولوں کا جائزہ لیں جن پر فنی امداد کے پروگرام کی اساس ہے۔ ہمیں مدارج ارتقاء کے پیش نظر ان اصولوں پر نظر ثانی کرنی ہوگی، تاکہ ہر ملک کے مطالبات خوش اسلوبی کے ساتھ پورے ہو سکیں۔

میں یونیسکو کے اس اقدام اور اس تحریک پر اسے مبارکباد پیش کرتا

ہوں کہ اس نے تاریخ و جغرافیہ کی تعلیمات پر نظر ثانی اور اس میں ترمیم کا فیصلہ کر لیا ہے۔ گزشتہ بیس سال سے میں یہ سوچتا رہا ہوں کہ جب تک ہم تاریخ و جغرافیہ کی تعلیمی قدریں نہیں تبدیل کریں گے۔ دنیا میں عالمی امن کے قیام کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ آج کل اسکولوں اور کالجوں میں تاریخ و جغرافیہ کی تعلیم کا جو انداز ہے۔ اس سے اختلافات و نزاعات میں اضافہ ہوتا ہے۔ تاریخ بالعموم قومی مفاخر کی داستان ہے۔ اور کہیں کہیں اس میں کسی قوم کے حالات بڑھا چڑھا کر بیان کئے جاتے ہیں۔ رہا جغرافیہ کا معاملہ، اس میں عالمی وحدت کی بنیادیں استوار نہیں ہوتیں بلکہ اس کے برعکس اختلافات و نزاعات کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں۔ ہم صرف ملکی حد بندیوں پر قناعت نہیں کرتے بلکہ اپنی جانب سے کچھ اور حدود قائم کر دیتے ہیں۔ ہر ملک نقشہ میں جہاں کہیں دکھایا گیا ہے۔ اس پر نیا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بچپن ہی میں ہمارے بچوں کے ذہن میں اختلافات کا بیج پڑ جاتا ہے۔ جب تک بچوں کی تعلیم و تربیت کا انداز نہیں بدلے گا۔ اور ان کے ذہن میں یہ بات نہیں بٹھائی جائے گی کہ وہ عالمی وحدت اور آفاقی شہریت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم بین الاقوامی سطح پر مفاہمت کی خوشگوار اور خوش آئند فضا کیسے پیدا کر سکتے ہیں مجھے خوشی ہے کہ یونیسکو نہ صرف ایک ایسی تاریخ تہذیب و تمدن کی تربیت کا بیڑا اٹھا رہا ہے جس کا مرکز وحدت انسانی کا تخیل ہو گا بلکہ اس کے پیش نظر تاریخ و جغرافیہ کی تعلیمات پر نظر ثانی کا مسئلہ بھی ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پیشتر ایک پہلو اور ہے جس پر میں کچھ روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ میں یونیسکو کے ان عزائم کو بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتا ہوں کہ وہ اپنا دائرہ عمل اور زیادہ وسیع کرنا چاہتا ہے مجھے ان رکن ممالک

سے بھی پوری ہمدردی ہے جو یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے مسائل پر بھی خصوصیت کے ساتھ توجہ صرف کی جائے۔ بہرحال ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ آیا ان کثیر التعداد منصوبوں سے بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں جن کی پورے طور پر تکمیل نہیں ہو سکتی یا ایک بنیادی پروگرام پر تندہی اور مستعدی کے ساتھ عمل درآمد سے مجھے معلوم ہے کہ یونیسکو کے مہتمم اعلیٰ کا خیال بھی یہی ہے کہ منصوبوں میں حتی الامکان تخفیف کی جائے۔ چنانچہ وہ اس سلسلے میں پوری دیانت داری کے ساتھ کوشاں ہیں میں خصوصیت کے ساتھ اس چیز پر زور دوں گا کہ ہمیں اپنی اجتماعی قوت اور نفری طاقت ایسی اسکیموں کی بھینٹ پر چڑھا کر نہ رہ جائیں۔ جو کسی قیمت پر بھی اساسی حیثیت نہیں رکھتیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے اس بارے میں اتفاق کریں گے کہ ہر سال کاغذات، دستاویزات، اجلاسات وغیرہ کا جو طوفان برپا رہتا ہے ہم چاہیں تو اس پر قابو پا سکتے ہیں یا اس کا رخ کسی مفید مقصد کی جانب موڑا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کانفرنس سے متعلق جو کاغذات میرے پاس پہونچے ہیں وہ اتنے ہیں کہ میں ان کا مطالعہ بھی نہیں کر سکا غالباً دوسروں کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا ہوگا۔ ::

جون ۱۹۵۳ء میں مولانا آزاد نے برطانوی کوہ پیما مہم اور اس کے جلیل القدر کارنامے سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

کوہ پیما مہم کی رُوداد

کتنے عظیم الحوصلہ اور اولو العزم ہیں وہ اشخاص جنھوں نے اپنے دور کی ایک عظیم الشان مہم سر کی ہے مجھے انتہائی مسرت ہے کہ یہ اشخاص اپنے بلند عزائم میں کامیاب ہوئے جب میں یہ سوچتا ہوں کہ پوری دنیا نے اس تسخیر پر بہجت و سرور کا اظہار کیا ہے تو میرے دل کا پیمانہ بادہ فرحت سے لبریز ہو جاتا ہے برطانوی کوہ پیما مہم کے وہ افراد جنھوں نے کوہ ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی پر قدم جمائے ہیں آج ہمارے درمیان رونق افروز ہیں۔ مجھے آپ کو ان سے متعارف کرانے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔

ہم میں سے ہر شخص کو اس مہم کی دشواریوں کا علم ہے یوں تو بلند حوصلہ انسانوں نے اکثر میدانوں میں مظاہر قدرت کا چیلنج قبول کیا ہے لیکن جس چیلنج کا مقابلہ ان احباب نے ٢٩ ہزار دو سو فٹ کی بلندی پر کیا اس کی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی۔ دوسرے میدانوں میں انسان کی کوششوں کو سائنسی آلات کا سہارا ملا ہے اور کبھی کبھی اس کی اپنی خوش تدبیری بھی اس کے کام آئی۔ ان سائنسی آلات نے بارہا اس کی سرگرمیوں کی قسمت کا فیصلہ کیا لیکن جو مہم ان احباب نے سر کی ہے اس میں خوش تدبیری اور میکانکی امداد کو اگر کچھ دخل رہا ہے، تو نہایت ہی محدود پیمانہ پر۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان آلات کے سہارے آغاز کار میں بعض موانع پر قابو پا لیا گیا لیکن جو سخت ترین دشواریاں بعد میں پیش آئیں وہ ان آلات کے ذریعہ گرفت میں نہیں آسکیں۔ ہم میں سے کون سا

ایسا ہے جو ان دشواریوں کی نوعیت سے آگاہ نہیں ہے، انتہائی بلندیوں پر جو فضائی ماحول پایا جاتا ہے وہ انسانی اعضاء و جوارح کی قوت عمل سلب کر لیتا ہے۔ یہاں قدرت کے مظاہر اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ برد آزما رہتے ہیں۔ عناصر اس بے رحمی سے پیش آتے ہیں کہ پناہ بخدا! جسم و دماغ ۲۹ ہزار فٹ نشیبی سطح پر جن فضائی کوائف کے خوگر ہوتے ہیں بلندیوں پر جب ان کا الٹ پاتے ہیں تو ان کی اثر پذیر صلاحتیں جواب دے جاتی ہیں۔ اس فضائی کش مکش میں سائنسی آلات کام نہیں دیتے ان مواقع پر صرف ناقابل تسخیر قوت ارادی کسی انسان کی کامیابی کا باعث ہوتی ہے۔

۱۹۲۱ء سے ۱۹۵۲ء تک بہادر اور دلیر اشخاص نے اس مہم کو سر کرنے کے لئے گیارہ بار کوششیں کیں لیکن ہر بار انہیں زبردست طاقتوں کے مقابلہ میں پسپا ہونا پڑا۔ آخر کار وہ وقت آیا۔ جب اس عظیم الشان جدوجہد یا عنصری جنگ کے نتیجے کا فیصلہ کچھ انسانوں کی بلند حوصلگی کے حق میں ہوا۔ یہ برطانوی کوہ پیما مہم جس کے بخت آزما افراد کا ہم خیر مقدم کر رہے ہیں اس میدان میں فتح و نصرت کا پرچم نصب کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ قدیم رومی فاتح کی طرح یہ افراد بھی کہہ سکتے ہیں

"ہم آئے۔ ہم نے دیکھا۔ ہم جیت میں رہے۔"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس فتح عظیم کا سہرا اراکین مہم کی اجتماعی قوت کے سر ہے یا پھر اس سلسلہ میں اس مہم کی دانشمندانہ قیادت کو خراج عقیدت ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس مہم کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ کوئی ایک، دو یا تین افراد خواہ وہ کتنے ہی بلند حوصلے کیوں نہ ہوتے اس مہم پر قابو نہ پا سکتے۔ یہ کارنامہ جو برطانوی مہم نے سرانجام دیا ہے کسی منظم جماعت کی اجتماعی قوت ہی کے بل بوتے پر پایۂ تکمیل کو پہونچ سکتا تھا۔ لہذا یہ ضروری تھا کہ اس مہم کے ہر رکن کے انتخاب میں احتیاط برتی جائے اور تقسیم کار کے اصول پر اس کی نوعیت عمل کا تعین بھی ہو۔ جملہ اراکین کے دل

دماغ میں اجتماعی کارکردگی کا احساس پیدا کیا جائے ۔ اور انہیں یہ تعلیم دی جائے کہ وہ نہایت بے لوثی کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور وہ بھی ضبط و انضباط کے ساتھ ، اگر خوش قسمتی سے اس مہم کی قیادت قابل اور مخلص فرد کے ہاتھوں میں نہ ہوتی تو حالات کبھی سازگار نہ ہوتے ۔ معلوم ہوتا ہے ۔ کہ سابقہ مہمات کے تجربات سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے اور جو اہم ضروریات اس سلسلہ میں پیش آسکتی تھیں ان کا خاکہ پہلے ہی تیار کرلیا گیا تھا ۔ ہر ایک ضرورت کا حفظ ماتقدم کے طور پر لحاظ رکھا گیا ۔ اور اس راہ میں جو دشواریاں پیش آسکتی تھیں ان کی روک تھام کے لئے بہت کچھ بند و بست کیا گیا ۔ تجربہ نے ثابت کر دیا ۔ کہ جو کچھ بھی انتظامات کئے گئے ان کی کتنی اہمیت تھی ۔

ایورسٹ کی چڑھائی میں جو اہم مسئلہ پیش آتا ہے وہ یہ ہے کہ راستے میں کتنے کیمپ نصب ہونے چاہئیں اور آخری کیمپ کتنی بلندی پر ہونا چاہیئے ۔ اس مہم سے پہلے بلند ترین کیمپ ۲۵ ہزار فٹ کی بلندی پر قائم ہو چکا ہے ۔ چڑھائی کا آخری درجہ تقریباً چار ہزار فٹ تھا ۔ پناہ گزینی کے لئے راستہ میں کوئی کیمپ نہ تھا ۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ یہ آخری درجہ انتہائی صعوبت ناک تھا اگر موسم نازک ترین صورت اختیار کر لیتا ، یا فضا ، توقع کے خلاف تاریک ہو جاتی ۔ تو کوہ پیماؤں کو آس پاس کوئی جائے پناہ نہ ملتی اور وہ ناخوشگوار موسم کے رحم و کرم پر ہوتے ان میں سے بہت سے شدید طوفان میں گم جاتے اور انہیں برف بھری ہوئی غاروں میں راتیں بسر کرنی پڑتیں ، اپنے پیش رو حضرات کی مایوس کن ناکامیوں سے اس مہم کے کارپردازوں کی آنکھیں کھلیں ۔ اس مہم نے یہ فیصلہ کیا کہ دامن کوہ سے لے کر پہاڑ

رکی چوٹی تک زیادہ سے زیادہ تعداد میں کیمپ بنیں۔ اس قسم کے کیمپ آٹھ بنے، جن میں سے آخری ۲۷ ہزار ۹ سو فٹ کی بلندی پر تھا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ آخری درجہ جو سابق میں چار ہزار فٹ تھا اب تخفیف کے بعد گیارہ سو فٹ رہ گیا۔ آخری چڑھائی جو پہلے چار ہزار فٹ تھی اب صرف گیارہ سو فٹ تک آکے رہ گئی۔ اس دانشمندانہ انتظام سے جو خطرات درپیش تھے۔ مطلقاً رفع ہو گئے۔ اگر یہ ظاہر ہے کہ ستائیس ہزار نو سو فٹ کی بلندی پر کیمپ نصب کرنا کوئی سہل کام نہ تھا۔ پھر بھی ضبط و انضباط کے حیرت انگیز احساس اور افراد مہم کی اجتماعی کوشش نے راستہ کی تمام مشکلات کا خاتمہ کر دیا۔

۲۸۔ مئی کی شام کو سر ایڈمنڈ ہلیری اور شری تن سنگھ آخری کیمپ تک پہنچے۔ اور وہاں شب بسر کی۔ اگلے دن صبح سویرے وہ پھر سرگرم سفر ہو گئے۔ ہمت دانشمندی اور استقلال کی بدولت ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے دنیا کی سب سے اونچی چوٹی نے ان کے قدم چومے۔

آپ مجھ سے اس بارے میں اتفاق کریں گے کہ اس شجاعانہ کارنامے پر ہمیں اس مہم کے ہر رکن کو ہدیہ مبارکباد پیش کرنا چاہئے۔ یہ اراکین مہم کی اجتماعی کوشش کا صدقہ تھا کہ ہر وہ چیز جو اب تک ناممکن نظر آئی تھی۔ حد امکان میں آگئی خصوصیت کے ساتھ ہم سر جان ہنٹ کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کی اعلیٰ قیادت میں یہ مہم سر ہوئی۔ شری تن سنگھ اور ایڈمنڈ ہلیری بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کیونکہ یہ وہی ہیں جن کی بہادری کے بل بوتے پر اس مہم میں کامیابی نصیب ہوئی ان اشخاص کی فراخ حوصلگی اور عالی ہمتی قابل قدر ہے۔

دنیا کی بلند ترین چوٹی کی فتح و تسخیر کی داستان ختم ہو گئی۔ اگر ہم تاریخ کی اوراق گردانی کریں تو ہم یہ دیکھیں گے۔ کہ آج سے دو سو سال قبل اس داستان

کا آغاز ہوا تھا۔ ہمالیہ کے سلسلے میں کوہ پیمائی کا ابتدائی ریکارڈ اٹھارویں صدی کا ہے ۱۷۱۱ء میں بعض یسوعی پاپایانِ فرانس نے چین کے لاماؤں کی ایک جماعت مرتب کی تاکہ وہ تبت میں کوہ پیمائی کی مہم کا آغاز کریں اس سلسلہ کے جملہ انتظامات حکومت چین کی ہدایت کے تحت بروئے کار آئے ۱۷۱۷ء میں یسوعی پاپاؤں نے اس کوہ پیما خاکے کے بموجب تبت کا ایک نقشہ تیار کیا جس میں یہ دکھایا کہ پہاڑوں کا ایک سلسلہ جنوبی سرحد کے طول میں چالیس میل تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ پہلا نقشہ تھا جس میں ہمالیہ کی چوٹیوں کی تصویر کھینچی گئی۔ ۱۷۳۵ء میں مشہور فرانسیسی جغرافیہ دال ڈی اینول نے پیرس میں یہ نقشہ شائع کیا۔ اس طرح ہمالیہ کی چوٹیاں نقشہ میں آگئیں۔ لیکن ان کی بلندیوں تک رسائی حاصل نہ کی جاسکی۔ ۱۸۴۹ء میں ہندوستان کی ایک کوہ پیما جماعت نے ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی کی تعین کی اور نقشہ میں ایکس دی کے حروف سے اس کے محل وقوع کی نشاندہی کی ۱۸۵۲ء میں اس حقیقت کا پہلی بار انکشاف ہوا کہ غالباً دنیا کی بلند ترین چوٹی یہی ہے کوہ پیما جماعت کے ایک ہندوستانی فرد رادھا ناتھ سکدار پہلے پہل اس نتیجہ پر پہونچا لیکن اس وقت بھی چوٹی کی صحیح پیمائش نہیں کی جاسکی۔ یہ کام ۱۸۶۵ء میں پایۂ تکمیل کو پہونچا۔ جب کہ اس امر کا تعین ہوگیا کہ چوٹی ایکس دی ۱۹ ہزار دوسو فٹ کی بلندی پر ہے اور زمین پر سب سے بلند ترین چوٹی یہی ہے۔

یہ دریافت کرنے کی کوششیں عمل میں لائی گئیں کہ اس چوٹی کا مقامی متعارف نام کیا ہے؟ فرانسیسی یسوعین نے چینی لاموں کی اطلاعات کی بنیاد پر اس چوٹی کا نام مولنگطا رکھا بعض دستاویزی شہادتوں کی رو سے .... دیواودھنگا اور گوری شنکر اس کے نام تجویز پائے۔ لیکن تحقیق و تدقیق کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ تبتی نام کسی مخصوص چوٹی کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق تمام کوہستانی

سلسلے پر ہوتا ہے دیوادھنگا نام کی تائید میں بھی کوئی معتبر شہادت دستیاب نہیں ہوئی۔ یہ بھید بھی کھلا کہ گوری شنکر بلند ترین چوٹی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک دوسری چوٹی کا نام ہے جو پانچ سو فٹ نشیب میں واقع ہے چونکہ کوئی مستند اور متعارف نام نہیں مل سکا تھا۔ اسلئے ہندوستان کی کوہ پیمائی کے افسر اعلیٰ سر اینڈریو واکھ نے لندن کی رائل جیوگرافیکل سوسائٹی کی اجازت سے ایکس وی چوٹی کا نام "ماؤنٹ ایورسٹ" طے پایا اور یہ نام سابق افسر اعلیٰ سر جارج ایورسٹ کے نام پر رکھا گیا۔

۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۴ء کے مابین رائل جیوگرافیکل سوسائٹی اور الپائن کلب نے ایورسٹ پر چڑھائی کے لئے تین کوہ پیما مہمیں ترتیب دیں۔ ان مہمات کے نتیجے میں ماؤنٹ ایورسٹ کی شمالی ڈھلوانوں سے متعلق جغرافی اطلاعات جمع کی گئیں۔ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ۸ جون ۱۹۲۴ء کو مالوری اور اردن قریب قریب اس چوٹی تک پہنچ گئے تھے لیکن وہ وہاں سے زندہ واپس نہیں آسکے اس لئے کوئی مستند اطلاع نہیں مل سکی۔ مسٹر اوڈیل ستائیس ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچا تھا۔ جب کہ کرنل اور ڈاکٹر سومر ویل ۲۸ ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچ گئے تھے۔ اس طرح ماؤنٹ ایورسٹ کی صرف ایک ہزار فٹ کی بلندی عبور طلب تھی اس کا سہرا برطانوی مہم کے سر بندھا غرض دنیا کی بلند ترین چوٹی تک پہنچنے کی جس مہم کا آغاز ۱۷۰۱ء میں ہوا تھا اس کی تکمیل ۲۹ مئی ۱۹۵۳ء کو ہوئی۔

میری تجویز اور میری درخواست ہے کہ اس تقریب پر سر جان ہنٹ شری تن سنگھ نکے شرپہ اور سر ایڈمنڈ ہیری کو خاص اعزازی تمغے دئے جائیں اور اس ممتاز کے ہر رکن کو ایک چاندی کی ڈھال (شیلڈ) حوالے کی جائے تا کہ یہ تمغے اور ڈھالیں ان کی شاندار اور جلیل القدر کامیابی کی یاد تازہ رکھ سکیں۔

ساہتہ اکیڈمی کے پہلے اجلاس میں ۱۲ مارچ ۱۹۵۴ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے نئی دہلی میں ایک معرکتہ الآرا تقریر کی تھی، "ادب اور زندگی" اس تقریر کا موضوع ہے

ہم اس تقریر کے صرف انہی اجزا کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں جنکا موضوع سے قریبی علاقہ ہے۔ ہم نے آغاز وسط اور خاتمہ کے وہ تمام اجزا حذف کر دئیے ہیں۔ جن میں مولانا نے بھارتی حکومت کی تعلیمی پالیسی پر تبصرہ کیا ہے یا ایک وزیر تعلیم کی حیثیت سے کوئی مشورہ دیا ہے۔

ادب اور زندگی

اکادمی کی اصطلاح پر روشنی ڈالنے کے لیے ایک لمحہ کی فرصت چاہتا ہوں۔ کون نہیں جانتا کہ اس اصطلاح کا استعمال پہلے پہل اس مدرسہ کے لئے ہوا تھا جس کی داغ بیل افلاطون نے ڈالی تھی۔ وہ باغ جس کی حدود میں اس مدرسہ کا قیام عمل میں آیا تھا اس کا نام ایک قدیم تاریخ ساز شخصیت (HERO) کے نام پر اکیڈمس یا اقیدمس رکھا گیا تھا۔ اس نام کی عمارت سے مدرسہ کا عرفی نام "اکادمی" قرار پایا۔ اس نام کا مبداء و ماخذ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ہمیں اس سے بحث نہیں۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ امتداد زمانہ نے اس نام پر وحدت مفہوم کی ایک ایسی ابدی مہر ثبت کر دی ہے کہ اب کسی ایک لفظ سے اس کے معنوی حقیقت آشکارا نہیں ہو سکتی۔ اکادمی سے ہم کیا مراد لیتے ہیں کیا یہ ایک مدرسہ ہے۔ نہیں قطعاً نہیں کیا یہ ایک تحقیقاتی ادارہ ہے؟ اکادمی سے ہم کیا مراد لیتے ہیں؟ کیا یہ ایک مدرسہ

ہے؟ نہیں قطعاً نہیں۔ کیا یہ ایک تحقیقاتی ادارہ ہے؟ نہیں یہ بھی غلط، کیا یہ ادبا اور مصنفین کی انجمن ہے؟ اس سوال کا جواب بھی نفی میں ملے گا۔

ہاں! اگر یہ سوال کیا جائے کہ آیا اکادمی ان جملہ خصوصیات کا سرچشمہ تو نہیں۔ تو پھر بڑی شدومد کے ساتھ اس کا جواب اثبات میں ہوگا۔ اکادمی کی اصطلاح ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لیتی ہے۔ یہ اصطلاح ہمارا ذہن ایک ہی وقت میں ایک مدرسہ، ایک ادارہ اور ایک انجمن کی جانب منتقل کر دیتی ہے اگر ہم اسے صرف ایک مدرسہ یا ایک ادارہ یا ایک انجمن قرار دیتے تو اظہار مفہوم میں تشنگی رہ جاتی۔ اکادمی ان سب سے بڑھ چڑھ کر ہے۔

قریب قریب ۹۰۰ سال تک یونان میں اکادمیوں کا دور رہا۔ اگر "جسٹی نین" کا تہدیدی فرمان جاری نہ ہوتا تو ان اکادمیوں کی بساط کبھی نہ الٹ سکتی۔ ۹۰۰ سال کی اس طویل مدت کے دوران اکادمی کی اصطلاح اپنے ایک خاص مفہوم کے ساتھ شہرت پا گئی۔ السنۂ شرقیہ و غربیہ کی لغات میں اکادمی کے لئے کوئی ایسا مترادف لفظ نہیں ملتا۔ جو لطف اور شگفتگی میں اکادمی کا لگا کھا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے کسی نئے لفظ کی کھوج میں وقت نہیں گنوایا اور سستی کی حاصل سے باز رہے۔ ہم نے اصل خط اکادمی تلفظ کی تھوڑی بہت رعایتوں کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔

شروع میں ہمیں یہ چاہیے کہ ہم اکادمی کے دائرۂ عمل کی وسعتوں کا جائزہ لیں اور اس چیز کا واضح نقش اپنے ذہن میں بٹھائیں کہ یہ اکادمی کس معیار کا علم و ادب یا علم و ادب کا کون سا معیار دنیا کے سامنے پیش کرے گی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اکادمی کے سلسلے میں معیار کا مسئلہ اساسی حیثیت رکھتا ہے اکادمی کا یہ فرض ہے کہ ان اشخاص کے لئے جو ارباب علم و فضل کی حیثیت

سے ایک ممتاز زندگی بسر کرنی چاہتے ہیں - ایک معیار مقرر کرے - اکادمی کی غرض وغایت اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہے جب کہ اس کا معیار امکان کی حد تک بلند ہو - اگر معیار پست رہ جاتا ہے تو پھر اکادمی کے قیام کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا -

اکادمی کا مقصد عوام کے ذوق کی تربیت اور ادب کا ارتقاء ہے ۔ اس مقصد کی تکمیل اسی صورت میں ہو سکتی ہے اگر ہم بلند ترین معیار برقرار رکھیں. جب معیار بلند ترین ہوگا تو ارباب قلم کا سارا زور ایسی تخلیقات پر صرف ہوگا جو مستقبل میں انسانیت کی میراث یا نسل انسانیت کا ورثہ بن سکیں - میرا خیال ہے کہ فرانسیسی اکادمی کی واحد مثال سے معیار کے مسئلہ کی وضاحت ہو سکتی ہے - لوئی چہاردہم نے ۱۶۳۵ء میں اس اکادمی کی بنیاد ڈالی تھی - اس اکادمی کے اراکین صرف چالیس افراد تھے - نہ کم نہ زیادہ - تاریخ بتلاتی ہے کہ آج تک اس تعداد میں اضافہ نہیں ہو سکا - اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ فرانس کے طول وعرض میں ایسے اشخاص کی تعداد جنہیں اکادمی کا اعزاز ہے یا ہو سکتا ہے - صرف چالیس ہے ، جب تک اکادمی میں کوئی اسامی خالی نہیں ہوتی فرانس کے ممتاز ترین اشخاص کو بھی اسوقت تک چشم براہ رہنا پڑتا ہے -

معیار پر شدید اصرار کا نتیجہ ہی تو ہے کہ فرانس میں اکادمی کی رکنیت کو بقائے دوام کی ضمانت قرار دیا جاتا ہے - اکادمی کے لئے کسی رکن کا انتخاب اس بات کی سند سمجھا جاتا تھا کہ مستقبل میں اس کی شہرت کو چار چاند لگیں گے - اکادمی کی یہ استثنائی شان رہی ہے کہ بعض اوقات بڑے بڑے اصحاب علم وفن کو اس کی رکنیت کا اعزاز میسر نہیں آسکا - ڈیکارٹ ، پیسکل ، مولیرے کی شخصیتیں ہیں جن کے علم وفضل میں کوئی کلام نہیں - لیکن اس کے باوجود فرانسیسی اکادمی کی بارگاہ

میں انھیں شرف باریابی حاصل نہیں ہو سکا۔ مانٹیس کو اور والیٹر کو اس اعتبار سے خوش نصیب کہا جا سکتا ہے۔ لیکن روسو کو اکادمی کی رکنیت نصیب نہیں ہو سکی ہم سب اس حقیقت سے باخبر ہیں۔ کہ فرانسیسی دنیائے ادب میں بحر العلوم شخصیتوں کا پایہ بہت بلند رہا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں صرف ڈی البرٹ اور مارمونتیل اکادمی کے رکن بن سکے ڈوڈی رودٹ اور ہیل ڈی ٹیس کو اکادمی نے کوئی مقام نہیں دیا۔

دور جدید میں فرانسیسی ادب کے بعض علمبردار ایسے ہیں جنھوں نے اس امتیازی منصب کے حصول کے لئے طویل مدت تک زحمت انتظار گوارا کی۔ لیکن پھر بھی ناکام رہے۔ غالباً انیسویں صدی جدید فرانسیسی ادب کا عہد زریں ہے۔

اسی دور میں ایسے ارباب قلم کا سراغ ملتا ہے جن کا تصنیفی سرمایہ کلاسکی ادب شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن ان میں سے بھی بہت سے ایسے ہیں جنھیں اکادمی کی رکنیت کا اعزاز کبھی نصیب نہیں ہو سکا۔ نہ تو ڈوڈت اکادمی کا رکن تھا اور نہ ہوپاسیٹ اور زولہ کو اس کی رکنیت حاصل تھی۔ لیرتین کو اپنی اس خوش نصیبی پر ناز تھا کہ چند سالہ مدت انتظار کے بعد اسے اکادمی کی لڑی میں پرو لیا گیا تھا۔ اور تو اور (Les Malheureux) "بدبختی کے مارے" کے مصنف کو بھی اس رکنیت کے لئے دس سال تک انتظار کی زحمت گوارا کرنی پڑی تھی۔ اینڈری گائیڈ ایسے فرانسیسی ادیب کو جو عالمگیر شہرت کا مالک ہے اور جسے ۱۹۴۷ء میں نوبل پرائز بھی ملا تھا۔ اکادمی کی رکنیت کبھی میسر نہیں آ سکی۔ اگر ہندوستان کی اکادمی اس نوعیت کا معیار برقرار نہیں رکھ سکتی اور اس کا اعزاز صرف ان ادباء کی شخصیات تک محدود و محصور نہیں رہتا جن کے خلود و دوام کی مہریں جریدہ عالم پر ثبت ہوتی ہیں تو یہ اکادمی اپنے اس مقصد کی تکمیل میں ناکام رہے

کی۔ جس کے تحت اس کا قیام عمل آرہا ہے۔

اکادمی کے آئین کی تشکیل کے وقت ہماری نظران اہم امور پر تھی۔ ہمنے سوچا کہ اگر ہم اکادمی کی رکنیت کی اساس انہی اصولوں پر رکھیں جو فرانسیسی اکادمی کے ساتھ مخصوص رہے ہیں تو پھر اس کے قیام میں بڑی دشواریاں پیش آئیں گی ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ابھی ہندوستان نے ادبی ترقی میں وہ مقام حاصل نہیں کیا ہے کہ تیس چالیس اشخاص یہاں ایسے نکل آئیں جنہیں ادبی حیثیت سے لافانی شخصیتیں قرار دیا جاسکے۔ لہٰذا ہم نے اراکین اور رفقاء کے دو امتیازی درجے مقرر کر دیئے ہیں۔ رکنیت کے لئے ہم نے وہ معیار مقرر نہیں کیا ہے جو فرانسیسی اکادمی کا شعار رہا ہے۔ ہم نے صرف اسی پر اکتفا کیا ہے کہ ہر اس شخص کا اکادمی سے تعلق ہو سکتا ہے جس نے ارتقائے ادب کے سلسلے میں اپنی خدمات پیش کی ہوں۔ یا ایک صاحب علم و فضل کی حیثیت سے اس کے ادبی کمال میں کسی کو کلام نہ ہو۔ فرانسیسی اکادمی کا سا معیار برقرار رکھنے کے لئے ہم نے رفقائے اکادمی کا ایک درجہ الگ رکھا ہے۔ اس درجہ میں صرف منتخب ارباب علم ہی شامل ہو سکیں گے۔ اکادمی میں اگر انگریزی کے ممتاز ارباب قلم نے بار نہ پایا تو اکادمی پایہ تکمیل کو نہیں پہونچ سکتی یہ مانی ہوئی بات کہ گزشتہ صدی یا ڈیڑھ صدی سے انگریزی زبان نہ صرف ذریعہ تعلیم رہی ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے اکثر بے نظیر ادباء نے اسی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ادبار کے لئے یہ راہ عمل ناگزیر تھی۔ اس لئے کہ انگریزی نے وہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ تاوقتیکہ کوئی مصنف اس زبان میں اپنے خیالات کا اظہار نہ کرے اس کی ادبی اور علمی حیثیت مسلم نہیں ہو سکتی تھی۔ دور حال کا عظیم ترین شاعر ٹیگور بچپن سے بنگلہ میں لکھتا پڑھتا رہا ہے لیکن اس کے باوجود سچ یہ ہے کہ اپنے صوبہ میں اسے کوئی نہ جان سکا۔ لیکن جب اس کی گیتانجلی کا انگریزی میں

ترجمہ ہوا تو دنیا میں یہ دھوم مچ گئی کہ ٹیگور دنیا کا ایک عظیم ترین شاعر ہے مہاتما گاندھی کی دہ تصنیفات کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے نہ صرف سیاسی شعور پیدا کیا ہے بلکہ ہندوستان کی زندگی میں انقلاب کی روح پھونک دی ہے علی ہذا القیاس آر دبند گھوش کو جو امتیاز ہوا۔ اس کی بنیاد بھی اس کی انگریزی تصنیفات پر ہے۔

میں کچھ عرصے سے یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ بات کتنی بہتر رہے گی کہ ہم ہندوستان کی مختلف زبانوں میں تخلیقی زبانوں میں تخلیقی ادب کے ارتقا کی کوشش کریں۔ بعض صوبائی حکومتوں نے اس سلسلہ میں کام کا آغاز کر دیا ہے۔ لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ مختلف زبانوں میں لکھنے والے ادبار کو پورے ہندوستان میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہونی چاہئے۔ میں نے وزارت کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اس مسئلہ کے مالا ومالیہ پر غور کرے۔ اس کے ساتھ ہی میری یہ تجویز بھی تھی کہ ادبار اور ارباب قلم کی حوصلہ افزائی کے لئے انعامات مقرر کئے جائیں یا اور کوئی اعزاز جو ان کے شایان شان ہو۔ حکومت نے یہ اسکیم منظور کر لی ہے۔ وہ ہر سال ہم ۱ زبانوں میں سے ہر زبان میں بہترین تخلیقات پر پانچ ہزار روپے کے سالانہ انعامات تقسیم کرے گی۔ کسی ایک مصنف کو دوبار انعام لینے کا حق نہ ہوگا اور انعام صرف اسی ادیب کو ملے گا جس کے حق میں اکادمی کی سفارشات ہوں گی۔

اس موقعہ پر ایک چیز کی صراحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ انعامات مسلمہ قابلیت کی بنا پر دیئے جائیں گے اور اس سلسلہ میں یہ ضروری نہیں کہ کوئی صاحب ان انعامات کے لئے درخواست گزاریں۔ اکادمی کے قیام کا جہاں تک تعلق ہے حکومت کی حیثیت پردہ کشائی کی سی ہے۔

(پردہ کشائی ترکیب دراصل (CURTAIN RAISER) کا ترجمہ ہے۔ حضرت مولانا کے خیال میں حکومت کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں

کہ وہ کسی رسم یا تقریب کی پردہ کشائی کرے باقی قیام و دوام کا جہاں تک تعلق ہے اس کی ذمہ داری عوام اور ماہرین علوم و فنون پر عاید ہوتی ہے۔ جن کا ذوق علم پختہ اور انداز فکر بالغ ہے۔ مولانا نے جن فرانسیسی ادبا کا ذکر اس مضمون میں کیا ہے ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں، جس کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر نہ ہو یہ وہ فرانسیسی ادبا ہیں جن کی تخلیقات تاریخ کے ہر دور میں عوام و خواص سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ مولانا نے اس مضمون میں جہاں انگریزی زبان کی مقبولیت کے دستاویزی شواہد پیش کئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ باوجود اسکے کہ مولانا مشرقی علوم کے دلدادہ ہیں۔ وہ اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکے کہ ہر زمانہ کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ جب تک ادبا اور مصنفین اس مزاج سے آشنا نہیں ہوں گے یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکیں۔ اکادمی کی اہمیت کے سلسلہ میں مولانا نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اپنی جگہ کافی وزن رکھتے ہیں۔

(انڈین ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن کے اکتیسویں اجلاس میسور میں ۲۵ جنوری ۱۹۵۵ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے جو معرکتہ الآرا خطبہ صدارت پڑھا تھا۔ اس کا متن اپنے موضوع کی اہمیت کے اعتبار سے آج بھی ایک افادی حیثیت رکھتا ہے۔

جنگ آزادی کی نئی تاریخ

تیس سال کا عرصہ گذرا کہ میں نے کسی ایسے ہی موقعہ پر آپ کی توجہات اس امر کی جانب مبذول کی تھیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی نئی تاریخ ترتیب دینے کے لئے ہمیں یہ چاہیئے کہ اس تاریخی مواد سے استفادہ کریں جو قومی محافظ خانوں (NATIONAL ARCHIVES) میں ایک مدت سے محفوظ ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو میرے اس عندیہ سے اتفاق ہوگا کہ ابھی تک جنگ آزادی کی کوئی ایسی تاریخ مرتب نہیں ہوئی ہے۔ جس واقعات پر معروضی نقطہ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہو۔ یہ راز آپ سے مخفی نہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد اس جنگ آزادی کی نوعیت وغایت کا مسئلہ ہندوستان اور بیرون ہند ممالک میں بحث و نزاع کا موضوع بنا رہا ہے۔ مختلف زاویوں سے کتابیں تحریر کی گئی ہیں۔ اگر ہم صرف مسلم الثبوت مورخین کے کارناموں تک اپنی نظر محدود رکھیں تو پھر بھی گنتی سینکڑوں تک پہونچے گی۔ مگر یہ واضح رہے کہ یہ تمام تاریخیں برطانوی نقطہ نظر سے ترتیب دی گئی ہیں۔ ان تاریخوں میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ جنگ، حکومت وقت کے آئینی نظام کے خلاف ہندوستانی فوج کی

کی بغاوت تھی۔ بعض ہندوستانی ریاستوں نے بھی اس بغاوت میں حصہ لیا تھا لیکن یہ وہ ریاستیں تھیں جنھیں لارڈ ڈلہوزی کے الحاق اقدام کے سبب حکومت برطانیہ سے رنجش تھی۔ برطانوی حکومت کی حیثیت سے بغاوت پر قابو پا لیا۔ اور نظم و آئین برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ متعدد کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جس میں ۱۸۵۷ء کے واقعات کی تعبیر کسی دوسرے انداز میں کی گئی ہو۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جہاں ان واقعہ نگار مصنفین نے ایسے ان گنت مظالم کا ذکر کیا ہے۔ جو ہندوستانیوں نے انگریز مرد، عورتوں اور بچوں پر کئے وہاں کسی ایک نے بھی ان ایذا رسانیوں کی جانب اشارہ تک نہیں کیا جو انگریزوں نے ہندوستان کے خلاف روا رکھی ہیں۔

آج کل یہ ایک عام رسم ہے کہ سرکاری کاغذات نصف صدی کے بعد محققین کی نذر کر دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ وہ انھیں تحقیق و تدقیق کی خراد پر چڑھائیں اور اپنے انداز پر ان کی چھان پھٹک کریں۔ اس رسم کی ابتدا، برطانیہ نے ان ایام میں کی جب اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جنگ نپولین سے متعلق جو سرکاری دستاویزات ہیں انھیں تحقیقی جدوجہد کے بعد مرتب کیا جائے۔ یورپ کے دیگر ممالک نے بھی اس رسم کو سند قبول عطا کی۔ ۱۹۰۸ء میں جب بغاوت ہند (جنگ آزادی) پر پچاس بہاریں بیت چکیں تو حکومت ہند نے یہ فیصلہ کیا کہ اس بغاوت سے متعلق جتنے بھی دستاویزی کاغذات ہیں ان پر تحقیقی نظر ڈالی جائے تاکہ ان کی بنیاد پر ۱۸۵۷ء کی تاریخ مرتب کی جا سکے۔ چنانچہ ایک مناسب مدت میں ان سرکاری دستاویزات کی مدد سے ایک سہ جلدی تاریخ شائع ہو گئی۔

دوسرے برطانوی مصنفین کا جو نقطۂ نظر رہا ہے اسی کی پیروی اس تاریخ میں کی گئی ہے۔ البتہ اس تصنیف میں ایک نئی بات کہی گئی ہے اور وہ یہ کہ

جہاں تک اودھ کا تعلق ہے اس غدر میں ایک قومی بغاوت کے عناصر بھی شامل تھے انگریزوں نے حال ہی میں ایک ہندوستانی حکمراں سے اودھ کی زمام اختیار چھینی تھی لہذا یہاں کے باشندوں کے جذبات سخت مشتعل تھے۔ اگر انھوں نے کمپنی سے جنگ کی تو وہ حق بجانب تھے۔ اس لئے کہ اس کمپنی نے اودھ کے ساتھ نامنصفانہ برتاؤ کیا تھا۔ دراصل یہ کوئی نیا انکشاف نہیں۔ اس لئے کہ لارڈ کیننگ اپنے مراسلات میں پہلے ہی یہ اعتراف کر چکے ہیں کہ اودھ میں جنگ کی نوعیت ایک قومی بغاوت کی سی تھی لارڈ کیننگ کے اظہار خیال کے بعد مذکورۃ الصدر کتاب میں مصنف کا بیان کوئی زیادہ جرأت مندی کا ثبوت نہیں ہے۔

مصنف نے یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ تعلقہ داران اودھ کے ساتھ غدر کے بعد حکومت نے جو نرمی کا برتاؤ کیا ہے۔ اس کی تہ میں بھی یہی چیز کام کر رہی ہے۔ یعنی یہ احساس کہ اودھیوں کے ساتھ غدر کے ایام میں ناانصافی کی گئی ہے اور اسکا تدارک اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا جائے۔

کچھ عرصے سے میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی سے متعلق ایک نئی اور واقعیت پسندانہ (معروضی) تاریخ لکھنے کا وقت آگیا ہے۔ سال پیشتر جب میں نے آپ سے خطاب کیا تھا تو اس وقت بھی میرے ذہن

ہمیں قومی بغاوت بنگ آزادی) کی سو سالہ تاریخ دنیا کے سامنے پیش کرنی ہے غدر میں دس مئی ۱۸۵۷ء کو پہلی بار گولیاں چلی تھیں۔ لہذا اس سے زیادہ اور کیا مناسب بات ہو سکتی ہے کہ ہم دس مئی ۱۹۵۷ء کو تحریک آزادی کی ایک جامع تاریخ شائع کریں۔

اس حقیقت کے پیش نظر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کام کی ابتدا فوراً ہونی چاہئیے، حکومت ہند نے اس فیصلہ کی لاج رکھی اور ایک مشہور ہندوستانی مورخ ڈاکٹر ایس۔ این سین کو جو قومی محافظ خانوں (NATIONAL ARCHIVES) کے سابق نگراں اور کچھ عرصہ تک دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے ہیں، تاریخ نویسی کے کام پر مامور کر دیا میں یہ چاہتا ہوں کہ اس کام کی تکمیل اتنے وقت میں ہو جائے کہ حکومت یہ تاریخ ۱۰ مئی ۱۹۵۷ء تک زیور طباعت سے آراستہ کر سکے۔

میں اس امر کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی پر ایک مستند تاریخ ہوگی۔ اس تاریخ میں واقعات پر غیر جانبدارانہ حیثیت سے روشنی ڈالی جائے گی۔ اس تاریخ کی بنیاد حقائق اور صرف حقائق پر ہوگی۔ اور یہ حقائق ان دستاویزی کاغذات سے اخذ کیے جائیں گے۔ جو محافظ خانوں میں مہیا کیے ہیں اور حکومت ہند نے وہ تمام دستاویزیں جو اس موضوع سے متعلق محافظ خانوں میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر سین کے حوالے کر دی ہیں۔ یہ تجویز بھی ہے کہ لندن کے انڈیا آفس سے اس موضوع پر جتنی ضروری معلومات بہم پہنچ سکیں۔ دستیاب کی جائیں اور ڈاکٹر سین کو ان کے استفادہ کا موقعہ دیا جائے۔

مجھے اس دشواری کا احساس ہے جو تاریخی واقعات کی حقیقت پسندانہ (معروضی) تعبیر کے سلسلہ میں پیش آسکتی ہے اور پھر واقعات ایسے جو ماضی میں جذبات کی برانگیختگی کا باعث ہو چکے ہیں۔ ان حالات میں جب کہ شخصی، نسلی، یا قومی احساس کے نشتر پہلو میں چبھے ہوئے ہوں یہ بڑے دل گردے کا کام ہے کہ کوئی مورخ جوش و ہوش میں توازن برقرار رکھ سکے۔ پھر بھی ایک ایسے

مورخ کو جو صحیح معنی میں مورخ بننے کا آرزومند ہے - حتی الامکان توازن برقرار رکھنے کی پیہم کوشش کرنی چاہیئے -

میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ ہندوستان کی آزادی سے قبل غدر کی معروضی تاریخ کسی صورت میں بھی مرتب نہیں کی جا سکتی تھی - دو عوامل ہیں جن کے باعث آج فریضہ تاریخ نویسی سے عہدہ برآ ہونے کے امکانات زیادہ قوی ہیں - اول تو یہ کہ جن واقعات کی تازگی سے دل و دماغ میں جو چبھن سی محسوس ہو سکتی تھی - سالہا سال کی گردش لیل و نہار نے اس کا زور کافی حد تک کم کر دیا ہے - بُعد زمانے سے نفرت و حقارت اور آویزش و پیکار کے ان جذبات پر بھی اوس پڑ گئی جو کسی وقت اس خونی ڈرامہ کے اداکاروں کے خلاف دلوں میں کھول رہے تھے - علاوہ سیاسی حیثیت سے بھی ماضی کے واقعات اپنے اندر کشش نہیں رکھتے - نہ ہم ان واقعات سے ترغیب و ترہیب کا کام لے سکتے ہیں -

ہندوستان اور برطانیہ کے مابین جو سیاسی مسئلہ مابہ النزاع بنا ہوا تھا - مفاہمت اور معاہدات کی خوشگوار فضا میں حل ہو چکا ہے - دونوں ملکوں کے مابین دوستی اور خیر سگالی کے احساسات پائے جاتے ہیں - ہندوستانی تعلقات میں جو کشیدگی اور تلخی ماضی میں پائی جاتی تھی حال کے تعلقات نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہے لہذا آج ایک ایسی فضا اور ایک ایسا ماحول پیدا ہو چکا ہے کہ ہم ۱۸۵۷ء کے واقعات کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کر سکتے ہیں اس مطالعہ کی بنیاد واقعیت پسندی پر ہو گی - فریقین نے جو زیادتیاں کی ہیں، ان پر لعن طعن کی نوبت بھی نہیں آئے گی -

اس موقعہ پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۸۵۷ء میں کسی ہندوستانی نے کوئی تحریر ہمارے لئے نہیں چھوڑی جسے ہندوستانی نقطۂ نظر سے واقعات کی دستاویزی

تحریر سے تعبیر کیا جائے۔ لیکن اگر ہم معاملہ کی نوعیت پر غور و خوض کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم حیران و ششدر ہوں۔ ہمیں علم ہے کہ انگریزوں نے بغاوت کی سرکوبی اتنی شدت سے کی تھی کہ سالہا سال تک ملک میں خوف و دہشت کی فضا رہی۔ ہزاروں کو بغیر کسی عدالتی کارروائی کے پھانسی کی سزا دی گئی۔ شمالی ہند میں مشکل ہی سے کوئی ایسا خطہ ارض ہوگا۔ جہاں پھانسی کے تختوں پر لٹکی ہوئی لاشیں لوگوں کے دلوں میں حکومت کے انتقام کی یاد تازہ نہ کرتی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں کسی ہندوستانی کو ۱۸۵۷ء کے واقعات سے آزادی کیساتھ کچھ لکھنے یا کہنے کی جرأت و جسارت نہیں ہو سکی۔ چند ہندوستانی جو حکومت کے ملازم یا حامی تھے۔ اپنے پیچھے کچھ یادیں چھوڑ گئے ہیں۔ لیکن کوئی ایسا شخص جو آزادی اور بے باکی کے ساتھ اس موضوع پر کچھ لکھ سکتا تھا۔ وہ اپنے قلم کو جنبش نہیں دے سکا۔

اس بات کی شہادت میں کہ ہندوستانیوں کے دماغ کتنے دہشت زدہ تھے۔ صرف ایک شخص مرزا معین الدین کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ یہ مرزا ایام غدر میں دہلی کے آس پاس کے علاقے میں سب انسپکٹر پولیس تھا۔ انہی ایام میں اس نے راہ فرار اختیار کی۔ اور ایران جا پہنچا۔ وہاں سے مرزا کی واپسی دو سال کے بعد ہوئی۔ مسٹر میٹکاف کی درخواست پر جس کی جان اس نے ایام غدر میں بچائی تھی۔ اس نے اپنے تجربات قلمبند کئے اور مسودہ مسٹر میٹکاف کو اس بجنہ شرط پر دے دیا کہ اس کی اشاعت میری زندگی میں نہیں ہونی چاہئے۔ مرزا کی کتاب میں مشکل سے ایک لفظ حکومت کے خلاف ہے۔ پوری کتاب میں مرزا نے ان کیفیات و واردات کا تذکرہ کیا ہے جو اس کے دل و دماغ پر غدر کے ایام میں طاری ہوئی تھیں لیکن اسکے باوجود مرزا پر خوف کا اتنا غلبہ تھا کہ اس نے مذکورہ بالا شرط کے بغیر

سو وہ مسٹر میٹکاف کے حوالے نہیں کیا۔ مسٹر میٹکاف نے اپنا قول نبھایا اور حمزنا معین الدین کی موت کے فوراً بعد کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا۔ مگر مسٹر میٹکاف کی زندگی میں یہ کتاب اشاعت پذیر نہ ہو سکی۔

یہ مسئلہ اکثر زیر بحث آیا ہے کہ آیا وہ کون کون اشخاص تھے جس پر غدر کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ اس ضمن میں جو کچھ خیالات ظاہر کئے گئے ہیں ان کی رو سے یہ بات نکلتی ہے کہ منصوبہ بندوں کی ایک جماعت نے ایک خاکہ تیار کیا تھا جس کے مطابق تحریک چالو کی گئی۔ مجھے ان خیالات کی صحت میں قوی شبہات ہیں۔ غدر کے دوران اور اس کے قریبی سالوں میں برطانوی حکومت نے بغاوت کی ابتدا اور اس کے اسباب کے سلسلہ میں کافی سے زیادہ چھان بین کی ہے۔ دارالعلوم میں لارڈ سالسبری نے یہ بیان دیا کہ میں کسی قیمت پر یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ ایسی وسیع اور زبردست تحریک کی بنیاد صرف روغنی کارتوس کا مسئلہ ہو سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بغاوت کے اسباب اتنے سطحی نہیں ہیں۔ حکومت ہند اور حکومت پنجاب نے اس مسئلہ پر غور و خوض کرنے کے لئے کئی کمیشن بٹھائے اور کئی بورڈ مقرر کئے اور ان تمام افواہوں اور قصہ کہانیوں کی جانچ پڑتال کی گئی۔ جو ان ایام میں زبان زدِ عام ہو چکے تھے۔ چپاتیوں کے ذریعہ پیغام رسانی کی داستان بھی نوک زبان تھی۔ یہ پیش گوئی بھی زبانوں پر چڑھی ہوئی تھی کہ ہندوستان میں برطانیہ کا اقتدار صرف سو سال.. تک باقی رہ سکے گا۔ اور جنگ پلاسی سے ایک صدی بعد جون ۱۹۵۷ء میں اس کا زوال یقینی ہے۔ (اصل متن میں پریس کی غلطی سے جون ۱۸۵۷ء چھپا ہوا ہے) کافی حد تک چھان بین کے باوجود کوئی شہادت اس قسم کی نہیں مل سکی۔ جس سے یہ ثابت ہو سکا۔ کہ فوج اور ہندوستانیوں کی حکومت کا تختہ

اٹھنے کی سازشیں کی تھیں۔

یہ تسلیم کرنے میں مجھے کسی قدر تامل ہے کہ جس تحقیقی مہم کا ہم بیڑا اٹھائے ہیں وہ بھی مسئلہ کے اس پہلو کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہوگی یا نہیں؟"

جن ایام میں بہادر شاہ ظفر پر عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا۔ یہ کوشش بھی جاری تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس بات کا ثبوت فراہم کیا جائے کہ بادشاہ بھی سوچی سمجھی سازش میں شریک تھا۔ اس سلسلہ میں جو شہادت پیش کی گئی اسے ان برطانوی افسروں نے بھی تسلیم نہیں کیا جن کے ہاتھوں میں مقدمہ کی باگ ڈور تھی۔ اگر کوئی تھوڑی سی سمجھ بوجھ بھی رکھتا ہے وہ آج بھی اسے بیہودہ قرار دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ دوران مقدمہ کی تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ غدر کے اسباب سے جتنی حیرت برطانیہ کو تھی اتنا ہی استعجاب بہادر شاہ کو بھی تھا۔

موجودہ صدی کے اوائل میں بعض ہندوستانیوں نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب پر بھی کچھ لکھا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ ان کی تحریریں تاریخ نہیں۔ بلکہ محض سیاسی پروپیگنڈہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان مصنفین نے یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے کہ بغاوت ہند یا غدر سوچی سمجھی جنگ آزادی تھی۔ اور اس جنگ کے پیچھے ہندوستان کے امراء کا ہاتھ تھا۔ یہ امراء حکومت کا تختہ الٹ دینا چاہتے تھے ان مصنفین نے بغاوت کے چند سربراہوں کی نشان دہی بھی کی ہے کہا جاتا ہے کہ نانا راؤ جو آخری پیشوا باجی راؤ کا جانشین تھا۔ اس نے غدر کا ذہنی خاکہ تیار کیا تھا۔ اور یہ نانا راؤ ہی تھا جس نے ہندوستان میں فوجی تنظیم کی تھی اور اس کے ساتھ مختلف علاقوں کے قومی اداروں سے رابطہ قائم کیا تھا۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ نانا راؤ مارچ اور اپریل ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ اور انبالہ پہنچا تھا۔ اور اس کے فوراً ہی بعد مئی ۱۸۵۷ء

میں غدر کی آگ پھوٹ نکلی تھی۔ میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے اس بارے میں اتفاق کریں گے کہ یہ شہادت نتائج کے اعتبار سے کوئی وزن نہیں رکھتی صرف اتنی سی بات کہ نانا راؤ نے غدر سے پہلے لکھنؤ اور انبالہ کا دورہ کیا تھا۔ وزنی شہادت نہیں قرار دی جا سکتی۔

اس ضمن میں جن قیاسات کے خیالی قلعے تعمیر کئے گئے ہیں۔ ان کی بیہودگی اس سے ظاہر ہے کہ مورخین کے خیال میں اودھ کا وزیر علی نقی خاں بھی سازشیوں کی ٹولی میں شریک تھا۔ ہر وہ شخص جس نے تاریخ اودھ کا مطالعہ کیا ہے وہ مورخین کی اس نکتہ آفرینی کو مضحکہ خیز قرار دے گا۔ علی نقی ایسٹ انڈیا کمپنی بگوش غلام تھا۔ یہی وہ شخص ہے جسے برطانیہ نے اس بات پر مامور کیا تھا کہ وہ واجد علی شاہ کو ریاستی حکومت سے رضا کارانہ دستبرداری پر آمادہ کرے۔ برطانوی ریذیڈنٹ جنرل اوٹرم نے علی نقی خاں سے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو تمہیں گراں قدر انعامات سے نوازا جائے گا۔

علی نقی خاں حصول مقصد کی خاطر اتنی گرم جوشی کے ساتھ عمل پیرا تھا کہ واجد علی شاہ کی والدہ کو یہ خوف دامنگیر ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی نہ کسی جتن سے یہ علی نقی اپنا الو سیدھا کر لے۔ اس خاتون نے حکومت کی مُہر اپنے تصرف میں لے لی اور اسے زنانخانہ میں محفوظ رکھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس بیگم نے احکام جاری کر دیئے کہ میرے حکم کے بغیر کسی کی مجال نہیں کہ وہ یہ مہر باہر لے جائے۔

لکھنؤ میں ان حقائق سے ہر شخص آشنا ہے اور یہاں آج بھی علی نقی خاں کو دغا باز کہا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ غدر اس قسم کے اشخاص کی ذہنی پیداوار تھا۔ ایک بے ہودہ خیال ہے۔

منشی عظیم اللہ خان اور رانگو باپو کے بارے میں بھی یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بغاوت کے لئے زمین ہموار کی تھی۔ عظیم اللہ خان نانا راؤ کا ایجنٹ تھا۔ اور اس نے اسے لندن اس غرض سے روانہ کیا تھا کہ وہاں جاکر اس کی وکالت کرے اور اس کے لئے اس پنشن کی منظوری حاصل کرے جو باجی راؤ کو دی جاتی تھی جب منشی عظیم اللہ خاں واپس ہندوستان آیا تھا تو اثنائے راہ میں اس نے ترکی میں بھی قیام کیا۔ یہاں اس کی ملاقات عمر پاشا سے ہوئی، اسی طرح رانگو باپو نے بھی لندن کا سفر کیا تھا۔ اس کے ورود لندن کا مقصد ڈلہوزی کے فیصلہ کے خلاف اپیل تھی۔ جس کی رو سے ستارا کو برطانوی ہند میں ضم کرلیا گیا تھا۔

ان ہر دو اشخاص کے سفر لندن سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ہو نہ ہو یہ دونوں بھی سازشوں میں شریک تھے۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ کسی شہادت کی بنیاد اس قسم کے مفروضات پر نہیں ہوتی۔ علاوہ بریں اگر وہ لندن میں ان معاملات سے متعلق ذکر اذکار بھی کرتے تو بھی ہم انہیں بغاوت ہند کے علمبردار نہیں مان سکتے تھے۔ ہاں اگر حالات و واقعات سے متعلق کچھ ان سے روشنی مل سکتی ہے تو پھر البتہ ان کے بارے میں ہمارا کچھ اور رویہ ہوگا۔ جنگ آزادی سے ان کے تعلق کی ہمیں کوئی شہادت نہیں ملتی۔ جب نہ تو کوئی دستاویزی ثبوت ان کی تائید میں ہے اور نہ کوئی شہادت ہی دستیاب ہوتی ہے۔ تو ہم کس طرح یہ باور کرلیں کہ انھوں نے غدر یا بغاوت ہند کی منصوبہ بندی کی تھی۔ تسخیر کانپور کے بعد انگریزوں نے نانا راؤ کے تمام کاغذات پر قبضہ کرلیا تھا۔ عظیم اللہ خان کے کاغذات بھی ان کی تحویل میں آگئے تھے۔

عظیم اللہ خان کے کاغذات میں عمر پاشا کے نام ایک مکتوب بھی تھا۔ جسے غالباً مکتوب الیہ کے پاس پہنچنے کی سعادت کبھی حاصل

نہیں ہو سکی۔ اس مکتوب میں عظیم اللہ خان نے عمر پاشا کو یہ اطلاع دی تھی کہ ہندوستانی سپاہیوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا ہے۔ عظیم اللہ خان کے اس مکتوب سے اور کسی دوسرے کاغذ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس نے ہندوستان میں بغاوت کا خاکہ بھی تیار کیا تھا۔"

دستاویزی شہادت کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ بغاوت ہند نہ تو محتاط منصوبہ بندی کا نتیجہ تھی اور نہ کسی کے انقلابی دماغ کی پیداوار غدر نتیجہ ہے۔ ان نفرت انگیز جذبات کا جو ایک صدی کے عرصے میں ہندوستانیوں کے دل و دماغ میں کمپنی کی حکومت کے خلاف راہ پا چکے تھے۔ ہندوستانیوں کو یہ احساس اور یہ شعور ہو چلا تھا کہ ایک بیرونی نسل نے ان کے ملک میں غلبہ و اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ جب عوام پر یہ احساس غالب ہو گیا تو اس نے سرکشی اور بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ ہم اس بغاوت کو چند افراد چند جماعتوں کی سازش کا نتیجہ نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ تو عوام کی بڑھتی ہوئی بے چینی کا اثر تھا۔ جو رفتہ رفتہ بغاوت کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔

اگر یہ دریافت کیا جائے کہ ہندوستانیوں نے تقریباً ایک صدی تک بغاوت کو التواء میں کیوں ڈالے رکھا؟ تو اس کے جواب میں ہم حسب ذیل تصریحات پیش کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے اثر و نفوذ کی داستان تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ یہ اقتدار براہ راست حملہ کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو اس اقتدار کی داستان انگریزوں کی ایسی سست رفتار رفتاری سے شروع ہوتی ہے جس کی راہیں خود سرزمین ہند کے باشندوں نے ہموار کی ہیں۔ انگریزوں کی سرگرمیاں اس لئے اور پردہ خفا میں رہیں ہیں

کہ انھوں نے جو اقدامات بھی کیے ان پر تاج برطانیہ کی چھاپ نہیں تھی۔ اگر برطانوی حکومت نے شروع سے ہی ہندوستان کے معاملات میں براہ راست حصہ لیا ہوتا تو ہندوستانیوں پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی کہ ایک بیرونی طاقت اس ملک پر اپنے اقتدار کا پرچم لہرانا چاہتی ہے۔ چونکہ کمپنی کی سرگرمیوں کا محور زیادہ تر تجارتی مشاغل تھے۔ اس لئے انہیں یہ سان گمان بھی نہ ہوا کہ اس کے عزائم حاکمانہ ہیں۔ کمپنی کے ایجنٹوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ کچھ اس قسم کا خوش آئند رویہ برتا کہ بصورت دیگر حکومت کے ایجنٹوں سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ تاج برطانیہ کے کسی ایجنٹ کو مغلیہ دربار کے شہزادوں، امیروں اور کبیروں کی پاپوسی اور ان کی دہلیز پر جبہ سائی میں کچھ تامل ہو سکتا تھا۔ لیکن کمپنی کے ایجنٹوں نے اس رسم کی ادائیگی میں پس و پیش نہیں کیا۔ کمپنی کے ایجنٹوں کو معمولی سے درباریوں کے آگے سر تسلیم خم کرنے میں بھی کوئی عار نہ تھی ان کے کسی رویہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا تھا کہ ان کی حیثیت تاجروں کے علاوہ کچھ اور ہے۔

کمپنی کے یہ ایجنٹ رشوت ستانیوں اور طرح طرح کی بد عنوانیوں میں بھی مبتلا تھے۔ اور انھیں اپنی حکومت کے تعزیری شکنجوں میں کسے جانے کا مطلق کوئی خوف نہ تھا۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ایک عرصۂ دراز تک کمپنی نے کبھی اپنے نام سے کوئی کام نہیں کیا۔ اس نے ہمیشہ بعض مقامی سرداروں کی حمایت و تعاون سے اپنے مفادات کو ترقی دی۔ چنانچہ جنوبی ہند میں کمپنی نے نواب ارکاٹ کے حقوق و مطالبات کی تائید و توثیق کی آڑ میں اپنے قدم جمائے۔ علیٰ ہذالقیاس بنگال میں مرشد آباد کے نواب ناظم کے زیر اقتدار رہ کر

کمپنی نے اپنی مقصد برآری کی۔ کمپنی نے صحیح معنی میں حکومتِ بنگال کی باگ ڈور سنبھال لینے کے باوجود فرمان روائی کے انداز اختیار نہیں کئے کلایو نے دیوانی حقوق کی منظوری کے لئے خود بارگاہ سلطانی میں حاضری دی۔ برسوں کمپنی نے صوبوں کے صوبیداروں اور گورنروں کی رسمی تقریبات اور رواجی اجتماعات میں بھی نیاز مندانہ حیثیت سے شرکتیں کیں۔ ان صوبائی حاکموں (گورنروں) کے پاس اپنی اپنی مہریں تھیں۔ لیکن پھر بھی اپنے آپ کو شہنشاہ مغلیہ کے حلقہ بگوشوں میں سمجھتے تھے۔ کمپنی کے حاکم اعلیٰ (گورنر جنرل) کے پاس بھی ذاتی مہر تھی۔ لیکن وہ اس کے باوجود شہنشاہ ہی شاہ عالم کی آقائی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالے ہوئے تھا صوبوں کے گورنر اور صوبیدار شہنشاہ کے حضور دربار میں آداب و کورنش بجالاتے تحفے تحائف پیش کرتے اور ان کے صلہ میں شہنشاہ سے انعام و خلعت پاتے تھے۔ گورنر جنرل بھی دربارِ سلطانی میں حاضری و نیاز اور گنی کی نذر پیش کرتا تھا۔ اس کے صلہ میں شہنشاہ اسے خلعت اور خطابات سے نوازتا، اور یہ خطابات گورنر جنرل تمام سرکاری دستاویزات میں استعمال کرتا تھا۔ اس طرح شہنشاہ کے اقتدار اعلیٰ پر عزت و وقار اور جاہ و جلال کا کچھ ایسا خول چڑھا ہوا تھا کہ عوام کے ذہن میں کبھی یہ بات نہیں آئی کہ کمپنی آہستہ آہستہ حکومت کی باگ ڈور سنبھال رہی ہے۔

کمپنی کے اس تدریجی عمل دخل کا سلسلہ انیسویں صدی کے عشرہ ثانی تک برابر جاری رہا۔ اس وقت تک کمپنی کی حکومت ستلج تک پہنچ چکی تھی۔ لارڈ ہیسٹنگز نے جو ان ایام میں گورنر جنرل تھے یہ محسوس کیا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ کمپنی زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے اور شہنشاہ کے اختیارات سلب کر لے۔

اس سلسلہ میں گورنر جنرل نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ اس نے شہنشاہ سے

درخواست کی کہ دربارِ شاہی میں مجھے بھی شہنشاہ کے برابر نشست ملنی چاہیئے اس کے علاوہ یہ بھی درخواست کی کہ مجھے نذر کی پیش کش سے بھی مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ شہنشاہ نے دونوں درخواستیں مسترد کر دیں۔ گورنر جنرل نے سردست اس استرداد کو کوئی اہمیت نہیں دی اور بات رفت گذشت ہو گئی۔

کمپنی نے دولتِ مغلیہ کی بیخ کنی کے لئے یہ تدبیر سوچی کہ ایک آزاد اور مطلق العنان سلطنت کے قیام کی فکر کی جائے۔ اس ارادے سے کمپنی نے نظام دکن کو یہ ترغیب دی کہ وہ اپنی بادشاہت کا اعلان کر دے۔ نظام نے بات نہیں مانی تو انگریزوں نے اودھ کے نواب وزیر پر ڈورے ڈالے اور اسے اپنی مٹھی میں لے لیا۔ چنانچہ اودھ کی صوبائی حیثیت ختم ہو گئی اور اس نے شہنشاہ کی اطاعت سے منحرف ہو کر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

۱۸۳۵ء تک کمپنی نے اتنی طاقت حاصل کر لی کہ اس نے اپنے نام سے سکے جاری کر دیئے۔ سکوں پر سے شہنشاہ کا نام اڑا دیا گیا۔ کمپنی کے اس اقدام سے ہندوستان کے اکثر عوام کو سخت کوفت ہوئی۔ انہیں اب اس بات کا یقین ہو گیا کہ کمپنی نے محض تجارتی کاروبار کے پردے میں ہندوستان کے وسیع وعریض پر حاکمانہ تسلط کی طرح ڈالی ہے۔

۱۸۳۵ء میں کمپنی نے یہ فیصلہ بھی صادر کر دیا کہ سرکاری زبان فارسی کی بجائے انگریزی ہو گی۔ ان تمام باتوں کا مجموعی اثر یہ پڑا کہ عوام کو کمپنی کی حیثیت میں نمایاں تبدیلی کا حق الیقین ہو گیا۔ اس وحشت ناک صورت حال سے عوام میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس ہیجان کا اثر نہ صرف شہری آبادی کے باشندوں تک محدود رہا۔ بلکہ مسلح فوجوں کے سپاہی بھی اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اس بے چینی اور اس اضطراب کی آگ بھڑکی تو اس نے ۱۸۵۷ء کے غدر

کی شکل اختیار کر لی۔

اِس آتش انقلاب کو دو باتوں نے اور بھی زیادہ مشتعل کر دیا۔ اور یہی وہ باتیں ہیں جو ۱۸۵۷ء کی فوری بغاوت کا باعث ہوئیں ان میں سے ایک تو وہ نئی پالیسی تھی۔ جو شمالی مغربی صوبہ (بعد ازاں آگرہ اور اودھ) کے لیفٹننٹ گورنر مسٹر تھامسن نے اختیار کی تھی۔

شروع شروع میں کمپنی کی پالیسی یہ تھی کہ مالکانِ اراضی کا ایک ایسا طبقہ معرضِ وجود میں لایا جائے جو ہر موقعہ پر حکومت کے ساتھ تعاون کرتا رہے۔ لیکن تھامسن کا نظریہ دراصل کچھ اور تھا۔ اس نے اس پالیسی کی موافقت نہیں کی۔ اس کا یہ پختہ عقیدہ تھا کہ امیروں، کبیروں اور زمینداروں کا وجود کمپنی کے لئے ایک مستقل خطرہ ثابت ہوگا۔ لہذا اس نے یہ تجویز کی کہ زمیندار طبقہ کو ختم کر دیا جائے۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ مزارعین کے ساتھ ربط وضبط بڑھائے۔ اس نئی پالیسی کے نتیجہ میں کمپنی نے امیروں اور زمینداروں کو مالکانہ حقوق سے دستبردار کرنے اور ان کے مزارعین کو براہ راست اپنے تحت لانے کی ہر امکانی تدبیر اختیار کی۔

دوسری چیز جسے عواملِ انقلاب میں فیصلہ کن اہمیت دی جاسکتی ہے۔ ڈلہوزی کی وہ پالیسی ہے جس کی رو سے اس نے یکے بعد دیگرے ہندوستانی ریاستوں کو برطانوی عملداری میں شامل کر لیا تھا۔

ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام اپنی آخری منزل میں تھا۔ اس نظام میں اطاعت وانقیاد کا دائرہ صرف مالکان اراضی اور جاگیردار امرا کی شخصیتوں تک محدود رہتا تھا۔ اس نظام کے پیرو قوم یا ملک کی اطاعت کے تصور سے ناآشنا تھے۔ جب عوام نے دیکھا کہ ہندوستانی ریاستوں کا یکے

بعد بگڑے دیوالہ پٹ رہا ہے اور زمیندار طبقہ کی جڑیں اکھاڑی جارہی ہیں تو انھیں سخت تشویش ہوئی انھیں اس چیز کا احساس ہوگیا کہ کمپنی بے نقاب ہوگئی ہے۔ اب اس کے عزائم یہ ہیں کہ ہندوستان کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کا ڈھانچہ ہی بدل ڈالے۔ جب کمپنی نے اودھ پر قبضہ جمالیا تو عوام کی بے چینی میں بہت زیادہ اضافہ ہوا اودھ ایک ایسی ریاست تھی

جس نے ۷۰ سال تک کمپنی کی وفاداری کا دم بھرا تھا۔ اودھ نے اپنی وفاداری میں کبھی کمپنی کے مفاد کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ جب اس کے باوجود شاہ اودھ کو تخت سے دستبردار ہونا پڑا اور اس ریاست کو کمپنی نے اپنے قبضے میں لے لیا تو عوام پر ایک قیامت گزر گئی۔

حکومت اودھ کے زوال کا اثر اس لئے اور بھی زیادہ رونما ہوا کہ بنگال کی فوج میں سپاہیوں کی ایک کثیر تعداد اس رقبہ سے تعلق رکھتی تھی، ان سپاہیوں نے وفاداری کے ساتھ کمپنی کی خدمت کی تھی، اور اسے توسیع اقتدار میں زیادہ سے زیادہ مدد بہم پہنچائی تھی۔ ان پر یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ کمپنی نے ان کے ایثار و قربانی سے جو طاقت حاصل کی اسے اس نے خود ان کے بادشاہ کو تخت سے معزول کرنے پر صرف کردیا۔ مجھے اس بارے میں مطلق شبہ نہیں ہے کہ ۱۹۵۶ء میں جبکہ اودھ کا الحاق ہوا ہے۔ فوجی بغاوت نے سر ابھارا۔ عام فوج نے بھی اور خصوصیت کے ساتھ بنگالی فوج نے اس بغاوت کی آگ کچھ اور بھڑکادی۔ سنہ مذکور میں ہندوستانیوں نے کمپنی کی حکومت کو تہ و بالا کرنے کی تدبیریں سوچنی شروع کیں۔

لارنس اور بعض دوسرے حضرات جنھوں نے ایّام غدر میں ہندوستانی ... سپاہیوں کے احساسات وجذبات کی نوعیت معلوم کرنے کی کوشش کی تھی ۔ ۵۵ اس نظریہ کی تائید میں بہت کافی ثبوت چھوڑ گئے ہیں ۔ روغنی کارتوس فوج میں بے چینی کا نیا سبب نہیں بنا ۔ بلکہ اس نے عوام کے دبے ہوئے جذبات کو ابھرنے کا موقعہ دیا ۔

⁘ ⁘ ⁘

۵ر نومبر سنہ ۵۶ء کو یونیسکو کی جنرل
کانفرنس کے نویں اجلاس کے رسمی
افتتاح کے موقع پر حضرت مولانا نے
بین الاقوامی کشیدگی کے اسباب اور
امن کے دفاع کے اہم مسئلہ سے
متعلق بلیغ خیالات ظاہر فرمائے جو
عالم انسانیت کی موجودہ الجھنوں کا
ایک حل پیش کرتے ہیں۔

امن کا دفاع

اگر ہم آج سے بیس تیس برس پہلے کی دنیا پر نظر ڈالیں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ اس زمانے میں ایسے اجتماع منعقد کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس وقت دنیا دو ذاتوں میں بٹی ہوئی تھی یعنی ایک مبینہ برتر یورپین اور دوسری ایشیا اور افریقہ کے دبے ہوئے اور محکوم ممالک۔ گزشتہ عالم گیر جنگ کے بعد کے دس برس کے عرصہ میں ہی ساری دنیا ان معنوں میں ایک ہوتی جا رہی ہے کہ پورب اور پچھم کے ملک ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر ایک دوسرے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو سکتے ہیں گزشتہ جنگ سے قبل اس طرح کا اجلاس جس کو خطاب کرنے کا اعزاز آج مجھے حاصل ہوا ہے، منعقد کرنا ممکن نہ ہوتا۔ اس وقت ہم بھی ادنیٰ ذات یعنی محکوم لوگ تھے۔ آج ہم آزادی اور مساوی قوموں کی مشترکہ برادری میں شامل ہیں۔ یہ آزادی اور مساوات ہی حقیقی بین الاقوامی مفاہمت پیدا کر سکتی ہے۔ جنگ کے مصائب اور دکھوں نے ایک نئے اور پھر سے زندہ ہونے والے ایشیا کو جنم دیا ہے۔

میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ تاریخی حالات جنھوں نے ماضی میں پچھمی اور پوربی ملکوں کے مابین عداوت اور بغض کی دیوار کھڑی کر رکھی تھی کلیتاً معدوم نہیں ہوئے ہیں۔ ان کے نشانات ابھی موجود ہیں اور وہی غلط فہمی اور کشیدگی پیدا کر رہے ہیں۔ البتہ قدیم نظریے اور اقدار جو تفرق کی دیواریں کھڑی کرتے اور ان کو مضبوط بناتے

تھے وہ انسانوں کے دلوں میں اپنا غلبہ کھو چکے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اب جلد یا بدیر انہیں جدید اور جمہوری اقدار کے لئے جگہ خالی کرنی ہی پڑے گی۔ نو آبادیاتی نظام جو بیک وقت پرانی دنیا کا ستون اور علامتی نشان تھا۔ آج اس قدر بدنام ہو چکا ہے کہ جو ملک آج بھی عملی طور پر ایک دوسری شکل میں اس کو قائم رکھے ہوئے ہیں وہ بھی اس کی وجہ سے شرمساری محسوس کرتے ہیں۔

امریکہ نے عالمی امن کے لئے دو کام کیئے ہیں۔ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد امریکہ کے صدر ولسن کے عقیدے کی بنا پر قوموں کی لیگ قائم کی گئی تھی اور دوسری عالمگیر جنگ کے بعد صدر روز ویلٹ نے مسٹر چرچل اور مارشل اسٹالن کے تعاون سے متحدہ اقوام کے نظریئے کا جنم دیا تھا۔ لیکن ولسن کا نظریہ اپنے ملک کے لوگوں سے بہت بلند تھا۔ جو منرو اصولوں کے زیر اثر ابھی تک علیحدگی پسندانہ جذبات رکھتے تھے، اس لئے امریکہ قوموں کی لیگ میں شامل نہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی لیڈرشپ برطانیہ اور فرانس کے ہاتھ میں رہی جو نو آبادیاتی طاقتیں تھیں اور بہت جلد ہی اقتدار پرستی پر غالب ہو گئی۔ میں معزز حاضرین کے روبرو یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ کس طرح وہ لیگ آہستہ آہستہ مٹتی گئی اور آخر کار ختم ہو گئی۔

قوموں کی لیگ نے بھی سماجی اور اقتصادی مسائل کے بارے میں کمیٹیاں اور کمیشن مقرر کیئے تھے۔ لیکن اس کا زیادہ زور سیاسی مسائل پر ہی رہا۔ متحدہ اقوام کے ادارے نے شروع سے ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ وہ سماجی اور اقتصادی معاملات پر مناسب اور ضروری توجہ دیئے بغیر اپنے سیاسی مقاصد کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس نے اپنے فرائض کی بجا آوری کے لئے خصوصی ایجنسیاں قائم کیں۔ یونیسکو ان میں سے اہم ترین ہے کیونکہ اس کے آئین میں صاف صاف لکھا ہے:

چونکہ تمام لڑائیاں اور جھگڑے انسانوں کے دلوں سے شروع ہوتے ہیں۔

اس لئے ضروری ہے کہ امن کے دفاع کی تعمیر بھی انسانوں کے دلوں میں ہونی چاہیئے"
یہی یونیسکو کا خاص مقصد اور ذمہ داری ہے۔

آپ سب جانتے ہیں کہ یونیسکو کا عظیم مقصد قوموں کے مابین غیر مساوات کو اس طرح نیست و نابود کرنا ہے کہ ساری دنیا کے مرد اور عورتیں حقیقی جمہوری فضا میں زندگی بسر کرسکیں۔ یونیسکو نے انسانوں کے دلوں میں امن کے دفاع کو تقویت پہنچانے کے لئے تعلیم، سائنس اور ثقافت کو فروغ دینے کی مساعی کی ہیں۔ یونیسکو کے اساسی تعلیم کے پروگراموں کی بدولت آج دنیا بھر میں یہ تسلیم کیا جارہا ہے کہ تعلیم کا مطلب صرف دل ودماغ کی تربیت اور نشو ونما ہی نہیں ہے بلکہ سماج کی اقتصادی اور مجلسی ترقی کے لئے افراد کی ہمہ گیر ترقی بھی تعلیم کے معنوں میں شامل ہے۔ یونیسکو کی کوششوں سے تعلیم بالغان کا نظریہ وسعت اختیار کر گیا۔

یونیسکو نے دنیا بھر کے تمام بچوں کو مفت اور جبری ابتدائی تعلیم کا یقینی انتظام بہم پہونچانے کے لئے جو مساعی کی ہیں۔ ہم ان کو ہرگز نہیں بھول سکتے ہیں۔ اس نے ہمیشہ اس پر زور دیا ہے کہ اقتصادی ترقی کا انحصار بھی تعلیم کی وسیع اشاعت پر ہے یونیسکو نے پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ملکوں کی امداد کے لئے ٹیکنیکل امداد کا جو پروگرام جاری کر رکھا ہے وہ خاص قدر اہمیت رکھتا ہے۔ ہندوستان کو بھی سائنس ٹیکنالوجی کے مطالعے وغیرہ کے بارے میں امداد حاصل کرنے کی مسرت حاصل ہے۔ ہم نے بھی ضرورت مند سکول کو تعلیمی اور ثقافتی معاملات کے ماہرین کی شکل میں ٹیکنیکل امداد مہیا کی ہے۔ بنجر علاقوں کی ترقی کے مطالعے کا کام یونیسکو نے کئی برسوں سے شروع کر رکھا ہے۔ یہ کام ایک بڑی پروجیکٹ کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ یونیسکو نے دنیا کے لوگوں اور ملکوں کے مابین بہتر ثقافتی مفاہمت کو فروغ دینے کا جو کام شروع کر رکھا ہے اس کی اہمیت روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ لاعلمی اور تعصب

بھی بین الاقوامی کشیدگی اور غلط فہمی کے بڑے اسباب ہیں۔ ایک صدی سے زائد عرصے سے یورپین لوگ خیال کرتے رہتے ہیں کہ تہذیب کے معنی مغربی تہذیب ہیں یونیسکو نے ادب، آرٹ اور سنگیت کے شاہکاروں کے ترجموں کو شائع کرنے، تاریخ کی تعلیم کا نظریہ پیش کرنے، نسلی برتری یا کمتری کے توہمات کو دور کرنے، بنیادی سماجی اور سیاسی نظریوں کے سائنسی طریق پر مطالعے کو فروغ دینے، انسان کے بنیادی حقوق اور جمہوریت کے مطالعے کے پروگرام جاری کرنے سے بین الاقوامی غلط فہمیوں، تعصبات اور توہمات کو دور کرنے میں امداد دی ہے۔

آج دنیا کی ہر قوم امن چاہتی ہے اور امن کی باتیں کرتی ہے۔ لیکن تقریباً سبھی حکومتیں امن کے قیام اور برقراری کی بجائے جنگ کی تیاریوں پر زیادہ روپیہ خرچ کرتی ہیں۔ یونیسکو کا سالانہ بجٹ صرف ایک کروڑ ڈالر کے قریب ہے، اس کے مقابلے میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ایک ملک اربوں ڈالر اسلحہ بندی پر خرچ کرتا ہے تو خواہ مخواہ حیرت زدہ ہو کر سوچتے ہیں کہ ساری دنیا پر پاگل پن تو سوار نہیں ہے۔ یاد رہے کہ یونیسکو کے اس بجٹ میں سے کافی بڑا حصہ تو اس ادارے کے نظم و نسق پر صرف ہوتا ہے اور اس کے تحقیقی پروگراموں سے متعلقہ سرگرمیوں کے لئے بہت تھوڑا حصہ بچ رہتا ہے یونیسکو کے تمام ممبر اس امر کی اہمیت سے پوری طرح باخبر ہیں کہ ہمیں اس کے انتظامیہ اخراجات کو کم کرنے کی ہر ممکن تدبیر اختیار کرنی چاہیئے یہ مسئلہ اپنی جگہ ضرور اہم ہے لیکن اس وقت میرا مقصد یہ بھی ہے کہ آج کی دنیا میں قوموں اور لوگوں کے مابین جو غیر مساوات اور تفریق موجود ہے اسے کم کیا جائے۔ یہ تمام قوموں کا مشترکہ مقصد ہے۔ اس لئے تمام قوموں کو اس حصول کے اخراجات بھی مل کر برداشت کرنے چاہئیں۔

قدیم زمانے میں اکثر مرتبہ، علاقہ، مذہب یا نسل کی بنا پر جنگ چھڑ جاتی تھی

بعض اوقات ذرائع معاش کے حصول کی جدوجہد بھی جنگ کا باعث بنتی تھی یورپ میں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں قوم پرستی یا زبان کی بنا پر لڑائیاں ہوتی رہیں یورپ سے باہر بہت سی لڑائیاں پچھڑے ملکوں کی نوآبادیات قائم کرنے سے ہوئیں اور ملک گیری کی ہوس باعث جنگ بنتی رہی ۔ آج کی دنیا میں جنگ کی وجوہات بڑی حد تک متروک ہو چکی ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ہو جانے سے اب کوئی وجہ نہیں رہی کہ ہر ایک فرد کیوں آرام سے زندگی بسر نہ کر سکے ۔

اگر انسان عقلیت پرست رہا تو آج ماضی کے مقابلے میں دنیا میں قیام امن کے امکانات زیادہ روشن ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آج دنیا کی فضا ،کشیدگی خوف و نفرت اور شکوک سے معمور ہے ۔ آج ایک طرف سرمایہ پرستوں کا کیمپ ہے ۔ اس کے مقابلے میں اشتراکیت پسندوں کا کیمپ ہے ۔ ان دونوں کیمپوں کا تصادم قومیت کی بنیاد پر ہی نہیں ہے بلکہ کسی حد تک خیالات کے تصادم نے افراد میں پھوٹ ڈال رکھی ہے ۔ چونکہ اس تصادم کی بنیاد خیالات میں ہے ، اس لئے ٹکراؤ بھی خیالات ہی کے میدان میں ہونا چاہیئے ۔ میرے خیال میں یونیسکو کا یہ فرض ہے کہ وہ خیالات کے اس تصادم کا کوئی حل تلاش کر کے اقوام عالم کے سامنے پیش کرے ۔

جہاں تک مجلس اقوام متحدہ اور اس کے خصوصی اداروں کا تعلق ہے ، وہ کسی بھی آدرش کے پابند نہیں ہیں ۔ امریکہ اور روس دونوں ہی مجلس اقوام متحدہ کی بنیاد پر قائم کرنے والے ممبر ہیں ۔ بلکہ خود یونیسکو کی بھی ایسی حکومتیں ممبر ہیں ۔ جن کے مقاصد مختلف ہیں ۔

جب صورت حال یہ ہے تو چین کو مجلس اقوام متحدہ اور یونیسکو میں داخل نہ کرنے کے لئے کیا دلیل ہے اور ان میں داخلہ آدرش کی بنیاد پر بھی نہیں ہے ۔ کیونکہ سوویت روس اور یوگوسلاویہ جیسے کمیونسٹ ملک ان میں شامل ہیں بہر حال

چین کو علیحدہ رکھنا غیر منطقی اور فہم سے بالاتر ہے۔

تمام زمانوں میں مختلف ملکوں کے عقائد اور نظریئے مختلف رہے ہیں۔ لہذا ہم مقاصد کے اختلافات کو اسی احساس کے تحت کیوں نہ قبول کر لیں۔ جس جذبے سے ہم مذہب اور عقیدے کے اختلافات کو برداشت کر لیتے ہیں۔

امریکہ میں سرمایہ پسندی کی قوت اب بھی موجود ہے کل آبادی کا معیار زندگی بلند ہو گیا ہے اور حصول عیش و آرام کا بھی یقین ہے۔ اس کے مقابلے میں روس کے عوام جو زارمینہ کے جبر و استبداد کے جوئے کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ سوویت نظام میں انہیں کوئی مصیبت نظر نہ آئی اور وہ اس نظام کی حمایت میں ہیں اور گذشتہ چالیس سال میں ملک نے جو قابل دید ترقی کی دشوار گزار منزلیں طے کی ہیں اس سے انھیں پختہ یقین ہو گیا ہے کہ سوشلسٹ اصولوں کے ذریعہ سب سے زیادہ ترقی حاصل ہو سکتی ہے۔ لہذا مشرقی یورپ کے بہت سے ملکوں اور سوویت یونین کے عوام نے سوشلسٹ طرز کے نظام زندگی کو اتنی شدت سے قبول کر لیا ہے جتنی شدت سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے عوام سرمایہ دارانہ نظام اور آزادانہ کاروبار سے وابستہ ہو گئے ہیں۔

بہرحال اس تصادم کو حل کرنے کی خاص ذمہ داری یونیسکو پر عائد ہوتی ہے ابتدا میں اس تصادم کو حل کرنے کی جدوجہد آدرش کی اس سطح کو تسلیم کرتے ہوئے ہونی چاہیئے کہ دونوں ہی نظام اپنے مقام پر قائم و دائم رہیں گے۔ ہر شخص اس اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ تمام اقوام کو حق خود اختیاری کا حق حاصل ہے۔ اب نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہر ملک کو اپنے ہی طرز کی سوسائٹی اور حکومت پسند کرنے کا حق بھی حاصل ہے۔ اور اس معاملے میں کسی دوسرے ملک کو اپنا حکم جتانے کا حق نہیں ہے۔ جب دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں بغیر کسی ذہنی پس و پیش کے اس نقطۂ نظر

کو قبول کر لیں گی تو وہ مختلف شعبوں میں ایک دوسرے کا اشتراک عمل برداشت کرنے کی اہل ہو جائیں گی۔

میں نے دونوں ہی کیمپوں میں دوستوں سے گفت وشنید کی ہے اور وہ اس امر کی صحت سے انکار نہیں کرتے ہیں۔ لیکن ہر نظام کے طرفدار اس امر سے خوف کھاتے ہیں کہ شاید دوسرا فریق ان کے خلاف خفیہ یا تخریبی طریقے اختیار کر رہا ہے یا شاید اختیار کرے لیکن جب ایک دفعہ نصب العین کی سطح پر آزادانہ بحث وتمحیص کے حق کو تسلیم کر لیا جائے گا تو یہ خوف اور غلط فہمی بھی دور ہو جائے گی۔

گذشتہ زمانے میں دوسرے ملکوں نے سوویت روس کے ارادوں کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا کہ "کومن ٹرن" کے تحت بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک چل رہی تھی۔ اور سووت حکومت نے بھی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کمیونسٹ پارٹی دنیا میں انقلاب لانے کے لئے کام کرے گی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ یہ پارٹی کمیونزم کی بدولت شہریوں کی زیادہ خدمت کر سکتی ہے۔ اسٹالن کی وفات کے بعد موجودہ سووت لیڈروں نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ کسی ملک کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہ کی جائے گی۔

یہ امر لائق تحسین وآفریں ہے کہ موجودہ سوویت لیڈر اپنے طرز حکومت کو معتدل بنانے کے لئے کوشاں ہیں اور سوویت یونین صنعتی اور اقتصادی جمہوریت قائم کرنے میں بہت آگے نکل گئی ہے اور وہ بہت بڑا عظیم الشان دن ہو گا جب سوویت یونین میں سیاسی جمہوریت اور انفرادی آزادی قائم ہو جائے گی اور دنیا کو بھی چاہیے کہ وہ اس کا خیر مقدم کرے، اور ہمت افزائی کرے۔

جب دونوں نظام حیات مشترکہ اور باہمی رواداری کو تسلیم کر لیں گے تو باہمی مفاہمت اور باہمی وقار میں ترقی کے علاوہ آپس کے شکوک اور نفرت وحقارت

دور ہو جائے گی۔ علاوہ ازیں علم کی ترقی کی بدولت بھی دونوں نظاموں میں قریبی مناسبت قائم ہو جائے گی۔

یونیسکو کے لئے خاص کام یہ ہے کہ وہ ان دونوں نظاموں کے درمیان باہمی مفاہمت قائم کرنے کی غرض سے کام کرے اور اس اقدام کی بدولت یونیسکو اپنے مقاصد بھی حاصل کر لے گا۔ جب جنگ کا خطرہ کم ہو جائے گا شکوک دور ہو جائیں گے اور نفرت باقی نہ رہے گی تو وہ فنڈ جو آج کل اسلحہ جات پر خرچ کئے جا رہے ہیں۔ یونیسکو کے تخلیقی مقاصد کے لئے واگذار ہو جائیں گے۔

یہ تقریر لکھنے کے بعد مشرق وسطیٰ میں اچانک معرکہ آرائی کی خبر ملی جس کا ذکر کئے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔ چند روز پہلے مصر میں جو حالات رونما ہوتے ہیں وہ اس امر کا ثبوت ہیں کہ پرانے طریقے اور پرانی سیاسی حکمت عملی اب بھی کارفرما ہے اور ہم اپنی خوابوں کی نئی دنیا سے بہت دور ہیں۔

اسرائیلی فوجیں مصر کی حدود میں داخل ہو گئیں اور برطانیہ نیز فرانس نے مصر کو الٹی میٹم دے دیا اور ان کے ہوائی جہازوں نے قاہرہ پر بمباری کی ہے آج ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ بین الاقوامی امن اور بنی نوع انسان کے مستقبل کی حفاظت کتنی تنگ نظر قومی اور تجارتی مفادات کے مقابلے میں ہیچ خیال کیا جاتا ہے۔

غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یونیسکو ذہنی فضا پیدا کرنے اور امن کے لئے احترام قائم کرنے میں ناکام رہا ہے اور ان امور کے حصول کے بغیر ہماری عظیم الشان تکنیکی اور سائنسی ترقی ایک خطرناک لعنت ہے، اور ہمارے سروں پر ایک ننگی تلوار لٹک رہی ہے۔ یہ صورت حال ہمیں امن کے بچاؤ کے لئے عورتوں اور مردوں کے دلوں میں مورچے قائم کرنے کے لئے اپنی کوششوں کو بہت زیادہ قوی کرنے کی دعوت دے رہی ہے اور یونیسکو کے قیام کا مقصد بھی یہی ہے۔

☆ ☆

مرکزی وزیر تعلیم کی حیثیت
سے مولانا نے فلسفۂ تعلیم پر
اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے
جس سے قوم کے نونہالوں کے لئے
فکر و نظر کی وسعت وارتقاء
کے لئے نئے راستے کھلتے ہیں۔

فلسفۂ تعلیم

اس مسلّم الثبوت حقیقت سے کسی کو جرأت انکار نہیں کہ قومی تعلیم کا نظام اور اس کی پیش رفت حکومت کے بنیادی فرائض میں سے ہے۔ کسی معاشرہ کی حیثیت عرفی اور ہیئت کذائی کی تعین و تشخیص اس کے افراد کی نوعیت و خصوصیت سے ہوتی ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس مستقبل کا جائزہ بھی اسی روشنی میں لیا جا سکتا ہے۔ کسی فرد کی حقیقت و واقفیت کا آئینہ دار وہ نظام تعلیم ہے جس کے سانچے میں اس کے عادات و خصائل ڈھلتے ہیں۔ اگر تعلیم کی بنیاد حریت و انسانیت کے ہمہ گیر و ہمہ باز اصولوں پر استوار ہو تو اس کی بدولت عوام کے زاویۂ نگاہ میں نہ صرف تبدیلی آ سکتی ہے بلکہ قوم کو ترقی و خوشحالی کی شاہراہ پر گامزن ہونے کے مواقع میسّر آ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس تعلیم کے وہ انداز جو کسی غور و فکر اور بحث و نظر کا نتیجہ نہیں ہیں۔ ان سے امید افزا مستقبل کے وہ چراغ گل ہو سکتے ہیں جنھیں علمبرداران حریت ہر دور میں روشن رکھتے آئے ہیں۔

اب جبکہ ہم آزادی کی دولت سے مالا مال ہو چکے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم تعلیم کے ہر مروّج و متداول دستور کا جائزہ لیں اور ساتھ ہی ساتھ اس بات پر بھی غور کریں کہ ان وسائل و نظامات سے ہمارے مطالبات کہاں تک پورے ہو سکتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے یہاں جو نظام تعلیم جاری و ساری ہے اس کی تشکیل غیر ملکیوں نے خالصتہً غیر ملکی مفاد کے پیش نظر کی تھی۔ ہماری تعلیم کے خد و خال کی تراش خراش میں میکالے کی اُپج کو دخل ہے۔ اس نے کبھی اس حقیقت کی پردہ پوشی نہیں کی کہ میرا مقصدِ وحید یہ ہے کہ میں ہندوستانیوں کو اس انداز کی تعلیم دوں کہ ان کے نقطۂ نظر، ان کی تربیت اور ان کی وفا شعاری کا محور برطانیہ عظمیٰ کا مفاد ہے۔

ہم اس طرز تعلیم کی افادیت سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ اس تعلیم سے ہندوستانیوں کو بے اندازہ فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ اسی تعلیم کا صدقہ ہے کہ سائنس اور جدید فنونِ لطیفہ نے ہمارا دامن ہیروں سے بھر دیا ہے۔ اس تعلیم نے ہمارے اندر شعور ارتقاء کے سوئے ہوئے جذبات بیدار کر دیئے اور ہمارا معیارِ تعلیم اتنا بلند کر دیا کہ آج ہم اپنے گرد وپیش پر فخر کے ساتھ نظر ڈال سکتے ہیں۔ ہمارے قومی احساسات نے بھی سالہا سال کے جمود کے بعد کروٹیں بدلی ہیں۔ دنیا کے حالات و واقعات پر ہمارے غور و فکر کا انداز بھی پہلے کی بہ نسبت ترقی پسندانہ ہے۔ ہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ اس مغربی طرزِ تعلیم نے ہمارے عوام کی بھیڑ میں گنتی کے چند بیدار مغز افراد کی تخلیق بھی کی ہے جو اپنی معاشرت کے اعتبار سے سماج میں دوسروں سے الگ تھلگ دکھائی دیتے ہیں۔ ہندوستان کی عام روایتی زندگی سے گنے چنے تعلیم یافتہ اشخاص کی علیحدگی بھی اسی تعلیم کا فیض ہے۔ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کا دماغ مغربی تعلیم نے اس درجہ ماؤف کر دیا ہے کہ جلوۂ دانشِ فرنگ سے تو ان کی نگاہیں خیرہ ہیں۔ لیکن اپنے قومی ورثہ کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہیں ہے۔ اس مغربی تعلیم کے طفیل ایسے رجحانات معاشرہ میں راہ پا گئے ہیں جن کے باعث ہمارا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ موجودہ طرز تعلیم پر سب سے بڑا الزام جو ہم عائد کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس نے قومی ذہن حد درجہ پست کر دیا ہے۔

یہ ایک واشگاف حقیقت ہے کہ میکالے کو علوم شرقیہ سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ تاریخ میکالے کے اس جذبۂ استحقار کی تائید و توثیق نہیں کرتی۔ تاریخ سے یہ ثبوت بھی نہیں ملتا کہ میکالے نے مغربی تعلیم کی ترویج و اشاعت کے لئے کون سے ذرائع استعمال کئے تھے۔ میکالے کا یہ نظریہ کہ فارسی اور سنسکرت میں سے کوئی بھی زبان اس قابل نہیں کہ اسے ہندوستان میں ذریعۂ تعلیم قرار دیا جا سکے بلاشبہ درست

ہے لیکن انگریزی زبان بھی تو ذریعہ تعلیم نہیں بن سکتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستان کی مختلف صوبائی زبانیں اس زمانہ میں اتنی ترقی یافتہ نہیں تھیں کہ ان میں سے کسی کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جاسکتا۔ لیکن اس میں کسی کو کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ اگر قومی حکومت ان زبانوں کی سرپرستی اپنے ذمہ لے لیتی تو یہ زبانیں بالتدریج ارتقائی منازل طے کر سکتی تھیں۔ بہرحال آج نقشہ بدلا ہوا ہے۔ علاقائی زبانیں ترقی کے اس مقام پر ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو بدرجۂ اولیٰ ذریعہ تعلیم قرار دیا جاسکتا ہے۔ دسویں جماعت تک مادری زبان میں تعلیم کا کامیاب تجربہ ہو چکا ہے۔ اور اب وہ وقت آ پہنچا ہے کہ ہم کسی قدر وسیع پیمانے پر مادری زبان میں تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچا سکیں۔

تعلیمی نقطۂ نظر سے اس نوعیت کی ترقی بنیادی تعلیم کو لازم قرار دیتی ہے اگر بنیادیں استوار نہیں کی جاتی ہیں تو کسی پائیدار اور دیرپا تعمیر کا وجود ممکن نہیں تعلیم اور تمدن کی پوری عمارت کی نیو ابتدائی درجات کی تعلیم پر ہے۔ ہندوستان میں اس حقیقت کو بری طرح نظر انداز کیا گیا ہے کہ ہم اس کی جتنی بھی مذمت کریں تھوڑی ہے یہاں تعلیم کی باگ ڈور ایسے اشخاص کے ہاتھوں میں رہی ہے جو مطلق کسی اہلیت و صلاحیت کے مالک نہیں ہیں۔ ہم ان کو موردِ الزام قرار نہیں دے سکتے۔ اس لئے کہ ملک کی قدیم روایات کے برعکس اساتذہ کو قدر و منزلت کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ ان کا پیشہ افسوسناک حد تک ذلیل ہو چکا ہے۔ ماضی میں ایک استاد کا مقام بہت بلند تھا۔ اگر مالی حیثیت سے کوئی استاد خوشحال نہ بھی ہوتا تو اس کا اسے ملال نہ تھا۔ اور وہ اس لئے کہ سماج میں اسے جو مرتبہ اور وقار حاصل ہوتا تھا اس سے کافی حد تک اس کی بیزاری کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ اس دور میں شومیٔ قسمت سے زمانہ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ آج خصوصیت کے ساتھ ابتدائی درجات کے اساتذہ کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ ان کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے

نظام تعلیم کی تجدید واحیا کی مہم شروع کرتے وقت ہمارا اولیں فرض یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اساتذہ کا معاشرتی معیار بلند کریں۔

بنیادی تعلیم کی تنظیم نو سے متعلق جو منصوبہ ہے اس کی تفصیلات میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ تحریروں اور تقریروں میں اس موضوع پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ ہم اس بات پر اتفاق کریں گے کہ تعلیم کے بنیادی منصوبے سے وہ مسائل جن کی جانب سطور بالا میں اشارے کیئے گئے ہیں، بہت بڑی حد تک حاصل ہو سکیں گے یہ رپورٹ جسے سارجنٹ رپورٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نہ صرف اساتذہ کی حیثیت عرفی کے تعین کی ضامن ہے بلکہ وہ معیار اور وہ اصول بھی اس کی روشنی میں طے پا جاتے ہیں جو شہری تعلیم کی ارتقار کے لئے ناگزیر ہیں مادری زبان کے ذریعہ تعلیم کی ترقی و بیش رفت پر جو زور دیا گیا ہے۔ اس منصوبے سے اس کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے۔

ایک سوال جس پر رپورٹ میں کسی قدر قطعیت کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی جس کے سلسلے میں کچھ نتائج بھی اخذ کیئے گئے ہیں وہ مدراس میں مذہبی تعلیم سے متعلق ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ماہرین تعلیم اس مسئلہ پر ایک دوسرے سے شدید اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ شعبۂ تعلیم کے مرکزی مشاورتی " بورڈ نے اس ضمن میں جو یادداشتیں پیش کی ہیں ان میں تضاد پایا جاتا ہے۔ ماضی میں ماہرین تعلیم کی اکثریت نے خالصًا لادینی دسیکولر، تعلیم کی اہمیت پر زور دیا تھا۔ انقلاب روس کے بعد روس اور برطانیہ عظمٰی نے جس تعلیمی پالیسی پر عمل درآمد کیا تھا اس سے مذہب کے مزاج کی مطلق نفی ہوتی ہے۔ جن حضرات کا نظریہ شروع ہی میں کچھ مختلف رہا ہے ان کا یہ بیان ہے کہ تجربہ اس تعلیم کی ناسودمندی پر جس سے مذہب کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا ہے۔ شاید ناطق ہے۔ آج برطانیہ عظمٰی میں جو نظام تعلیم جاری و ساری ہے۔ اسے حکومت کی سرپرستی حاصل ہے، معلوم ہوا ہے کہ ماضی قریب میں روس نے

بھی مذہبی تعلیم کی قدر و قیمت تسلیم کرلی ہے چنانچہ اس سلسلے میں حکومت نے عملی قدم بھی اٹھایا ہے۔

ان دونوں نقاطِ نظر پر زور دینے اور کسی فیصلہ کن نتیجہ تک پہنچنے کی ضرورت ہے۔ ایک بات جس پر خصوصیت کے ساتھ دھیان دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں دوسرے ممالک کی بہ نسبت مذہب پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اس ملک کے نہ صرف ماضی میں بلکہ حال میں مذہبی تعلیم کی جانب عوام کے میلانات پائے جاتے ہیں۔ اندریں حالات اس ملک کی حکومت کا فرض منصبی یہ ہے کہ اگر وہ یہاں مذہبی تعلیم کو رواج دینا چاہتی ہے تو اس کا معیار بہت اعلیٰ ہونا چاہیئے وہ مذہبی تعلیم جو اس ملک کے نجی اداروں میں دی جاتی ہے اس کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ اس سے نہ نصب العین بلند ہوتا ہے، نہ روادارانہ جذبات ابھرتے ہیں بلکہ اس کے برعکس ایسے نتائج اس تعلیم سے برآمد ہوتے ہیں جنھیں کسی قیمت پر بھی حوصلہ افزا نہیں کہا جاسکتا ہے۔ مذہبی تعلیم کا مقصد وحید یہ ہونا چاہیئے کہ اس کے ذریعہ عوام کے دل و دماغ میں رواداری اور وسیع النظری کے جوہر پیدا ہوں۔ یہ خواب اس وقت شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے جب حکومت اس کی سرپرستی کا بیڑا اٹھائے نجی اداروں کے رحم و کرم پر اسے نہیں چھوڑنا چاہیئے۔

٭ ٭ ٭

ذیل میں مولانا ابوالکلام آزاد
کی وہ تقریر دی جاتی ہے
جو آپ نے ہندوستان کی
پارلیمنٹ میں زبان کے سوال
پر فرمائی اور جس میں اس پر
احتجاج کیا کہ ہندوستان اپنی
راہ سے بھٹک کر تعصبات
کے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں
مار رہا ہے۔

زبان کا مسئلہ

میں اس وقت تھوڑا سا وقت لوں گا۔ اس لئے کھڑا ہوا ہوں کہ چاہتا ہوں زبان کے معاملہ میں جو ڈھنگ میں نے اختیار کیا اور اپنی جو رائے قائم کی اور دوستوں کو اس سلسلہ میں جو مشورہ دیا اسے ایوان کے روبرو رکھ دوں۔ اور اس ایوان کے ذریعہ سارے ملک کے سامنے کہنا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ ہم انگریزی کو ہٹا کر اس کی جگہ کس طرح کی زبان لائیں، آپ کو یاد ہوگا کہ پٹنہ یونیورسٹی کے سالانہ جلسہ میں میں نے اس سوال کو چھیڑا تھا اور اس وقت یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جہاں تک نظم و نسق اور تعلیم کا تعلق ہے انگریزی کو اس وقت ہٹانا صحیح نہ ہوگا۔ ہٹانا ضرور ہے لیکن غور و خوض کے بعد، ایسا ڈھنگ اختیار کرنا چاہیئے کہ غلط نتیجہ نہ نکلے۔ اس وقت یہ رائے میں نے دی تھی کہ پانچ سال تک انگریزی کو جاری رکھا جائے۔ خیال تھا کہ یہ مدت کافی ہوگی۔ لیکن عمیق نظر سے دیکھا تو محسوس کیا کہ یہ مدّت کافی نہ ہوگی۔ آئینی فارمولا میں جو مدّت رکھی گئی ہے وہ کافی ہے اور اس مدت کو کم نہ کرنا چاہیئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس صوبہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اگر کسی صوبہ نے یا کسی یونیورسٹی نے اس وقت انگریزی کو ہٹا کر ہندی لانے کا فیصلہ کر لیا تو اس نے یہ صحیح نہیں کیا۔ انھیں معلوم تھا کہ حکومت ہند یونیورسٹی کمیشن بنانے والی ہے انگریزی ڈیڑھ سو برس سے ہمارا ذریعہ تعلیم ہے۔ اس لئے جہاں تک یونیورسٹی کی تعلیم کا تعلق ہے اس میں تبدیلی کرنے کے لئے بڑے غور و خوض کی ضرورت ہے تاکہ تعلیمی سٹینڈرڈ کو نقصان نہ پہنچے۔

جہاں تک عدالت کا تعلق ہے اگر آپ جذبات سے بالاتر ہو کر غور کریں گے تو آپ تسلیم کریں گے کہ قانون کا معاملہ نہایت اہم ہے۔ آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ کسی ہندوستانی زبان کو موقع نہیں ملا کہ اس کام کے لیے اسے استعمال کیا جا سکے، اگر ہم ایسا چاہیں تب بھی جلد بازی میں ایسا نہ کرسکیں گے، اس میں کچھ وقت لگے گا۔

ان حالات میں نظم و نسق اور بین الاقوامی ضرورتوں کے لیے انگریزی کو پندرہ سال تک قائم رکھا جانا چاہیے۔ البتہ یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے اس سے کم عرصے میں بھی ہمیں انتظام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

دوسرا سوال ہمارے سامنے یہ ہے کہ جو زبان ہم بنائیں وہ کیسی ہو۔ ہندوستان کی تمام زبانوں میں اگر کوئی زبان ایسی ہے جسے سب صوبوں اور ہندوستان کے باہر بھی سمجھا جاتا ہے تو وہ صرف زبان ہے جو شمالی ہندوستان میں بولی جاتی ہے۔ میں یاد دلاؤں گا کہ آج سے ۲۵ سال قبل قومی زبان کے متعلق کانگریس نے میری تحریک ہی کے ذریعہ ہندوستانی زبان کی تجویز منظور کی تھی۔ شمالی ہند کی زبان ساری زبانوں میں یکساں زبان ہے۔ لیکن جب وہی زبان اونچے درجے اور ادب میں آتی ہے تو اس کے دو اسٹائل بن جاتے ہیں۔ ایک وہ جسے اردو کہتے ہیں جس میں زیادہ الفاظ فارسی اور عربی کے لیے جاتے ہیں دوسرا وہ جس میں سنسکرت سے مدد لی جاتی ہے۔ اور اسے ہندی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

اگر ایک آدمی کا رجحان فارسی کی طرف ہے اور اس نے اس کی تعلیم پائی ہے تو قدرتی طور پر فارسی کے الفاظ اس کی زبان پر آجاتے ہیں اور اسی طرح جس نے سنسکرت پڑھی ہے وہ اپنی زبان میں اس سے الفاظ لے گا۔ ان حالات میں ہمارے سامنے یہ سوال آیا کہ اگر شمالی ہندوستان کی زبان کو قومی بنانا چاہیں تو کیا

طریقہ اختیار کریں اس امر پر سب کا اتفاق تھا کہ وہ اس زبان کو اختیار کریں جس میں وسعت اور لچک ہو اس لئے کہ جس زبان میں وسعت اور لچک نہ ہوگی وہ ایک مخصوص طبقہ یا مخصوص جگہ کی زبان ہو سکتی ہے لیکن سارے ملک کی زبان نہیں ہو سکتی۔

ہمارے سامنے ہندی، اردو کے دو نام تھے اردو سے مراد ایسی زبان ہو جاتی ہے جس میں زیادہ الفاظ فارسی سے لئے گئے ہوں اور جب ہندی کہی جاتی ہے تو اس کا مطلب ایسی زبان سے لیا جاتا ہے جس میں سنسکرت کے الفاظ لئے جائیں۔

چنانچہ مہاتما گاندھی اور پنڈت موتی لال نہرو آنجہانی کے مشورہ سے یہ طے ہوا کہ ہمیں ہندی اور اردو میں سے کوئی لفظ نہ لینا چاہیئے بلکہ ہندوستانی کا لفظ اختیار کیا جائے۔ کیونکہ اس میں ایک قسم کی لچک پائی جاتی ہے، اور یہ زبان ان تمام روؤں کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے جو شمالی ہند میں پیدا ہو گئے ہیں۔

رسم الخط کا سوال جب ہمارے سامنے آیا تو اردو اور ہندی رسم الخط منظور کیا گیا، لیکن بعد کو جب نظم و نسق ہاتھ میں آیا تو میں نے اس بات کے وزن کو تسلیم کیا کہ دونوں رسم الخط یکساں طور پر جاری رکھنے میں قباحت ہو گی چنانچہ میں نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ دیو ناگری رسم الخط کو اول درجہ حاصل ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میری یہ رائے بھی رہی کہ جہاں تک گورنمنٹ کے اعلانات اور کارروائی کا تعلق ہے ان کے لیے اردو بھی تسلیم کرنا چاہیئے، اور یہ چیزیں اردو رسم الخط میں بھی شائع ہوں۔

"میں سمجھتا ہوں یہ ایسی عملی اور درمیان کی چیز ہے کہ میرے دوستوں کو منظور کرنے میں عذر نہ ہوگا۔ لیکن جب یہ سوال کانگرس پارٹی کے سامنے آیا تو مجھے مایوسی ہوئی اسی مایوسی کے ساتھ میں، یہاں بھی کھڑا ہوا ہوں اور اس کی کڑواہٹ کو نہیں چھپانا چاہتا میں دیکھتا ہوں کہ دماغ کھلے ہوئے نہیں بلکہ سمٹے ہوئے ہیں۔ جس طرح ہمیں کھلے ہوئے دماغ سے دیکھنا چاہیئے ہم اس نگاہ سے نہیں دیکھتے حقیقت یہ ہے کہ جس تنگ نظری

کا اظہار کیا گیا ہے اس سے مجھے انتہائی افسوس ہوا"

"ہندسوں کے متعلق میں بالکل نہیں سمجھ سکا کہ اسے اتنی اہمیت کیوں دی گئی، انگریزی زبان کے ہندسے کھلے ہوئے ہیں اور آنکھ انہیں بہت جلد پکڑ لیتی ہے اور ترتیب میں ان کی بیٹھک ٹھیک آتی ہے، دیوناگری اعداد کی اس طرح ٹھیک نہیں آتی" اور پھر یہ کوئی اجنبی چیز بھی نہیں ہے۔ ہندوستان ہی ہندسے ہیں جو یہاں سے باہر پہنچے۔ آٹھویں صدی میں منصور عباسی نے سندھ سے ایک وفد بلایا تھا جو لوگ گئے ان میں سے ایک ریاضی اور دوسرے علوم کا ماہر بھی تھا۔ بغداد میں اس کا ذکر آیا اور منصور عباسی کے حکم سے ہندوستانی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ عرب ہندسوں سے واقف ہوئے۔ انھیں یہ ہندوستانی ہندسے اتنے مفید معلوم ہوئے کہ انھوں نے ان کو عربی میں اختیار کر لیا۔

چودھویں صدی عیسوی میں عربی زبان سے یہ چیز یورپ میں پہنچی۔ قدرتی طور پر ان پر وہی اثر ہوا جو عربوں پر پڑا تھا اور چونکہ یہ ان کے پاس عربی زبان سے آئے تھے اس لئے ان کا نام "عربی ہندسے پڑا"

لیکن میں اس پر زور نہیں دے رہا، میں تو یہ کہتا ہوں کہ یورپ ہی کی پیداوار سمجھ لیجئے، اگر یہ چیز کام میں آنے والی ہے تو اسے کیوں نہ اختیار کیا جائے۔ ایک مفید چیز کو اس لئے نظر انداز کر دیا کہ وہ غیر ملکی ہے غلط ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی ہے آج آپ اگر اسی ترازو کو لے کر اپنی زندگی کو تولیں تو کتنی چیزیں آپ کو ہندوستانی نظر آئیں گی؟

علم نوع انسانی کا ورثہ ہے، اگر ڈیڑھ سو برس کی جدید تعلیم کے بعد بھی ہمارا یہی حال ہے تو سوچئے ہم کس طرف جا رہے ہیں، اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اپنی ترقیوں کی راہ میں خود ہی رکاوٹیں پیدا کر دیں گے۔

مولانا آزاد نے مشورہ کمیٹی سے بھی استعفےٰ کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ اس لئے مستعفی

ہو گئے کہ وہ اس کے ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔ آپ نے کہا کہ مسودہ کے ہدایت نامہ میں کہا گیا تھا کہ یونین کی زبان ایسی ہوگی جس سے مشترکہ کلچر کا اظہار ہوتا ہو، ہدایت نامہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہندوستانی اور دوسری زبانوں کے لئے بھی گنجائش رکھی جائے لیکن یہ سب باتیں صرف ہدایت نامہ میں رکھی گئی ہیں۔

اس وقت میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ان چیزوں کو آئین کی دفعہ میں رکھا جائے۔ اس لئے صرف ہدایت نامہ میں ان کا ذکر کر دینا کافی ہے مجھے خوشی ہے مسٹر آئنگر اور مسٹر منشی نے جو مسودہ مرتب کیا ہے، اس میں اس کمی کو پورا کر دیا گیا ہے۔

اس کے بعد ایک نہایت اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو کا کیا درجہ ہے، جہاں اردو پھیلی پھولی وہ یو پی ہے اور یو پی نے ہندی کا فیصلہ کیا ہے اس بات پر خاص دھیان دیا گیا اور جو فہرست زبانوں کی بنائی گئی وہاں اردو کو بھی رکھا گیا۔

آئنگر منشی فارمولا میں ان دونوں باتوں کا وزن تسلیم کرتا ہوں لیکن یہ چھپانا نہیں چاہتا کہ بحیثیت مجموعی زبان کا مسئلہ ہم نے صحیح فیصل نہیں کیا صحیح فیصلہ اسی وقت ہوتا جب ہم قومی زبان کا نام ہندوستانی رکھتے

کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی کے نام کے ذریعہ چور دروازے سے اردو داخل ہو جاتی لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ ہندوستان کے اندر ایک بھی زبان ایسی نہیں جو کسی ایک فرقہ یا مذہب کی ہو۔ لیکن اگر کچھ دوست ایسے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی کا لفظ اختیار کیا گیا تو ہند یونین کے مسلمان اس کے ذریعہ اردو کو لائیں گے تو میں کہوں گا کہ ان کی تعداد اب ہند یونین میں صرف ۱۳ فیصدی ہے۔ یونیورسٹیاں اور حکومتیں آپ کے ہاتھ میں ہیں۔ بیشک اس قسم کے خدشات کا اظہار تقسیم سے قبل کیا جاسکتا تھا۔ لیکن اس وقت اس امر کا کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ اب اس قسم کی باتوں کیلئے تمام دروازے بند ہو گئے ہیں، اور ان کی کنجیاں آپ کے پاس ہیں۔ میں صفائی سے

کہنا چاہتا ہوں کہ آپ ایک مخصوص زبان کو ٹھونسنا چاہتے ہیں اگر ایسا نہیں ہے تو اس قسم کے خطرات کی ضرورت ہی نہیں پیدا ہوتی۔ صحیح چیز میری رائے میں یہی تھی کہ ہندستانی قومی زبان ہو۔ اور تمام سرکاری کارروائی ہندی رسم الخط میں ہو۔ لیکن جہاں تک سرکاری کاغذات کی اشاعت کا تعلق ہے وہ اردو رسم الخط میں بھی ہونی چاہیئے۔ لیکن اس وقت طبیعتوں کا جو حال ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے جو زیادہ سے زیادہ لچک پیدا کی جاسکتی تھی وہ آئنگر فارمولا میں رکھی گئی ہے، صرف اسی کے ذریعہ ہم زیادہ لوگوں کو ایک جگہ لا سکتے تھے۔

رومن رسم الخط کے متعلق —— اگر لوگ معاملہ کو اونچی سطح سے دیکھ سکیں تو میری رائے یہ ہے کہ اسے تسلیم کر لینا چاہیئے، کوئی رسم الخط مکمل نہیں ہے، لیکن رومن رسم الخط سب میں سہل اور آج زمانہ کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اسے تسلیم کر لیا جائے۔ اور اگر یہ تسلیم نہ کیا جائے تو ہندی اور اردو رسم الخط رکھے جائیں، لیکن جہاں صرف ہندسوں پر اتنا اختلاف ہے وہاں رومن رسم الخط کو کیونکر منظور کیا جاسکتا ہے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ ایک دن آئے گا جب ہمیں تجویز کرنا پڑے گا کہ ہمیں ایسا رسم الخط اختیار کرنا چاہیئے جو ہماری ضرورتوں کو پورا کر سکے۔

⁂ ⁂ ⁂

جنگ آزادی کی تاریخ

مولانا آزاد نے ڈاکٹر ایس این سین کی تصنیف "۱۸۵۷" کے پیش لفظ میں ۱۸۵۷ء کی جد وجہد کے اسباب کا حالیہ شواہد کی روشنی میں تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"چونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نوابوں اور مغل شہنشاہ کے نام پر کام کرتی رہی اس لئے ہندوستانیوں کو ایک عرصے تک اس کا احساس ہی نہیں ہوا کہ اقتدار ایک غیر ملکی نسل کے ہاتھوں میں آگیا ہے اور خود اپنے ملک میں ان کی حالت غلاموں کی سی بنادی گئی ہے۔ جب وسیع پیمانے پر لوگوں میں اس امر کا احساس پیدا ہوا تو بغاوت کے حالات پیدا ہو گئے اور جب بغاوت ہو گئی تو یہ محض چند افراد یا کسی ایک گروہ کی سازش نہیں تھی بلکہ وسیع پیمانے پر لوگوں میں پھیلتی ہوئی بے اطمینانی کا نتیجہ تھی"

یہ بے اطمینانی دو اقدامات سے اور بھی بڑھ گئی اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ان اقدامات کا فوری نتیجہ تھی۔ ان میں سے ایک کمپنی کی یہ پالیسی تھی کہ شرفاء اور زمینداروں کو ان کے اختیارات سے محروم کر کے مزارعوں کو براہِ راست کمپنی کے ماتحت کر دیا جائے۔ دوسرا اقدام ڈلہوزی کی ہندوستانی ریاستوں کو یکے بعد دیگرے برطانوی علاقے میں شامل کرنے کی پالیسی تھی۔

"مجھے اس بات میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ ۱۸۵۶ء میں جب اودھ کا الحاق کیا گیا تھا تو اسی وقت عام فوج میں بالعموم اور بنگالی فوج میں بالخصوص بغاوت کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ اور چربی والے کارتوسوں کے معاملے سے فوج میں کوئی نئی بے اطمینانی پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ اس نے

تو ایک موقع بہ فراہم کیا جب دبی ہوئی بے اطمینانی کا کھلم کھلا اظہار کیا گیا"۔

مولانا نے لکھا ہے کہ اگر قوم پرستی یا حب الوطنی کے وہ معنی لیئے جائیں جو آجکل لیئے جاتے ہیں تو اس سوال کا جواب قطعی طور پر اثبات میں نہیں دیا جا سکتا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ بغاوت میں حصہ لینے والے لوگ حب الوطنی کے جذبات سے متاثر تھے مگر یہ جذبات اتنے قوی نہیں تھے کہ بغاوت پر آمادہ کر سکتے۔

"عمیق و طویل تحقیق کے باوجود اس وقت تک اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے کہ بغاوت پہلے سے تیار شدہ کسی منصوبے کے تحت ہوئی یا یہ کہ فوج اور ہندوستانی قوم نے کمپنی کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش کر لی تھی"۔

مولانا نے لکھا ہے کہ بغاوت کے سربراہوں میں کبھی اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔ وہ ایک دوسرے سے حسد کرتے تھے اور ایک دوسرے کے خلاف مسلسل سازش کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ اس کے برخلاف انگریز اپنی ملکہ کے تئیں وفاداری کے جذبے کے تحت لڑتے تھے۔ قریب قریب اتنی ہی اہم بات یہ بھی ہے کہ سوائے چند بلند شخصیتوں کو چھوڑ کر جن میں احمد اللہ اور تانتیا ٹوپی کے نام سر فہرست ہیں زیادہ تر راہنماؤں نے اس جدوجہد میں ذاتی وجوہ کی بنا پر حصہ لیا۔ انہوں نے اس وقت تک انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند نہیں کیا جب تک کہ ان کے ذاتی مفادات کو نقصان نہیں پہنچا۔

"اگر اس سلسلہ میں ہندوستانیوں کا دامن بے داغ نہیں ہے تو انگریزوں کا کردار بھی کچھ ان سے بہتر نہیں رہا۔ انگریز مورخوں نے عام طور پر انگریزوں کے جور و ستم کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان میں سے کچھ مورخ اس بات کو تحریر میں لے آئے ہیں کہ وہ ان مظالم سے جو انتقام کے نام پر توڑے گئے کس قدر متنفر تھے"۔

مولانا نے دو حقائق کی جانب توجہ دلائی ہے جو ان کی نظر میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت

کی الجھی ہوئی داستان ہمیں بالکل واضح ہیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بہت زیادہ اتحاد تھا اور دوسری یہ کہ عوام کے دل میں مغل شہنشاہ کے لیئے وفاداری کے گہرے جذبات تھے۔

مولانا آزاد نے اس بات پر زور دیا ہے کہ فرقہ وارانہ خیالات سے دستگاری راہنماؤں کی کسی خاص کوشش کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے صدیوں کی مشترک زندگی کے نتیجے کے طور پر آپس میں دوستانہ تعلقات مستقل طور پر استوار کر لیئے تھے۔ لہذا کسی خاص مقصد کے لیئے اتحاد کی اپیل کرنیکی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔

مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ اس ہنگامہ خیز دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی نگاہیں کس طرح دہلی اور مغل تاجدار بہادر شاہ پر مرکوز کی تھیں۔ ان کے درمیان اس بات پر مکمل اتفاق رائے تھا کہ صرف بہادر شاہ ہی ہندوستان کے شہنشاہ بننے کے حقدار تھے۔

مولانا آزاد نے یہاں نانا صاحب کی نظیر پیش کی ہے۔ جنہوں نے مرہٹوں اور مغلوں کے درمیان پرانے جھگڑے کے باوجود اس بات کا اعلان کرنے میں تامل نہیں کیا کہ وہ مغل دربار کے ایک صوبہ دار گورنر ہیں۔

اس زمانے کے ہنگامہ خیز واقعات کی نئی اور مستند تاریخ کی اشاعت کیلیئے ۱۸۵۷ء کی جدوجہد کی صد سالہ تقریب کے موقع کو ہی کیوں منتخب کیا گیا۔ آج کا ماحول ایسا ہے کہ اس میں ۱۸۵۷ء کے واقعات کا مطالعہ ٹھنڈے دل و دماغ سے کیا جا سکتا ہے۔

کتاب کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں اس کے مصنف ڈاکٹر ایس این سین کو واحد ہدایت یہ دی گئی تھی کہ وہ ایک سچے مورخ کے نظریئے سے یہ کتاب لکھیں۔ اس عمومی ہدایت کے سوا ان کے تصنیف و تالیف کے کام میں دخل اندازی کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ لہذا اس کتاب میں بیان کردہ واقعات کے انتخاب اور تشریح وغیرہ کی ساری ذمہ داری انہی پر ہے انہوں نے اس میں جو بھی رائیں ظاہر کی ہیں حکومت کسی طرح انکی پابند نہیں ہے۔

○

۱۵ر فروری ۵۸ء کو اردو کانفرنس
منعقدہ پریڈ گراؤنڈ دہلی میں
مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ
آخری تقریر کی تھی۔ کیا خبر
تھی کہ ٹھیک ایک ہفتہ بعد
۲۲ر فروری ۵۸ء کو وہ ہمیشہ
کے لئے ہم سے رخصت ہو جائیں
گے اور پھر کبھی ان کی آواز ہمارے
کانوں میں نہ آ سکے گی۔

اُردو کانفرنس میں آخری تقریر

جنابِ صدر اور دوستو!

جہاں تک مجھے اندازہ ہوا ہے آج آپ نے یہ مجلس اس لئے منعقد کی ہے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی زندگی میں اردو کی جو واقعی جگہ ہے وہ ملنی چاہیئے یہ نہیں کہ کسی زبان کی جگہ خالی کی جائے اور وہ اسے دی جائے۔

آپ اُردو کے حامی ہیں لیکن کسی زبان کے مخالف نہیں ہیں، جیسا کہ ابھی میرے دوست پنڈت جی (پنڈت سندر لال) نے کہا۔ یہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو ہندی کا مخالف ہو۔ یہ ہی صحیح اسپرٹ ہے اور اسی اسپرٹ سے مل کر راستہ صاف ہوتا ہے، تیس یا چالیس سال پہلے زبان کے بارے میں یہ جھگڑا تھا کہ ملک کی زبان کیا ہو۔ جو لوگ اُردو کے حامی تھے وہ چاہتے تھے کہ اُردو ملک کی زبان ہو اور جو ہندی کے حامی تھے انکی خواہش تھی کہ ہندی ہو۔ یہ معاملہ اس وقت گہرائی تک پہنچ گیا تھا کیونکہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کی رقیب بن کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ اُردو والے کہتے کہ اگر ہندی کو ملک کی زبان تسلیم کیا گیا تو اُردو ختم ہو جائیگی اور ہندی والے کہتے تھے اگر اُردو کو ملک کی زبان مان لیا گیا تو ہندی ختم ہو جائیگی۔ ہم ہر وقت اس نگاہ سے اس سوال کو دیکھتے تھے اور اس کے

عادی ہو گئے تھے چنانچہ جب یہ سوال سامنے آتا تو اسی ترازو میں تولا جاتا۔ اسی حالت میں ملک آزاد ہوا، وقت آیا۔ دستور بنا۔ اسمبلی میں کافی بحث ہوئی اور اکثریت کے ساتھ ہندی کو ملک کی زبان تسلیم کر لیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں اردو کی حیثیت میں ایک بنیادی انقلاب آگیا۔ اور اردو کی بات ایک رقیب کی حیثیت سے کم ہو گئی۔ اب ہر ہندوستانی کا جو آئین کا وفادار ہے فرض ہے کہ اسے مانے۔ وہ اس کے خلاف نہیں جا سکتا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو کی کیا جگہ ہے، اس کی وہی حیثیت ہے جو دوسری زبانوں کی ہے۔ بہت سے لوگ اب بھی رقیب کی حیثیت سے دیکھنے لگے ہیں حالانکہ اب یہ بات نہیں ہے۔ اب یہ سوال تو اٹھتا ہی نہیں کہ پورے ملک کی زبان کونسی ہوگی۔ ہندی کو جو جگہ ملنی تھی وہ اسے مل گئی۔ اب ہر ہندوستانی کا خاص فرض ہے کہ اس کے آگے سر جھکائے، لیکن اسی کے ساتھ اردو کی جو جگہ ہے وہ اسے ملنی چاہیے۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جو کثرت کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ نہ صرف شمال میں بلکہ جنوب میں بھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ حیدر آباد، تلنگانہ کے علاقے میں اردو بولی جاتی ہے۔ میسور میں لاکھوں آدمی اردو بولتے ہیں۔ اسی طرح آندھرا اور مدراس میں متعدد جگہ اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یو۔ پی، بہار، دلی اور پنجاب میں تو کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں کے لاکھوں اور ہزاروں آدمی اردو بولتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کانفرنس جس مقصد کے لئے بلائی گئی ہے اس میں اسے کامیابی ہوگی اور جب کہ وزیر اعظم نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا ہے تو یقیناً یہ اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے گی۔

ختم شد

شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے کلام معجز نما کا جاذبِ نظر مجموعہ

کلیاتِ اقبال

حکیم الامت علامہ سر محمد اقبال کے کلام معجز نما کا یہ وہ جاذب نظر مجموعہ ہے جس کو انتہائی احتیاط کے ساتھ مرتب کر کے دنیائے ادب میں پیش کرنے کا شرف ہمیں حاصل ہے۔ علامہ مرحوم کا کلام روحانی ترقی و دنیاوی عروج کی ضمانت ہوتے ہوئے جذبۂ عمل کی وہ تحریک پیش کرتا ہے جس کا جواب اردو ادب میں موجود نہیں "کلیات اقبال" میں اقبال کا تمام اردو کلام جو اس وقت تک مختلف ناموں سے جلدوں میں شائع ہو چکا ہے ان سب کو یکجا طبع کر کے ہم نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔

کتابت و طباعت بہترین ۔ دیدہ زیب گرد پوش ۔

قیمت :۔ چھ روپے
